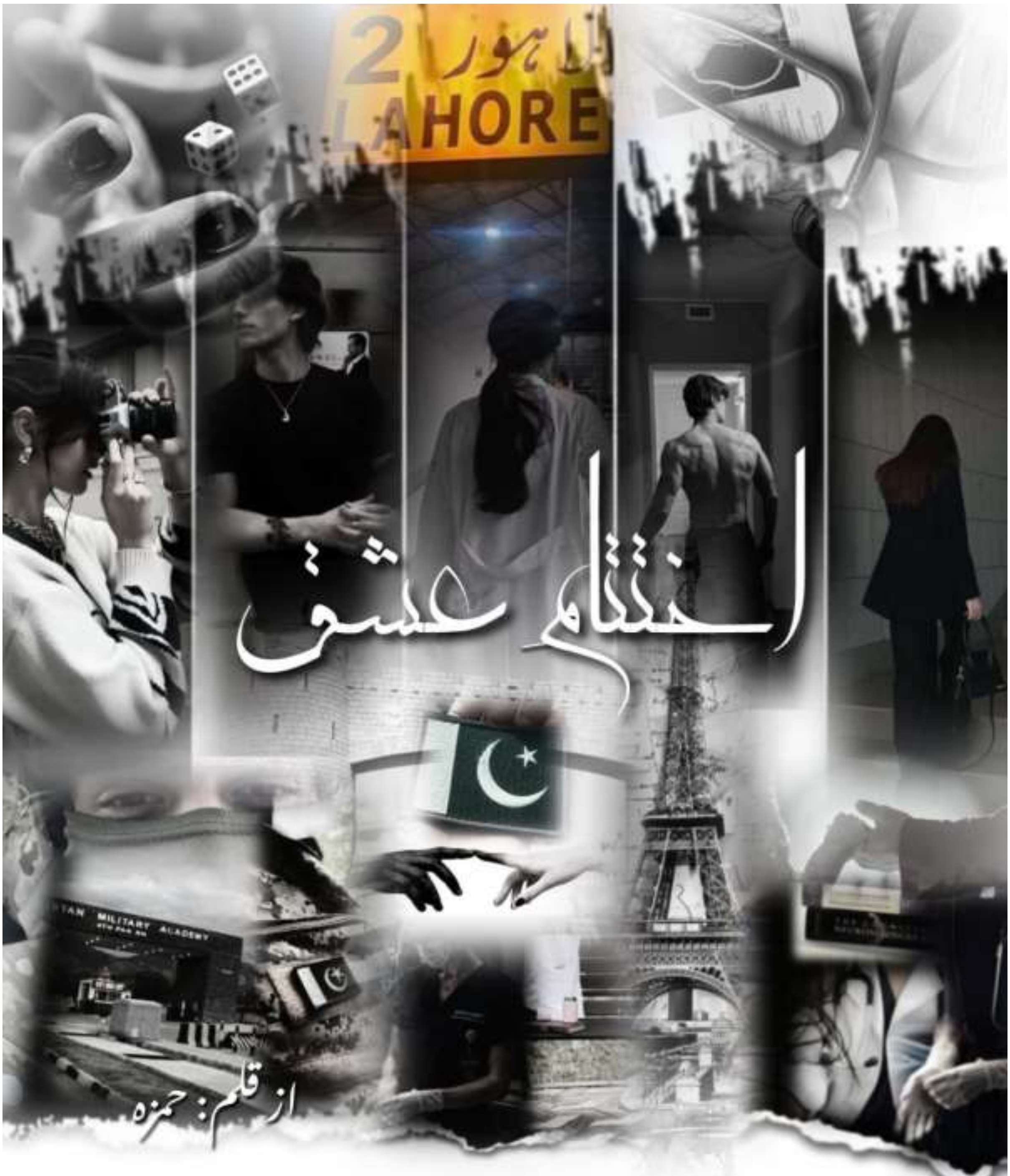

2 لاہور
LAHORE
اختتام عشق
از قلم: حمزہ

مصنف کی جانب سے:

یہ کہانی محض چند کرداروں، جذبات اور واقعات کا مجموعہ نہیں، بلکہ اُن احساسات کا عکس ہے جو انسان کو کبھی محبت کی طرف لے جاتے ہیں اور کبھی اُسی محبت کے ذریعے خود سے اور اپنے رب سے آشنا کر دیتے ہیں۔

اختتامِ عشق میرے لیے صرف ایک ناول نہیں، بلکہ ایک ایسا سفر ہے جس میں محبت، جدائی، پچھتاوے، آزمائش اور اللہ پر یقین کے کئی رنگ آپ کو نظر آئیں گے۔

امید ہے کہ اس کہانی کا ہر کردار آپ کے دل میں اپنی ایک جگہ بنائے گا، اور اس کے الفاظ آپ کو کہیں نہ کہیں اپنے احساسات کا عکس محسوس ہوں گے۔

محبت اگر اللہ کے قریب کر دے تو نعمت ہے،

اور اگر اللہ سے دور کر دے تو آزمائش۔

حمزہ

یہ ناول کتابی شکل میں بھی موجود ہے، اگر آپ خریدنا چاہتے ہیں تو اس ہم سے رابطہ کریں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اختتامِ عشق

HAMZA

ایڈیٹر:

امامہ

وردہ طیب

فزہ بٹ

ارباب زھرہ

طیبہ

آج کل کی 80 فیصد جنریشن محرم اور نامحرم میں فرق نہیں جانتی، جبکہ باقی 20 فیصد جو جانتی ہیں ان میں سے بھی 15 فیصد کسی نامحرم کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اسلام میں کسی نامحرم کو جان بوجھ کر چھونا بھی حرام ہے، تو پھر اسی نامحرم سے حد سے زیادہ محبت کرنا کیا یہ حرام نہیں ہے؟ جانتے ہو اس معاشرے کا المیہ کیا ہے؟ یہاں ایک لڑکی کو نامحرم کی نگاہ سے بچنے کے لیے پردے کی تلقین کی جاتی ہے، مگر ایک لڑکے کو کبھی یہ نہیں سکھایا جاتا کہ نظروں کا پردہ کیسے کرنا ہے۔

کیا ہوا؟

ہو گیا وہ سب کچھ جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

نامحرم...

سننے میں ایک بہت چھوٹا سا لفظ ہے،

مگر اس کے معنی بے حد گہرے اور وسیع ہیں؛

یہ صرف ایک رشتے کی پہچان نہیں بلکہ انسان کے ایمان، کردار اور حدود کی آزمائش کا نام ہے۔

محرم وہ ہوتے ہیں جن سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے،

ایک لڑکی کے لیے کون محرم ہوتا ہے؟

ایک لڑکی کے لیے، اس کا باپ، دادا، نانا، بھائی، بیٹا، پوتا، نواسہ، چچا، ماموں، بھتیجا اور بھانجا رضاعی رشتوں میں رضاعی باپ، رضاعی بھائی، رضاعی ماموں اور رضاعی چچا محرم شمار کیے جاتے ہیں۔

ایک لڑکے کے لیے کون محرم ہوتا ہے؟

ایک لڑکے کے لیے اس کی ماں، دادی، نانی، بہن، بیٹی، پوتی، نواسی، پھوپھی اور خالہ، بھتیجی، بھانجی رضاعی رشتوں میں رضاعی ماں، رضاعی بہن، رضاعی خالہ اور رضاعی پھوپھی محرم شمار ہوتی ہیں۔

جبکہ نامحرم وہ ہیں جن سے نکاح جائز ہے،

اور یہی جواز انسان کے لیے امتحان بن جاتا ہے،

کیونکہ یہی وہ رشتے ہیں جہاں نگاہوں کی لغزش، باتوں کی نرمی اور دل کی کمزوری ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جسے لوگ محبت سمجھ بیٹھتے ہیں،

حالانکہ وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے قریب پہنچ چکی ہوتی ہے۔

انسان جب کسی نامحرم سے دل لگاتا ہے تو وہ صرف ایک احساس میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ آہستہ آہستہ اپنی روح کے سکون سے دور ہوتا چلا جاتا ہے، اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب حقیقت اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے کہ یہ تعلق وقتی خوشی تو دے سکتا ہے مگر دائمی سکون نہیں۔

تب اپنے ہی دل کے خلاف جا کر اس چاہت کو ختم کرنا پڑتا ہے،

اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جہاں انسان کے وجود کو پہلا دراڑ ملتا ہے،

کیونکہ وہ اپنی خواہشات کو اپنے رب کے حکم پر قربان کر رہا ہوتا ہے۔

وہ شخص جو کبھی دل کو خوشی دیتا تھا، اب خاموشی میں بدل جاتا ہے، وہ نام جو کبھی دعاؤں میں آتا تھا،

اب آنکھوں کی نمی میں کھو جاتا ہے۔

مگر یہی قربانی اصل کامیابی بن جاتی ہے،

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی اس راستے سے بچنے کا حکم دیا:

قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ (سورۃ النور 24:30)

"مسلمان مردوں کو حکم دو کہ اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔"

اور مومن عورتوں کے لیے فرمایا:

وَ قُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ (سورۃ النور 24:31)

"اور (اے نبی ﷺ!) مومن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کیا کریں۔"

تاریخ تھی 27 اپریل..

Paris

بہار اپنے جوبن پر تھی، اور پیرس اپنی پوری رعنائی کے ساتھ دنیا کے دلوں پر راج کر رہا تھا۔

ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی جو چہرے کو چھوتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نرم دعا نے دل کو چھو لیا ہو؛

سڑکوں کے کنارے لگے درختوں پر کھلے پھول ایسے جھوم رہے تھے جیسے فطرت خود مسکرا رہی ہو، اور شام ڈھلتے ہی روشنیوں کا جادو پورے شہر کو اپنی آغوش میں لے لیتا تھا۔

Eiffel Tower

ایفل ٹاور سنہری روشنی میں جگمگا رہا تھا، جیسے آسمان سے کوئی ستارہ زمین پر اتر آیا ہو، اور اس کے گرد گھومتی ٹھنڈی ہوا ہر گزرنے والے کے دل میں ایک انجانی سی کشش پیدا کر رہی تھی؛ دریا کے کنارے بہتی ہوا، کیفے کی مدھم موسیقی، اور لوگوں کی ہنستی ہوئی آوازیں، یہ سب مل کر ایک ایسی فضا

بنا رہے تھے کہ انسان خود کو اس حسن میں کھو دینے پر مجبور ہو جائے، جیسے ہر لمحہ ایک خواب ہو جس سے جاگنے کا دل نہ چاہے۔

لیکن اسی خوبصورتی کے بیچ...

ایک حقیقت بھی سانس لے رہی تھی۔

کیونکہ ہر چمکتی ہوئی چیز سکون نہیں دیتی...

اور ہر خوبصورت منظر دل کو مکمل نہیں کرتا۔

اسی شہر میں، اسی دلکش ماحول کے اندر...

ایک کہانی جنم لینے والی تھی، ایسی کہانی جو صرف محبت کی نہیں، بلکہ محبت کے امتحان کی تھی...

جہاں دل کو چاہنے کی اجازت تو تھی، مگر حاصل کرنے کی نہیں۔

کہتے ہیں نا،

نامحرم سے محبت کرنا تو بہت آسان ہے، مگر اسی محبت کا اختتام اور انجام انسان کے وجود کو اندر سے ہلا دیتا ہے۔

اسی دلکش شہر کی ایک مصروف سڑک پر...

ایک سیاہ رنگ کی مہنگی گاڑی آہستہ آہستہ آ کر رُکی، اور دروازہ کھلا تو باہر حمزہ اسفند نے قدم رکھا۔

لمبا قد، تقریباً چھ فٹ دو انچ، مضبوط جسم،

سیاہ ٹی شرٹ اور کلاسک پینٹ،

جھیل جیسی سبز آنکھیں جو دیکھنے والوں کی دل میں گہرا اثر چھوڑ جاتی،

آنکھوں پر لگے بلیک گلاسز جن کے سفید شیشے اس کے چہرے کو مزید پراسرار بنا رہے تھے؛اس کی چال میں ایک عجیب سا اعتماد تھا،

جیسے وہ اس شہر کا حصہ نہیں بلکہ اس پر حکمرانی کرتا ہو۔

سامنے کھڑی،

Paris Film Academy

پیرس فلم اکیڈمی کی عمارت جو اپنی شان کے ساتھ ایستادہ تھی،

جہاں وہ فلم انڈسٹری سے متعلق اپنی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

ایک ایسی دنیا جہاں خواب بنتے بھی ہیں اور ٹوٹتے بھی۔

اس نے آہستہ سے اپنا چشما اتارا...

اور یکایک اس کی ہلکی سبز، جھیل جیسی آنکھیں سامنے آئیں۔

گہری، خاموش، اور کسی انجانے درد سے بھری ہوئی۔

وہ آنکھیں جو بظاہر ہر چیز کو نظر انداز کرتی تھیں،

مگر اندر ہی اندر سب کچھ محسوس کرتی تھیں۔

لوگ اسے یونیورسٹی میں "پلیئر بوائے" کے نام سے جانتے تھے...

ہر محفل کی جان، ہر چہرے پر مسکراہٹ لانے والا...

مگر حقیقت اس کے اس انداز سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھی،

اُس کے والد، ایک کامیاب بزنس مین،

Asfand Krichin Group

کے مالک تھے،

جن کا نام پیرس کے بڑے کاروباری حلقوں میں عزت سے لیا جاتا تھا،

مگر دولت ہمیشہ سکون نہیں خرید سکتی..

اور حمزہ کی زندگی اس بات کی زندہ مثال تھی۔

جب وہ صرف چھ سال کا تھا، اُس کے والدین کے درمیان طلاق ہو گئی...

ایک ایسا لمحہ جس نے اُس کے بچپن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا،

اُس کے والد، اسفند کریچن، اسے

پاکستان سے اپنے ساتھ پیرس لے آئے،

جہاں اُس کی پرورش ایک میڈ نے کی...

ایک ایسی عورت جس نے اسے سہارا تو دیا،

مگر ماں جیسی محبت کبھی نہ دے سکی۔

وقت گزرتا گیا...

اور حمزہ بڑا ہوتا گیا، مگر اُس کے اندر کا خالی پن بھی بڑھتا گیا۔ اس نے سیکھ لیا کہ جذبات کو چھپانا کیسے ہے۔

لوگوں کو متاثر کرنا کیسے ہے، اور دلوں سے کھیلنا کیسے ہے...

کیونکہ جس نے خود محبت کھو دی ہو، وہ اکثر محبت کو کھیل سمجھنے لگتا ہے۔

لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس چمکتی ہوئی زندگی،

اس بے تحاشا آزادی،

اور اس مصنوعی خوشی کے پیچھے...

بہت جلد ایک،

ایسا لمحہ آنے والا ہے جو اُس کے اندر کی ساری دنیا کو بدل کر رکھ دے گا۔

اُس کی کہانی کا سب سے عجیب پہلو یہ تھا کہ اُس کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا..

نام، شناخت، سب کچھ مسلمان ہونے کی گواہی دیتے تھے،

مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ صرف نام کا مسلمان تھا، نہ اسے نماز کا شعور تھا، نہ حلال و حرام کی پہچان۔

جب وہ چھوٹا تھا اور اسے پاکستان سے پیرس لایا گیا، تو اس کی تربیت ایک کرسچن میڈ کے ہاتھوں ہوئی،

اس نے اسے زندگی کے طریقے تو سکھائے،

مگر دین کی روشنی نہ دے سکی۔

اس شہر کی چمک دمک میں ویسے بھی کون ٹھہرتا ہے کہ حق اور باطل کے فرق کو سمجھے؟

یہاں لوگ جیتے تو ہیں، مگر مقصد کے بغیر..

ہنستے تو ہیں مگر سکون کے بغیر۔

حمزہ بھی انہی لوگوں میں شامل ہو گیا تھا۔

اُسے نہیں معلوم تھا کہ کون سا راستہ حلال ہے اور کون سا حرام...

کون سی خوشی وقتی ہے اور کون سی ہمیشہ کے لیے سکون بن سکتی ہے۔

وہ راتوں کی محفلوں کا عادی ہو چکا تھا،

جہاں روشنیوں کے پیچھے اندھیرے چھپے ہوتے ہیں،

شراب اس کے لیے بس ایک عام سی چیز تھی،

جیسے پانی،

نہ اس میں کوئی برائی نظر آتی تھی،

نہ کوئی خوف۔

لڑکیوں کے ساتھ اس کے تعلقات بھی اس کے لیے ایک کھیل بن چکے تھے،

نہ جذبات کی کوئی قدر،

نہ حدود کی کوئی پہچان، وہ ہر اُس چیز کو آزادی سمجھ بیٹھا تھا جو در حقیقت اس کی روح کو آہستہ آہستہ کھوکھلا کر رہی تھی۔ ہر کہانی میں ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب انسان کو اس کی حقیقت دکھادی جاتی ہے۔ اور حمزہ کی زندگی میں بھی وہ لمحہ بہت قریب آ چکا تھا... جب اسے پہلی بار احساس ہونے والا تھا کہ جو کچھ وہ جی رہا ہے،

وہ زندگی نہیں...

صرف ایک خوبصورت دھوکہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اولاد کی تربیت محض دنیاوی کامیابی تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ یہ والدین کی سب سے بڑی امانت اور ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دین کی صحیح سمجھ دیں۔ انہیں حلال اور حرام کی پہچان سکھائیں، وہ راستہ بتائیں جو اللہ کی رضا تک لے جائے، کیونکہ بچہ فطرتاً سیکھنے والا ہوتا ہے، وہ وہی بنتا ہے جو اسے سکھایا جاتا ہے، اور اگر اسے صحیح رہنمائی نہ ملے تو وہ آسانی سے دنیا کی چمک دمک میں کھو کر اپنی اصل پہچان بھول جاتا ہے۔

قرآن پاک میں بھی والدین کو اولاد کی تربیت کے حوالے سے واضح ہدایت دی گئی ہے:

"یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَکُمْ وَأَهْلِیکُمْ نَارًا" (سورۃ التحریم 66:6)

("اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ (جہنم) سے بچاؤ")

یہ صرف ایک نصیحت نہیں بلکہ ایک ذمہ داری ہے جو ہر ماں باپ پر عائد ہوتی ہے؛ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَأْمُرْ أَهْلَکَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا" (سورۃ طہ 20:132)

("اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس پر قائم رہو")

اگر والدین اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہو جائیں، دین کی تعلیم کو نظر انداز کر دیں، اور بچوں کو صحیح اور غلط کا فرق نہ سکھائیں تو اس کا اثر صرف دنیا تک محدود نہیں رہتا بلکہ ان کی آخرت بھی خطرے میں

پڑ سکتی ہے۔ کیونکہ جس بچے کو کبھی بتایا ہی نہ جائے کہ کون سا راستہ اللہ کو پسند ہے اور کون سا ناپسند، وہ بھٹک جاتا ہے، اور اس بھٹکنے کی ایک بڑی وجہ والدین کی غفلت بن جاتی ہے؛ اس لیے تربیت صرف پرورش نہیں، بلکہ ایک امانت ہے جس کا حساب بھی دینا ہو گا۔

یونیورسٹی کے مرکزی دروازے جیسے ہی کھلے، سامنے ایک ایسی دنیا تھی جو بظاہر خواب لگتی تھی۔

Paris Film Academy

کا وسیع و عریض کیمپس، شیشے سے بنی بلند عمارتیں جن پر پڑتی سورج کی روشنی انہیں چمکتے ہوئے آئینوں میں بدل دیتی تھی، ہر طرف مختلف زبانوں کی آوازیں، ہنسی، موسیقی، اور تخلیقی شور، کہیں اسٹوڈنٹس اپنے کیمرے سیٹ کر رہے تھے، کہیں کوئی اسکرپٹ ہاتھ میں لیے جذباتی مکالمے دہرا رہا تھا، تو کہیں گروپس میں بیٹھے نوجوان اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے کی پلاننگ کر رہے تھے۔

اس ماحول میں داخل ہوتا ہوا ہر شخص خاص محسوس کرتا تھا..

.مگر جب حمزہ اسفند اندر آیا تو ماحول جیسے ایک لمحے کے لیے رک سا گیا۔ سیاہ لباس، اعتماد سے بھرپور چال، اور دونوں اطراف دو لڑکیاں جدید لباس میں ہنستی مسکراتی، جیسے وہ اس کی دنیا کا حصہ ہوں۔ حمزہ کے ہاتھ ان کی کمروں کے گرد تھے، اور وہ تینوں بے فکری سے آگے بڑھ رہے تھے، جیسے انہیں کسی کی پرواہ نہ ہو۔ ارد گرد کھڑے لڑکے ایک دوسرے کو کہنی مارتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے، اور لڑکیاں آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں اس کا نام لے رہی تھیں۔

" Hamza Asfand... The player boy"

وہ مسکرا دیا، گویا حمزہ کو کسی کی باتوں سے فرق ہی نہ پڑتا ہو۔

مگر اس ہنسی کے پیچھے ایک خاموش خلا بھی تھا، ایک ایسا خلا جسے نہ یہ محفلیں بھر سکتی تھیں، نہ یہ مصنوعی تعلقات۔ چلتے چلتے اس کی نظر ایک لمحے کے لیے کہیں دور کھو گئی...

جیسے وہ خود سے ہی بھاگ رہا ہو۔

شام کے چار بجنے کو تھے۔ پورا دن لیکچرز، پراجیکٹس اور شور میں گزر گیا تھا، مگر حمزہ اسفند کے چہرے پر نہ تھکن تھی نہ سنجیدگی، جیسے یہ سب اس کے لیے معمول ہو۔ آخری لیکچر ختم ہوتے ہی وہ کرسی سے اٹھا، ہاتھ میں فائل گھماتا ہوا کلاس سے باہر نکلا اور لمبے کوریڈور سے گزرتا ہوا مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

یونیورسٹی کا ماحول اس وقت اور بھی رنگینیوں سے بھرا ہوا لگ رہا تھا، کہیں اسٹوڈنٹس لان میں بیٹھے گٹار بجا رہے تھے، کہیں کوئی ہنستے ہوئے سیلفیاں لے رہا تھا، تو کہیں بحث و مباحثہ جاری تھا، سورج ڈھلنے لگا تھا اور اس کی سنہری روشنی پورے کیمپس پر پھیل کر ایک نرم سا جادو بکھیر رہی تھی۔ حمزہ باہر نکلنے ہی والا تھا کہ اچانک سامنے سے ایک آواز آئی،

حمزہ!

اس نے قدم روکے...

آہستہ سے سر اٹھایا... اور سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا۔

Jimmi (جمی)!

وہ لڑکی جسے حمزہ کبھی اپنی زندگی کا حصہ بنا چکا تھا۔

اور پھر اسی بے رحمی سے چھوڑ بھی دیا تھا جیسے وہ باقی سب کو چھوڑ دیتا تھا۔

اُس کے چہرے پر غصہ صاف نظر آرہا تھا،

آنکھوں میں شکوہ، اور لہجے میں تلخی،

Why are you treating me like I have no feelings?

اس نے سیدھا سوال کیا (جمی)

You used me Hamza! اُس نے سیدھا سوال کیا،

اردگرد کھڑے چند لوگ رک گئے...

ماحول میں ہلکی سی خاموشی چھا گئی۔ حمزہ نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا... پھر ہلکا سا مسکرایا، جیسے یہ سب اس کے لیے کوئی اہم بات نہ ہو۔

اُس نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں کہا،

"It wasn't a serious matter, I think I am done with this relationship"

یہ سُن کر جمی کا چہرہ لال ہو گیا، وہ بولی:

"You destroyed my whole life and think its not a serious matter"

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا، اس کی آنکھوں میں وہی بے پرواہی تھی۔

"Look at me jimmi! , You aren't special for me ,I have many of girls better than you!"

یہ جملہ جیسے سیدھا اس کے دل پر لگا۔

آس پاس کھڑے لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔۔۔

کچھ کو حیرت ہوئی، کچھ کو افسوس۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، مگر اس نے خود کو سنبھالا۔۔۔

OK Get Out حمزہ نے ہلکا سا کندھا اچکایا، جیسے اسے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔

یہ کہہ کر وہ مڑا، جیب میں ہاتھ ڈالے۔

اور بغیر پیچھے دیکھے آگے بڑھ گیا۔

مگر اس کے جاتے ہوئے قدموں کے پیچھے ایک خاموشی رہ گئی تھی۔۔

اور شاید۔۔

ایک سچ بھی۔ کیونکہ کبھی کبھی سب سے زیادہ پُراعتماد نظر آنے والے لوگ ہی اندر سے سب سے زیادہ خالی ہوتے ہیں۔

شام ڈھلتے ہی،

روشنیوں نے شہر کو ایک نئی زندگی دے دی تھی، اور اسی روشنی کے بیچ حمزہ اسفند اپنی گاڑی تیزی سے چلاتا ہوا اُس پُر تعیش ولا کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں اُس کے دوست فینگ کی برتھ ڈے پارٹی اپنے عروج پر تھی۔ ولا کے باہر مہنگی گاڑیوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی، اندر سے تیز میوزک کی دھڑکنیں دیواروں کو چیرتی ہوئی باہر تک سنائی دے رہی تھیں۔ جیسے ہی حمزہ اندر داخل ہوا، ایک گرم، شور سے بھرا ماحول اُس کا استقبال کرنے لگا، نیون لائٹس، دھواں، قہقہے، اور بے قابو رقص؛ ہر طرف لوگ اپنی دنیا میں مگن تھے، جیسے کسی کو کسی کی پرواہ نہ ہو۔

"Finally you're here, man," فینگ نے دور سے چیختے ہوئے اسے گلے لگالیا۔

"Wouldn't miss it," حمزہ نے ہنستے ہوئے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

ہاتھ میں گلاس تھمایا گیا پہلا گھونٹ، پھر دوسرا، پھر جیسے سلسلہ رکنے کا نام ہی نہ لے۔ شراب اب اس کے لیے نئی نہیں تھی، مگر آج وہ حد سے آگے جا رہا تھا، جیسے خود کو کسی شور میں ڈبونا چاہتا ہو۔ میوزک کی تیز دھنوں پر لوگ جھوم رہے تھے، اور حمزہ بھی اس بھیڑ کا حصہ بن گیا۔ اس کے گرد لڑکیاں تھیں، قہقہے، قربتیں، بے فکری؛ اس کے لیے یہ سب کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، بلکہ ایک عادت بن چکی تھی، ایک ایسا دائرہ جہاں احساسات کی کوئی قیمت نہیں رہتی، بس لمحوں کی وقتی لذت رہ جاتی ہے۔

وہ ہنستا رہا، ناچتا رہا، گلاس بدلتا رہا... مگر اس سب کے بیچ کبھی کبھی اس کی نظریں خالی ہو جاتیں، جیسے وہ کسی اور ہی سوچ میں کھو جاتا ہو۔ ایک لمحے کو میوزک جیسے دھندلا سا لگا، آوازیں دور ہوتی محسوس ہوئیں، اور اس کے دل میں ایک انجانا سا بوجھ ابھر آیا، بلا وجہ، بلا نام۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو پھر اسی شور میں دھکیل دیا، جیسے خاموشی سے ڈر لگتا ہو۔

رات گہری ہوتی گئی، پارٹی اپنے عروج پر پہنچی، مگر حمزہ کے اندر کہیں نہ کہیں ایک تھکن، ایک خلا بڑھتا جارہا تھا، وہ سب کچھ جو باہر سے چمک رہا تھا، اندر سے کھوکھلا لگنے لگا تھا۔

انسان کتنی بھی آوازوں میں خود کو چھپالے،

دل کی خاموشی ایک دن سنائی ضرور دیتی ہے۔

رات کافی گزر چکی تھی...

پارٹی کا شور اب بھی جاری تھا مگر حمزہ اسفند کے لیے سب کچھ دھندلا ہو چکا تھا۔ حد سے زیادہ شراب پی چکا تھا۔ حد سے زیادہ شراب پینے کی وجہ سے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، آنکھیں بوجھل تھیں اور ذہن جیسے کسی دھند میں گم ہو گیا تھا۔ وہ سیدھا کھڑا بھی نہ رہ سکا تو اس کے دوست فینگ نے فوراً اشارہ کیا،

"Take him home "

ڈرائیور نے آکر اسے سہارا دیا، اور بمشکل اسے گاڑی تک لے جایا گیا۔ پوری راہ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا، سر ایک طرف جھکا ہوا، جیسے دنیا سے بے خبر ہو۔

کچھ دیر بعد گاڑی پیرس کے ایک پُر تعیش اپارٹمنٹ کے سامنے رکی۔ یہی اُس کی دنیا تھی، خاموش، وسیع اور عجیب حد تک تنہا۔ دروازہ کھلا تو اندر سے ایک کمزور سی مگر مانوس سی آواز آئی،

Hamza baba aa gaye?

یہ تھی "گرینی"

وہ کوئی اصل دادی نہیں تھی، مگر رشتوں سے بڑھ کر تھی۔

ایک بوڑھی عورت، جھریوں سے بھرا چہرہ، سفید بال، اور آنکھوں میں عجیب سی شفقت۔ وہی عورت جس نے اسے بچپن سے سنبھالا تھا جب وہ پاکستان سے یہاں آیا تھا۔ وقت نے اس کے جسم کو کمزور کر دیا تھا، مگر دل آج بھی ویسا ہی مضبوط تھا۔ اُس نے حمزہ کو سہارا دیا، آہستہ آہستہ اسے کمرے تک لے گئی، اس کے جوتے اتارے، کوٹ ایک طرف رکھا، اور اسے بستر پر لٹا دیا۔ اُس نے دھیمی آواز میں کہا،

جیسے ڈانٹ بھی تھی اور دعا بھی،

"یہ کیا حال بنالیا ہے آپ نے؟"

حمزہ نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی، مگر لبوں سے بس ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے...

پھر وہ بے ہوشی کی نیند میں ڈوب گیا۔ گرینی کچھ لمحے وہیں بیٹھی رہی، اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی..

جیسے ماں اپنے بچے کو سلاتی ہے۔

اُن کی آنکھوں میں نمی آگئی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ لڑکا باہر سے جتنا مضبوط لگتا ہے، اندر سے اتنا ہی ٹوٹا ہوا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ آہستہ سے اُٹھی، اور فون اٹھایا

“Hello... Asfand sahib...?”

“Yes?” دوسری طرف سے سرد لہجہ آیا،

گرینی کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی،

"Hamza baba phir se... bohat zyada pee kar aaye hain... unki tabiyat theek nahi lag rahi.."

چند لمحوں کی خاموشی...

"It's fine. He'll be okay. Don't worry." پھر ایک بے پرواسا جواب،

"Lekin sahib..."

"Granny, I said it's fine. I'm busy."

اور کال کٹ گئی۔

گرینی کچھ دیر فون کو دیکھتی رہی...

جیسے اُسے یقین نہ آرہا ہو کہ یہ جواب تھا۔ مگر پھر اُس نے ایک گہری سانس لی، فون رکھ دیا، اور دوبارہ حمزہ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ یہ اُس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی...

نہ حمزہ کا یوں ٹوٹنا...

نہ اُس کے باپ کا یوں نظر انداز کرنا۔ کمرے میں خاموشی پھیل گئی تھی، ایسی خاموشی جو چیخ رہی تھی...

مگر سننے والا کوئی نہیں تھا۔

جانتے ہو اس دنیا میں سب سے بدنصیب کون ہوتا ہے؟

وہ نہیں جس کے پاس دولت کم ہو...

بلکہ وہ جس کے ماں باپ زندہ ہونے کے باوجود اُسے اُن کی محبت نصیب نہ ہو۔ کیونکہ ماں باپ کا ہونا صرف ایک رشتہ نہیں،

ایک احساس ہوتا ہے، وہ لمس، وہ توجہ، وہ دعا...

جو انسان کے اندر خالی جگہوں کو بھر دیتی ہے۔ جب یہی احساس چھن جائے تو انسان چاہے کتنی ہی بڑی محفلوں کا حصہ کیوں نہ بن جائے، اُس کے اندر ایک سناٹا رہتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

ہم اکثر بیٹیوں کے نصیب سے ڈرتے ہیں... اُن کے لیے دعائیں کرتے ہیں، اُن کے مستقبل کی فکر کرتے ہیں اور یہ فکر اپنی جگہ درست بھی ہے۔ مگر کبھی کسی نے سوچا کہ بیٹوں کا کیا؟ کیا اُن کا کوئی نصیب نہیں ہوتا؟

کیا انہیں محبت، رہنمائی اور توجہ کی ضرورت نہیں ہوتی؟

بیٹا بھی تو ایک دل رکھتا ہے...

وہ بھی ٹوٹتا ہے، وہ بھی بکھرتا ہے، مگر اُسے سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے آنسو چھپالے، اپنی تکلیف کو مسکراہٹ کے پیچھے دفن کر دے۔ اور شاید اسی لیے... کچھ بیٹے بڑے ہو کر حمزہ اسفند بن جاتے ہیں۔

باہر سے پُر اعتماد، بے فکر، ہر محفل کی جان...

مگر اندر سے ایک ایسا بچہ جو آج تک اُس محبت کو تلاش کر رہا ہے جو اسے کبھی ملی ہی نہیں۔ اُس کے پاس سب کچھ ہے، دولت، آزادی، لوگ، مگر جو چیز نہیں ہے، وہی سب سے زیادہ ضروری تھی۔

اگر اُس کے ماں باپ نے وقت پر اُس کا ہاتھ تھاما ہوتا، اُسے سمجھایا ہوتا، اُس کے دل کو سنبھالا ہوتا..

تو شاید وہ آج یوں خود کو برباد کرنے میں مصروف نہ ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ نصیب صرف بیٹیوں کا نہیں ہوتا... بیٹوں کا بھی ہوتا ہے۔ اور جب بیٹے کا نصیب خالی رہ جائے... تو وہ صرف خود نہیں بکھرتا، بلکہ اپنے ساتھ کئی اور کہانیاں بھی بکھیر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کو گھر سے محبت نہیں ملتی... وہ اُسی کمی کو بھرنے کے لیے باہر محبت ڈھونڈنے نکل پڑتا ہے۔ ابتدا میں یہ تلاش معصوم لگتی ہے، کسی کی باتوں میں سکون، کسی کی توجہ میں اپنائیت، مگر آہستہ آہستہ یہی تلاش انسان کو اُس راستے پر لے جاتی ہے جہاں جذبات عقل پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ وہ بھول جاتا ہے کہ ہر قربت درست نہیں ہوتی، ہر لگاؤ جائز نہیں ہوتا...

اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں سب سے بڑی غلطی جنم لیتی ہے۔ جب انسان کسی نامحرم کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو وہ صرف ایک تعلق نہیں بناتا... بلکہ ایک ایسی ڈور میں بندھ جاتا ہے جس کا انجام اکثر درد ہوتا ہے۔ ابتدا میں سب کچھ خوبصورت لگتا ہے، باتوں میں مٹھاس، ملاقاتوں میں خوشی...

مگر جیسے جیسے حقیقت سامنے آتی ہے، ویسے ویسے دل پر بوجھ بڑھنے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ تعلق جو اللہ کی حدود سے باہر ہو، وہ سکون نہیں دے سکتا، وہ وقتی خوشی تو دے سکتا ہے، مگر آخر کار انسان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

اِسی لیے... ہر محبت کو محبت سمجھ لیناہی اصل غلطی ہے۔

پیرس کی چمک دمک سے ہزاروں میل دور..

ایک اور دنیا تھی،

"Skrdu"... خاموش، پاکیزہ اور دل کو سکون دینے والی دنیا،

یہاں وقت جیسے آہستہ چلتا تھا، اور ہر لمحہ اپنے اندر ایک عجیب سی طمانیت لیے ہوتا تھا۔ صبح کی پہلی اذان کے ساتھ جب فضا میں ہلکی سی روشنی پھیلتی، تو برف سے ڈھکے بلند و بالا پہاڑ سنہری رنگ میں نہا

جاتے۔ نیچے بہتا ہوا دریائے سندھ اپنے شفاف پانی کے ساتھ ایسے محسوس ہوتا جیسے قدرت کی کوئی زندہ تصویر ہو، جس کی ہر موج ایک خاموش دعا بن کر بہہ رہی ہو۔ ٹھنڈی ہوائیں جب درختوں کے پتوں سے ٹکراتیں تو ایک مدھم سی سرسراہٹ پیدا ہوتی، جو دل کے اندر تک اتر جاتی، نہ شور، نہ ہجوم، نہ مصنوعی زندگی...

بس سادگی، سکون، اور اللہ کی بنائی ہوئی ایک مکمل تخلیق۔

شام کے وقت یہ خوبصورتی اور بھی نکھر جاتی تھی آسمان پر پھیلتے ہلکے گلابی اور نارنجی رنگ، دور پہاڑوں کی سیاہ ہوتی چوٹیاں، اور آہستہ آہستہ اترتی خاموشی...

جیسے پوری وادی ایک ہی وقت میں سانس لے رہی ہو۔ یہاں کی راتیں بھی الگ تھیں، صاف آسمان، بے شمار ستارے، اور ٹھنڈی ہوا جو انسان کو اپنے رب کے قریب محسوس کرواتی تھی۔ اسی حسین وادی میں رہتی تھی "ڈاکٹر عنایہ"، عمر 30 سال، سیاہ آنکھیں۔

ایک،

Nephrologist Surgeon

جس نے حال ہی میں

United Kingdom سے،

اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کی تھی۔

صرف ایک ماہ پہلے وہ واپس آئی تھی، مگر اس کے اندر کا سکون اور سادگی ویسے ہی قائم تھی، جیسے وہ پہلے تھی۔ اُس کی سیاہ آنکھیں گہری اور پُر سکون تھیں، جیسے ان میں کئی کہانیاں چھپی ہوں، سنہرے

بال اکثر ایک سادہ سی چادر میں ڈھکے رہتے، اور اُن کے چہرے پر نہ کوئی بناوٹ تھی نہ دکھاوا، بس ایک ہلکی سی مسکراہٹ جو ہر مریض کے دل کو تسلی دے دیتی۔ وہ کسی بڑی شخصیت کی طرح نہیں جیتی تھی، بلکہ ایک عام سی لڑکی کی طرح، جس کے خواب بڑے تھے مگر انداز سادہ۔

صبح وہ فجر کے بعد قرآن کی تلاوت کرتی، پھر مقامی ہسپتال کے لیے نکلتی، اور دن بھر مریضوں کی خدمت میں مصروف رہتی۔ اُس کے لیے میڈیکل فیلڈ صرف ایک پیشہ نہیں بلکہ ایک عبادت تھی۔ وہ ہر مریض کو صرف کیس نہیں بلکہ ایک امانت سمجھتی تھی۔ ان دنوں وہ ملک کے باہر کسی اچھے ہسپتال میں ملازمت کی تلاش میں تھی۔

اُن کی زندگی میں نہ کوئی شور تھا، نہ کوئی بے چینی، بس ایک سیدھا سادہ راستہ، جس پر وہ اپنے رب کی رضا کے ساتھ چل رہی تھی۔

اسی پُرسکون وادی میں ڈاکٹر عنایہ کا گھر بھی کسی جنت کے ٹکڑے سے کم نہ تھا، سادہ سا مگر محبت سے بھرا ہوا۔

اُس کے بابا زیان صاحب ایک ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھے؛ چہرے پر وقار، لہجے میں نرمی، اور آنکھوں میں اپنی بیٹی کے لیے فخر صاف جھلکتا تھا۔ انہوں نے پوری زندگی ڈسپلن اور فرض شناسی میں گزاری تھی، اور اب اپنی فیملی کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔

عنایہ کی امی روبینہ ایک سادہ سی گھریلو خاتون تھیں نہ زیادہ بولنے والی، نہ شکایت کرنے والی، بس ہر وقت گھر کو سنبھالنا، سب کے لیے دعا کرنا، اور اپنی اولاد کی خوشیوں میں اپنی خوشی تلاش کرنا اُن کی عادت تھی۔

عنایہ خود سنجیدہ، سمجھدار، اور اپنے مقصد سے جڑی ہوئی،

جبکہ اُس کا چھوٹا بھائی حذیفہ ابھی صرف 18 سال کا تھا، بھوری آنکھیں، چنچل، شوخ، اور ہر وقت ہنسی مذاق کے موڈ میں رہنے والا۔ دونوں بہن بھائیوں کے درمیان ایک عجیب سا پیارا سا رشتہ تھا، گہری محبت بھی، اور ہلکی پھلکی نوک جھونک بھی۔

گھر میں ان دونوں کی ہنسی گونجتی رہتی تھی، کبھی چھوٹی موٹی بحث، کبھی مذاق، کبھی امی کی ڈانٹ، اور بابا کی مسکراتی ہوئی نصیحت یہ سب مل کر ایک ایسا ماحول بناتے تھے جہاں سکون بھی تھا اور محبت بھی۔ اُسے کیا خبر تھی... کہ اس خاموش، پُرسکون وادی سے بہت دور ایک ایسی دنیا بھی ہے، جہاں ایک شخص اپنی ہی زندگی کے شور میں گم ہے، اور بہت جلد یہ دو بالکل مختلف دنیائیں ایک دوسرے سے ٹکرانے والی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دل پر کسی کا زور نہیں چلتا...

محبت ایک ایسا احساس ہے جو بتا کر نہیں آتا، اور نہ ہی یہ دیکھتا ہے کہ سامنے والا کون ہے، کہاں سے ہے، یا کیسا ہے۔ اسی لیے اکثر نیک، باحیا اور دین دار لڑکیاں بھی کسی نہ کسی لمحے اس احساس سے گزر جاتی ہیں، وہ بھی کسی کو پسند کر بیٹھتی ہیں، کسی کی باتوں میں اپنائیت محسوس کرتی ہیں، کسی کی موجودگی میں سکون ڈھونڈنے لگتی ہیں۔

یہ سب فطری ہے...

مگر اصل امتحان یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

حد سے بڑھ کر محبت...

وہ بھی ایک غیر محرم سے...

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا نفس اور ایمان آمنے سامنے آجاتے ہیں۔

دل کہتا ہے کہ قریب جاؤ، بات کرو، اس احساس کو جیو..

مگر دین کہتا ہے کہ رک جاؤ، یہ راستہ تمہیں اس طرف لے جائے گا جہاں سے واپسی آسان نہیں ہو گی، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کی دنیا میں ہم نے دل کی آواز کو دین کی ہدایت پر ترجیح دینا شروع کر دیا ہے۔

آج کا معاشرہ

"modern"

ہو چکا ہے، رشتے آسان ہو گئے ہیں، بات چیت عام ہو گئی ہے، اور حدود آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ ہم نے شریعتِ اسلام کو پیچھے چھوڑ کر اپنی سہولت کے مطابق ایک نیا معیار بنا لیا ہے، جہاں،

"feeling"

کو حق سمجھ لیا گیا ہے، اور "حد" کو پابندی۔

ہم کہتے ہیں کہ نیت صاف ہے، دل صاف ہے...

مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام صرف نیت کا نہیں، عمل کا بھی دین ہے۔

مسئلہ محبت کا نہیں...

مسئلہ اُس محبت کے راستے کا ہے۔ اگر وہ راستہ حلال ہو، نکاح کی طرف جائے تو وہی محبت عبادت بن جاتی ہے، سکون بن جاتی ہے۔ مگر اگر وہی محبت حدود توڑ کر غیر محرم کے ساتھ جڑ جائے، تو وہ آہستہ آہستہ انسان کو اندر سے توڑ دیتی ہے۔

جانتے ہو۔۔۔

ماں باپ کے رشتے سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔

ان کے فیصلے اولاد کے لیے حکم کی مانند ہوتے ہیں۔۔۔

جنہیں ماننا سکھایا جاتا ہے، جن پر سوال کرنا بدتمیزی سمجھا جاتا ہے۔

بچہ آنکھیں بند کر کے یقین کرتا ہے کہ جو ماں باپ کر رہے ہیں وہی درست ہے۔

مگر۔۔۔

کبھی کبھار یہی فیصلے۔۔۔

اولاد کی پوری زندگی برباد کر دیتے ہیں۔

یہ بات سننے میں سخت لگتی ہے مگر حقیقت اکثر نرم نہیں ہوتی۔

ایک تحقیق کے مطابق دنیا میں ہر سال تقریباً 7 فیصد بچے اپنے ماں باپ سے الگ ہو کر سنگل پیرنٹ زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہ صرف ایک فیصد نہیں۔۔۔

یہ لاکھوں چھوٹے چھوٹے دل ہیں۔۔۔

جو ایک ہی دن میں بڑے ہو جاتے ہیں۔

ان میں سے کچھ بچے اندر ہی اندر ٹوٹ جاتے ہیں۔۔۔

تقریباً 2 فیصد شدید،

anxiety اور depression

کا شکار ہو جاتے ہیں۔۔۔

اور باقی 5 فیصد محبت کی تلاش میں بھٹکنے لگتے ہیں۔

کیونکہ۔۔۔ جب گھر سے محبت نہیں ملتی۔۔۔ تو دل خالی رہ جاتا ہے۔ اور خالی دل ہمیشہ کسی نہ کسی کو ڈھونڈتا ہے۔

وہ بچے جو کل تک ماں کی گود اور باپ کے سائے میں محفوظ تھے۔۔۔

آج اچانک دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں۔

ایک حصہ ماں کے ساتھ۔۔۔

ایک حصہ باپ کے ساتھ۔۔۔

اور دل۔۔۔؟

وہ پھر کسی کے پاس نہیں رہتا۔

وہ بچہ جو رات کو چپکے سے یہ سوچتا ہے: "کاش آج سب پہلے جیسا ہو جائے..."

وہ بچہ جو دروازے کی آواز پر دوڑتا ہے، شاید دونوں ایک ساتھ آ جائیں...

مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا۔

ماں باپ جب الگ ہوتے ہیں...

تو وہ ایک دوسرے کی غلطیاں دیکھتے ہیں، اپنی تکلیف گنواتے ہیں...

مگر وہ یہ نہیں دیکھ پاتے کہ ایک چھوٹا سا دل بیچ میں خاموشی سے مر رہا ہوتا ہے۔

وہ بچہ جو دونوں کو ایک ساتھ چاہتا ہے...

مگر اسے سکھا دیا جاتا ہے کہ اب اسے ایک کو چننا ہو گا۔

پھر وقت گزر تا ہے...

وہ بچہ بڑا ہو جاتا ہے...

مگر اس کے اندر کا خلا کبھی نہیں بھر تا۔

وہ باہر محبت ڈھونڈ تا ہے،

کسی کی باتوں میں سکون، کسی کی توجہ میں اپنائیت...

اور اکثر...

وہ غلط لوگوں میں، غلط جگہوں پر، غلط محبت ڈھونڈ لیتا ہے۔

Lahore

لاہور کی مصروف سڑکوں، شور سے بھرے بازاروں اور تیز رفتار زندگی کے درمیان ایک اور کہانی.
سانس لے رہی تھی...

ایک ایسی کہانی جس میں محرومی بھی تھی اور خاموش صبر بھی۔

ریان عمر صرف اٹھارہ سال.

قد چھ فٹ، آنکھیں ہلکی جھیل جیسی سبز،

. مگر اِن میں عمر سے زیادہ تھکن۔ گھنگھریالے بال، اور چہرے پر ایسی سنجیدگی جو وقت سے پہلے بڑی ہو جانے والی اولاد کے چہروں پر آجاتی ہے۔

وہ کم گو تھا...

مگر دل میں بہت کچھ چھپا کر رکھتا تھا۔

حال ہی میں وہ سیکنڈ ائیر کے امتحانات سے فارغ ہوا تھا، اور اب روزگار کی تلاش میں تھا۔ کیونکہ زندگی نے اُسے خوابوں سے پہلے ذمہ داریاں دے دی تھیں۔

لاہور کے ایک چھوٹے سے گھر میں اُس کی دنیا صرف اُس کی ماں تک محدود تھی۔ اُس کی ماں شاہینہ دراصل ڈاکٹر عنایہ کی خالہ تھیں۔ ایک سادہ مزاج، نرم دل عورت...

جس نے زندگی میں بہت کچھ خاموشی سے سہا تھا۔

ریان ابھی بہت چھوٹا تھا جب اُس کے والد اُسے اور اُس کی ماں کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

ایک طلاق...

چند لفظ...

اور ایک گھر ہمیشہ کے لیے بکھر گیا تھا۔

وہ شخص جاتے ہوئے صرف شاہینہ کو تنہا نہیں چھوڑ گیا تھا،

وہ اپنے بیٹے کے بچپن کی خوشیاں بھی ساتھ لے گیا تھا۔

ریان نے کبھی اپنے باپ کے خلاف زبان نہیں کھولی،

شاید اس لیے کیونکہ اُس نے کبھی باپ کی محبت کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

مگر ہر اُس بچے کی طرح جس کا باپ زندہ ہو کر بھی اُس کے ساتھ نہ ہو...

اُس کے اندر بھی ایک خاموش خلا موجود تھا۔

وہ اکثر رات کو اپنی ماں کو چپ کر روتے دیکھتا،

اور اگلی صبح وہی عورت اُس کے لیے مسکرا کر ناشتہ بناتی۔

شاید اسی لیے ریان وقت سے پہلے سمجھدار ہو گیا تھا۔

"امی..."

"آپ فکر نہ کریں، مجھے کہیں نہ کہیں کام مل جائے گا..."

وہ اکثر شاہینہ سے کہتا۔

اور شاہینہ اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر بس اتنا کہتیں، "بس خود کو اتنا نہ تھکایا کرو"

ڈاکٹر عنایہ کو بھی ریان سے بہت لگاؤ تھا۔ بچپن میں وہ اکثر اُسے پڑھایا کرتی تھیں، اُس کے لیے چھوٹی چھوٹی چیزیں لاتی تھیں، اور ہر بار اُس سے یہی کہتی تھیں،

"ریان... تم بہت اچھے انسان بنو گے۔"

اور شاید،

وہ آج تک انہی لفظوں کا سہارا لیے جیتا آ رہا تھا۔

الاہور کے اسی ہجوم، شور اور بے رحم مصروف زندگی کے درمیان ایک اور لڑکی بھی اپنی زندگی سے لڑ رہی تھی...

نور منہاج، عمر انیس سال...

ہلکی بھوری آنکھیں، سادہ سا حلیہ، نہ کوئی بناوٹ نہ نمائش

وہ اُن لڑکیوں میں سے نہیں تھی جنہیں دیکھ کر لوگ رک جائیں...

مگر اُس کی باتیں ایسی تھیں کہ سامنے والا خاموش ضرور ہو جاتا تھا۔

زبان تیز، ہر بات کا اُلٹا جواب، اور لہجے میں عجیب سی سختی... جیسے زندگی نے اُسے وقت سے پہلے مضبوط ہونا سکھا دیا ہو۔

نور نے صرف سیکنڈ ائیر تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اور آگے وہ لاہور کی اسلامِک یونیورسٹی میں پڑھنا چاہتی تھی، مگر اس سے پہلے ہی حالات نے اُسے کتابوں سے نکال کر زندگی کے میدان میں لا کھڑا کیا۔

چھ ماہ پہلے ایک حادثے نے اُس کی پوری دنیا چھین لی تھی۔ اُس کے ماں باپ ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔

ایک لمحہ...

اور وہ لڑکی جو کبھی گھر لوٹنے کی جلدی کیا کرتی تھی... اچانک دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ شروع شروع میں لوگوں نے بہت ہمدردی دکھائی...

رشتے دار آئے، افسوس کیا، وعدے کیے، مگر وقت کے ساتھ سب اپنی اپنی زندگیوں میں واپس چلے گئے۔

اور نور...؟

وہ تنہا رہ گئی۔ وہ ایک چھوٹے سے کرائے کے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ ایک ایسا گھر جہاں خاموشی بہت زیادہ تھی...

اور راتیں بہت لمبی۔ گھر کا کرایہ، بجلی کے بل، روزمرہ کے اخراجات..

.سب کچھ اب اُس کے کندھوں پر تھا۔ اسی لیے اُس نے ایک کال سینٹر میں ملازمت کر لی تھی۔ دن بھر لوگوں کی باتیں سننا، مصنوعی لہجے میں مسکرانا، اور پھر رات کو تھکی ہوئی گھر لوٹ آنا... یہی اُس کی زندگی بن چکی تھی۔ مگر اُس کی سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ اپنی کمزوری کسی کو دکھاتی نہیں تھی۔ اگر کوئی ہمدردی دکھاتا تو فوراً کہتی، "میں ابھی زندہ ہوں، اتنی بھی بے بس نہیں ہوئی۔" اور اگر کوئی اُسے خاموش کروانے کی کوشش کرتا تو وہ فوراً الٹا جواب دے دیتی۔

شاید... یہ اُس کا خود کو بچانے کا طریقہ تھا۔ کیونکہ بعض لوگ روتے نہیں... بس سخت لہجے اوڑھ لیتے ہیں۔ اور نور منہاج بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھی۔

جانتے ہو...؟

ہم انسان بہت مطلبی ہوتے ہیں۔

ہم پر اگر ذرا سی بھی مصیبت آجائے...

کوئی اپنا چھوڑ جائے...

یا زندگی ہماری مرضی کے مطابق نہ چلے...

تو ہم فوراً اللہ سے شکوے کرنے لگتے ہیں۔

یا اللہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا...؟ میں نے آخر کیا غلط کیا تھا...؟

میری زندگی اتنی مشکل کیوں ہے...؟

مگر یہ سب کہتے وقت ہم شاید یہ بھول جاتے ہیں...

کہ ہمارے آس پاس ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں...

جو ہم سے کہیں زیادہ مشکل زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔

کبھی اپنے ارد گرد غور سے دیکھو...

کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو رات کو بھوکا سوتا ہے... مگر پھر بھی "الحمدللہ" کہتا ہے۔

کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اپنے ماں باپ کو قبر میں اتارنے کے بعد بھی جینا سیکھ لیتا ہے۔

کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اپنے ہی گھر میں محبت کو ترستا رہتا ہے۔

ہم ایک چھوٹی سی تکلیف پر ٹوٹ جاتے ہیں...

مگر کہیں کوئی نور منہاج جیسی لڑکی بھی ہوتی ہے... جس کے ماں باپ ایک حادثے میں دنیا چھوڑ گئے... اور وہ اکیلی اس بے رحم دنیا کا سامنا کر رہی ہے۔ نہ کوئی سہارا... نہ کوئی اپنا... پھر بھی وہ ہر صبح اٹھتی ہے، کام پر جاتی ہے، اور زندگی سے لڑتی ہے۔

کہیں کوئی ریان بھی ہوتا ہے...

جو باپ کے زندہ ہونے کے باوجود باپ کی محبت سے محروم رہتا ہے۔

جو اپنی ماں کو چھپ چھپ کر روتے دیکھتا ہے... اور پھر وقت سے پہلے بڑا ہو جاتا ہے۔

اور کہیں کوئی حمزہ اسفند بھی ہوتا ہے...

جس کے پاس دولت، شہرت، آزادی... سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر سکون نہیں ہوتا۔

ہم اکثر اپنی زندگی کو سب سے زیادہ مشکل سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ہم صرف اپنا درد محسوس کرتے ہیں۔ مگر اگر کبھی ایک لمحے کے لیے ہم دوسروں کے زخم دیکھ لیں...

تو شاید ہم اپنے غموں پر بھی "الحمدللہ" کہنا سیکھ جائیں۔ اللہ ہر انسان کو ایک جیسی آزمائش نہیں دیتا۔ کسی کو محرومی سے آزماتا ہے...

کسی کو تنہائی سے،

کسی سے محبت چھین کر...

اور کسی کو محبت دے کر...

مگر فرق صرف اتنا ہوتا ہے، کچھ لوگ آزمائش میں بھی اللہ کو تھام لیتے ہیں..

اور کچھ لوگ شکووں میں اللہ سے ہی دور ہو جاتے ہیں۔

28 April

پیرس ایک خوبصورت صبح تھی۔

سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں اپارٹمنٹ کی بڑی شیشے والی کھڑکیوں سے اندر آرہی تھیں۔

حمزہ اسفند اپنی عادت کے مطابق دیر سے بیدار ہوا۔ کمرے سے نکل کر جب وہ نیچے آیا تو گرینی پہلے ہی ناشتے کی میز سجا چکی تھیں۔

"صبح بخیر، بابا۔"

گرینی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

صبح بخیر، گرینی۔

حمزہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ گرینی نے اُس کی پلیٹ میں ناشتہ رکھتے ہوئے پوچھا،

"آج یونیورسٹی میں زیادہ کام ہے؟"

حمزہ نے بے دلی سے سر ہلایا۔

"ہمیشہ کی طرح..."

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر اچانک حمزہ بولا،

"گرینی، کیا آپ کو نہیں لگتا کہ کچھ لوگ پیسے کمانے میں اتنے مصروف ہو جاتے ہیں کہ اپنے رشتے ہی بھول جاتے ہیں؟"

گرینی سمجھ گئی تھیں کہ بات کس کی ہو رہی ہے۔

"تم اپنے بابا کی بات کر رہے ہو؟"

حمزہ ہلکا سا ہنسا۔

"اور کون ہو سکتا ہے؟"

اُس نے کافی کا کپ میز پر رکھا۔

انہیں ہر وقت صرف کاروبار کی فکر رہتی ہے۔

" کبھی امریکہ..."

" کبھی لندن..."

" کبھی کوئی نئی میٹنگ..."

" کبھی کوئی نیا معاہدہ..."

اُس کی آواز میں چھپی تلخی واضح تھی۔

" مگر ان کے پاس اپنے بیٹے کے لیے وقت نہیں ہے۔"

گرینی خاموشی سے سنتی رہیں۔ حمزہ نے نظریں جھکالیں۔

"مجھے یاد بھی نہیں کہ آخری بار انہوں نے مجھ سے دل کی بات کب کی تھی۔"

"انہیں یہ بھی نہیں معلوم ہو گا کہ مجھے کون سا رنگ پسند ہے..."

"میں خوش ہوں یا نہیں..."

"میں زندہ ہوں یا مر گیا..."

"حمزہ!"

گرینی نے فوراً ٹوکا۔ مگر وہ رکنے والا نہیں تھا۔

"سچ کہہ رہا ہوں گرینی۔"

"اگر میں ایک دن اچانک غائب ہو جاؤں تو شاید انہیں چند دن بعد یاد آئے کہ اُن کا ایک بیٹا بھی ہے۔"

گرینی نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

حمزہ خاموش ہو گیا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے سامنے مضبوط بنتا تھا، مگر گرینی کے سامنے اُس کے دل کی اصل حالت ظاہر ہو جاتی تھی۔

کچھ دیر بعد اُس نے ناشتہ ختم کیا، اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور یونیورسٹی کے لیے روانہ ہو گیا۔ پورا دن کلاسوں، دوستوں اور مصروفیات میں گزر گیا۔

شام ڈھلتے ہی وہ اپنے واحد سچے دوست

Fang

کے دفتر پہنچ گیا۔ بھوری آنکھوں اور گورے رنگ والا خوش مزاج نوجوان، جو قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وکالت کے شعبے سے وابستہ ہو ہو چکا تھا۔

فینگ کے والدین مسلمان تھے۔ وہ مزاحیہ طبیعت کا مالک تھا اور ہر محفل کی جان سمجھا جاتا تھا۔ حمزہ اکثر کہتا تھا: "اگر دنیا میں کوئی ایک شخص ہے جو میرا دماغ خراب ہونے سے بچا سکتا ہے... تو وہ فینگ ہے۔"

فینگ ہمیشہ ہنس کر جواب دیتا،

"اور اگر دنیا میں کوئی ایک شخص ہے جو میرا دماغ خراب کر سکتا ہے... تو وہ تم ہو، حمزہ اسفند!"""

یوں دونوں دوستوں کی ایک اور شام شروع ہوئی، مگر انہیں نہیں معلوم تھا کہ قسمت اُن کی زندگیوں میں بہت جلد ایسے موڑ لانے والی تھی جن کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

دوسری طرف، سکردو۔۔۔

برف سے ڈھکے پہاڑوں کے پیچھے سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا، اور ٹھنڈی ہوا گھر کے صحن میں لگے پھولوں کو ہلکے ہلکے جھولا دے رہی تھی۔

یہ وہ گھر تھا جہاں دولت شاید بہت زیادہ نہ تھی۔۔۔ مگر محبت بے حساب تھی۔

ڈاکٹر عنایہ کے لیے یہی گھر دنیا کی سب سے خوبصورت جگہ تھا۔

ایک دن جیسے ہی وہ ہسپتال سے واپس آئیں، دروازہ کھولتے ہی ایک آواز گونجی۔

"آپی۔۔۔ آخر آ ہی گئیں!" یہ حذیفہ تھا۔

اٹھارہ سال کا شوخ، شرارتی مگر نہایت فرمانبردار لڑکا، جس کی دنیا اپنی بڑی بہن سے شروع ہو کر اُسی پر ختم ہوتی تھی۔ عنایہ نے مسکراتے ہوئے اپنا بیگ ایک طرف رکھا۔

"آج پھر میرا انتظار کر رہے تھے؟" حذیفہ نے مصنوعی ناراضی سے منہ بنایا۔

"اور نہیں تو کیا؟ امی نے کھانا بھی آپ کے بغیر نہیں کھانے دیا۔"

عنایہ ہنس پڑیں۔

"اچھا! تو سارا قصور میرا ہے؟"

"جی بالکل... آپ نہ ہوں تو اس گھر میں کسی کا دل ہی نہیں لگتا۔"

یہ سن کر عنایہ نے آگے بڑھ کر اس کے بال بکھیر دیے۔

"تم کبھی بڑے بھی ہو گے یا ہمیشہ ایسے ہی رہو گے؟"

حذیفہ نے فوراً جواب دیا، "اگر بڑا ہو گیا تو پھر آپ سے لاڈ کون کرے گا؟" دونوں بہن بھائی کی ہنسی پورے گھر میں گونج اٹھی۔

باورچی خانے میں عنایہ کی والدہ مسکراتے ہوئے دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ "تم دونوں کی نوک جھوک شاید کبھی ختم نہیں ہو گی۔" عنایہ آگے بڑھیں اور اپنی امی کو گلے لگالیا۔

"امی... آج بہت تھک گئی ہوں۔"

انہوں نے پیار سے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"مجھے معلوم ہے... مگر میری بیٹی مضبوط ہے۔"

اسی دوران دروازہ کھلا۔

ریٹائرڈ فوجی افسر، عنایہ کے والد، اندر داخل ہوئے۔

ان کی شخصیت میں آج بھی وہی وقار، وہی مضبوطی اور وہی نظم وضبط نمایاں تھا۔ جیسے ہی حذیفہ نے اپنے بابا کو دیکھا، فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم بابا!"

"وعلیکم السلام، میرے شیر!" انہوں نے پہلے اپنے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر عنایہ کی طرف دیکھا۔

"آج کیسی رہی ڈیوٹی، ڈاکٹر صاحبہ؟"

عنایہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ الحمدللہ بابا، آج بھی اللہ نے آسانی فرمادی۔

وہ فخر سے اپنی بیٹی کو دیکھنے لگے۔

"مجھے ہمیشہ یقین تھا کہ میری بیٹی ایک دن بہت اچھی معالج بنے گی۔"

رات کے کھانے پر چاروں ایک ہی دستر خوان پر بیٹھے تھے۔

باتیں ہو رہی تھیں۔۔۔

ہنسی گونج رہی تھی۔۔۔۔

اور ہر چند لمحوں بعد کسی نہ کسی کی مسکراہٹ پورے گھر کو مزید خوبصورت بنا دیتی۔

عنایہ کبھی اپنی امی کی پلیٹ میں سالن ڈال دیتیں۔۔۔ تو کبھی اپنے بابا کے لیے پانی کا گلاس بھر دیتیں۔

اور حذیفہ ہمیشہ کی طرح کہتا، "آپ سب کو صرف آپی ہی نظر آتی ہیں، میں تو شاید اس گھر میں گود لیا گیا ہوں!"

یہ سنتے ہی سب زور سے ہنس پڑتے۔ عنایہ نے شرارت سے اُس کے ماتھے پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"ڈرامے کم کیا کرو، تم اس گھر کی سب سے بڑی مصیبت ہو۔" حذیفہ نے فوراً جواب دیا،

"اور آپ سب سے زیادہ پیاری مصیبت۔"

وہ گھر صرف اینٹوں اور دیواروں کا نام نہیں تھا۔۔۔

وہ محبت، احترام اور اعتماد سے بنا ہوا ایک خاندان تھا۔

جہاں اختلاف ہو سکتا تھا۔۔۔

مگر دل کبھی ایک دوسرے سے دور نہیں ہوتے تھے۔

اور شاید۔۔۔اسی محبت نے ڈاکٹر عنایہ کو وہ سکون دیا تھا، جس کی کمی دنیا کے بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں ہمیشہ رہ جاتی ہے۔

دوسری طرف لاہور کی ایک مصروف صبح۔

ریان صاف ستھرے کپڑے پہن کر، ہاتھ میں فائل لیے، ایک معروف کال سینٹر کے دفتر کے باہر کھڑا تھا، وہ بار بار اپنے کپڑے درست کرتا، کبھی بال سنوارتا اور کبھی گہری سانس لیتا۔

"یااللہ... بس آج عزت رکھ لینا۔"

یہ اُس کی پہلی ملازمت کا انٹرویو تھا، اس لیے گھبراہٹ ہونا فطری بات تھی۔

چند منٹ بعد اُس کا نام پکارا گیا۔

"ریان!"

"وہ فوراً کھڑا ہوا، "جی... آرہا ہوں۔

انٹرویو شروع ہوا۔

چند سوال اُس کی تعلیم کے بارے میں ہوئے، چند اُس کے مزاج کے بارے میں، اور پھر اُس سے مختلف حالات میں لوگوں سے بات کرنے کا طریقہ پوچھا گیا۔

ریان نے نہایت اعتماد اور شائستگی سے ہر سوال کا جواب دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد انٹرویو لینے والے شخص نے مسکراتے ہوئے کہا،

"مبارک ہو، ریان! آپ کا ہمارے کال سینٹر میں انتخاب ہو گیا ہے۔ آپ کل صبح سے اپنی ملازمت شروع کر سکتے ہیں۔"

چند لمحوں کے لیے ریان کو یقین ہی نہ آیا۔

"س... سچ؟"

"جی بالکل، ہمیں آپ کا اندازِ گفتگو پسند آیا۔"

"الحمدللہ"

وہ بے اختیار مسکرا اٹھا۔

دفتر سے باہر نکلتے ہی اُس نے سب سے پہلے اپنا موبائل نکالا اور اپنے سب سے عزیز دوست اور خالہ زاد بھائی حذیفہ کو واٹس ایپ پر میسج بھیجا۔

"الحمدللہ! میری کال سینٹر میں جاب لگ گئی۔ آخر کار مجھے کام مل گیا۔"

ابھی میسج پر نیلا نشان بھی نہیں آیا تھا کہ اچانک حذیفہ کی کال آ گئی۔

ریان فوراً ہنستے ہوئے بولا،

"ارے واہ! ابھی تو تم نے میرا میسج دیکھا بھی نہیں ہو گا۔"

دوسری طرف سے حذیفہ کی ہنستی ہوئی آواز آئی۔

"!میسج بعد میں دیکھوں گا، پہلے میری بات سنو"

"اچھا جی، فرمایئے حضور۔"

"میں آئی ایس ایس بی کے امتحان کی تیاری کے لیے چند دن میں لاہور آ رہا ہوں۔"

ریان خوشی سے تقریباً اچھل پڑا۔

"سچ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں، اور اس بار بہانہ نہیں چلے گا۔ مجھے پورا لاہور گھمانا پڑے گا۔"

ریان زور سے ہنس پڑا۔

"پہلے تم امتحان کی تیاری کر لینا، پھر لاہور بھی گھوم لیں گے۔"

حذیفہ نے مصنوعی غصے سے کہا،

"دوستی بھی نبھانی ہے یا صرف نوکری ہی کرنی ہے؟"

"چلو ٹھیک ہے، تم آؤ... پھر تمہاری خوب خاطر داری ہو گی۔"

دونوں کی ہنسی کافی دیر تک فون پر گونجتی رہی۔

اُدھر اسی کال سینٹر کے اندر،

نور منہاج اپنی میز پر بیٹھی نئے آنے والے ملازمین کی فہرست دیکھ رہی تھی۔

اچانک اُس کی نظر شیشے کے دروازے سے اندر آتے ریان پر پڑی۔

سادہ لباس،

ہاتھ میں فائل،

اور چہرے پر معصوم سی گھبراہٹ۔

نور نے ایک نظر اُسے دیکھا، پھر ناک چڑھاتے ہوئے دل ہی دل میں بولی،

"یااللہ... ایک اور آگیا۔"

ساتھ بیٹھی لڑکی نے پوچھا،

"کسے دیکھ رہی ہو؟"

نور نے آہستہ سے جواب دیا،

"لگتا ہے کال سینٹر والوں نے آج پھر کسی نئے لڑکے کو رکھ لیا ہے۔"

پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑائی،

چلو دیکھتے ہیں... یہ صاحب کتنے دنوں میں اپنی اصلی شکل دکھاتے ہیں۔ آج کل کے زیادہ تر لڑکے شروع میں بڑے معصوم بنتے ہیں، بعد میں پتہ چلتا ہے کہ باتوں میں سب سے بڑے کھلاڑی یہی ہوتے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

اُسے کیا معلوم تھا،

جسے وہ پہلی نظر میں ایک عام سا لڑکا سمجھ رہی تھی،

وہی لڑکا ایک دن اُس کی زندگی کا سب سے خوبصورت اور سب سے مشکل باب بننے والا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی۔

ریان کے چہرے پر آج ایک الگ ہی خوشی تھی۔ جیسے ہی وہ گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، زور سے آواز لگائی،

"امی... کہاں ہیں آپ؟"

باورچی خانے سے شاہینہ کی آواز آئی،

"اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟ آ رہی ہوں۔"

جیسے ہی وہ باہر آئیں، ریان نے مسکراتے ہوئے اُن کے ہاتھ تھام لیے۔

"امی... ایک خوشخبری ہے۔"

شاہینہ نے فکرمند لہجے میں پوچھا،

"خیر تو ہے نا؟"

ریان نے خوشی سے کہا،

"الحمدللہ... میری کال سینٹر میں ملازمت لگ گئی ہے۔ کل سے کام شروع کرنا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے شاہینہ خاموش رہ گئیں۔

پھر اُن کی آنکھیں خوشی سے نم ہو گئیں۔

انہوں نے فوراً اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"الحمدللہ... الحمدللہ۔ اللہ نے میری دعا سن لی۔"

ریان مسکرا دیا۔

"اب آپ کو ہر خرچ کے لیے فکر نہیں کرنی پڑے گی۔"

شاہینہ نے فوراً اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں بیٹا... ابھی تمہاری عمر ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبنے کی نہیں ہے۔"

ریان ہلکا سا مسکرایا۔

"لیکن حالات نے میری عمر نہیں دیکھی، امی۔"

یہ سن کر شاہینہ نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے، میرے بچے۔"

ابھی دونوں بیٹھ کر چائے پی ہی رہے تھے کہ شاہینہ کا موبائل بج اٹھا۔

اسکرین پر نام چمک رہا تھا۔

روبینہ باجی۔

شاہینہ کے چہرے پر فوراً مسکراہٹ آ گئی۔

"السلام وعلیکم باجی!"

"وعلیکم السلام، شاہینہ! کیسی ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے، آپ سنائیں۔"

دوسری طرف سے روبینہ ہنستے ہوئے بولیں،

"میں نے سوچا تمہیں ایک خوشخبری دے دوں۔"

"کیسی خوشخبری؟"

"حذیفہ چند دنوں میں آئی ایس ایس بی کی تیاری کے لیے لاہور آ رہا ہے۔"

شاہینہ خوش ہو گئیں۔

"ارے واہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ریان بھی خوش ہو جائے گا۔"

پھر دونوں بہنوں کی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

کبھی بچپن کی یادیں،

کبھی خاندان کی باتیں،

کبھی عنایہ کا ذکر،

اور کبھی آنے والے دنوں کی منصوبہ بندی۔

کافی دیر تک دونوں بہنیں ہنستی مسکراتی باتیں کرتی رہیں۔

اچانک دوسری طرف سے کسی نے موبائل چھین لیا۔

"ہیلو... خالہ جان"

شاہینہ ہنس پڑیں۔

"ارے، یہ تو ہمارے صاحبزادے ہیں۔"

حذیفہ نے شوخ لہجے میں کہا،

"خالہ! میں آ رہا ہوں، پہلے سے بتا رہا ہوں۔"

"ہاں بیٹا، آجاؤ۔"

"لیکن ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میرا کمرہ تیار ہونا چاہیے۔"

شاہینہ نے ہنستے ہوئے کہا،

"یہاں تو صرف میرے علاوہ صرف ایک ریان کا کمرہ ہے۔"

حذیفہ نے فوراً جواب دیا،

"بس پھر فیصلہ ہو گیا... ریان کا کمرہ اب میرا ہوا۔"

پاس بیٹھا ریان زور سے بولا،

"اوئے! میرا کمرہ کیوں؟"

حذیفہ نے قہقہہ لگایا۔

"کیونکہ میں مہمان ہوں، اور مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔"

ریان نے ہنستے ہوئے کہا،

"رحمت ہو یا زحمت، کمرہ میرا ہی رہے گا۔"

حذیفہ نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا،

"خالہ! آپ ریان کو صحن میں سُلا دیجیے، میں آرام سے اُس کے کمرے میں رہ لوں گا۔"

شاہینہ اپنی ہنسی نہ روک سکیں۔

"نہیں بیٹا، صحن میں تم سو جانا۔"

"یہ تو زیادتی ہے، اب"

ریان نے فوراً کہا،

امی! اسے چھت پر چارپائی ڈال دیجیے، ٹھنڈی ہوا بھی آئے گی اور مچھر بھی اس کی اچھی خاطر داری" "کریں گے۔

اوئے بدتمیز!" حذیفہ ہنستے ہوئے بولا،"

""بس آنے دو مجھے، پھر حساب برابر کروں گا۔"

"پہلے آ تو جاؤ، پھر دیکھیں گے کس کا حساب برابر ہوتا ہے۔"

دونوں کی نوک جھونک سن کر شاہینہ اور روبینہ بے اختیار ہنسنے لگیں۔

ان دونوں بہنوں کو معلوم تھا،

یہ دونوں لڑکے صرف خالہ زاد بھائی ہی نہیں تھے،

بلکہ ایک دوسرے کے سب سے اچھے دوست بھی تھے۔

دوسری طرف پیرس،

وقت خاموشی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

حمزہ اسفند کی تعلیم اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ آج اُس کے آخری سمسٹر کا آخری امتحان تھا۔ برسوں کی محنت، بے شمار راتوں کی جاگ، منصوبے، عملی مشقیں... سب آج ایک آخری پرچے پر آ کر ٹھہر گئے تھے۔

امتحان ختم ہوتے ہی پوری یونیورسٹی خوشیوں سے گونج اٹھی۔ کوئی تصاویر بنا رہا تھا، کوئی ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہا تھا، تو کوئی اپنی آئندہ زندگی کے منصوبے بنا رہا تھا۔

حمزہ بھی امتحانی ہال سے باہر نکلا۔

سیاہ چشمہ آنکھوں پر، چہرے پر پُراعتماد مسکراہٹ اور قدموں میں وہی بے فکری۔

وہ جانتا تھا کہ اب زیادہ وقت باقی نہیں تھا۔

بہت جلد وہ فلمی دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے والا تھا۔ اداکاری اُس کا خواب نہیں، اُس کا جنون تھی، اور اُسے اپنے ہنر پر حد سے زیادہ یقین تھا۔

دوسری جانب فینگ بھی اپنی زندگی میں مصروف ہو چکا تھا۔ وہ وکالت کے شعبے میں اپنی پہچان بنانے کے لیے دن رات محنت کر رہا تھا۔ پہلے کی نسبت دونوں دوست کم ملتے تھے، مگر اُن کی دوستی میں کبھی فرق نہیں آیا تھا۔

جب بھی وقت ملتا،

دونوں دیر رات تک باتیں کرتے، ہنستے، ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے اور پھر اپنی اپنی دنیا میں واپس لوٹ جاتے۔

مگر ایک حقیقت ایسی بھی تھی،

جس پر اُن دونوں نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

وہ دونوں دین سے بہت دور تھے۔

نماز،

قرآن،

حلال و حرام،

محرم اور نامحرم،

یہ سب الفاظ اُن کی زندگی میں شاید ہی کبھی اہمیت رکھتے تھے۔

حمزہ تو بچپن ہی سے ایسے ماحول میں پلا بڑھا تھا جہاں اسلام کے بارے میں جاننے والا کوئی موجود ہی نہیں تھا۔

اور جب انسان کو صحیح اور غلط کا فرق سکھانے والا ہی نہ ہو،

تو اکثر وہ غلط راستے کو ہی اپنی منزل سمجھ بیٹھتا ہے۔

ادھر گرینی،

جو خود مسلمان نہیں تھیں،

اُن کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی نے جگہ بنالی تھی۔

وہ کئی دنوں سے اسلام کے بارے میں کتابیں پڑھ رہی تھیں۔

کبھی اللہ کے بارے میں پڑھتیں،

کبھی رسولِ اکرم ﷺ کی سیرت،

اور کبھی قرآنِ مجید کے تراجم۔

وہ ہر نئی بات پڑھ کر حیران رہ جاتیں۔

اُنہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ دین صرف عبادات کا نام نہیں،

بلکہ زندگی گزارنے کا مکمل طریقہ ہے۔

ایک دن اُنہوں نے دل ہی دل میں کہا،

اگر میں حمزہ کو اس دین سے روشناس نہ کرا سکی... تو شاید میں اپنی سب سے بڑی ذمہ داری ادا نہ کر سکوں۔

وہ جانتی تھیں،

حمزہ اُن کی ہر بات مان لیتا ہے۔

مگر جیسے ہی دین کی بات آتی،

وہ فوراً موضوع بدل دیتا۔

"گرینی، پلیز... یہ مذہبی باتیں میرے لیے نہیں ہیں۔"

یہ جملہ وہ نہ جانے کتنی بار سن چکی تھیں۔

مگر انہوں نے ہار نہیں مانی۔

کیونکہ انہیں یقین تھا،

انسان کو ہدایت انسان نہیں دیتا۔

ہدایت تو صرف اللہ دیتا ہے۔

اور شاید،

اللہ نے اُن کے دل میں اسلام کی محبت بھی اسی لیے ڈالی تھی،

تاکہ ایک دن وہی محبت، حمزہ اسفند کے اندھیروں میں روشنی بن کر اترے۔

جانتے ہو...؟

وقت کے ساتھ ساتھ دنیا نے بہت ترقی کی ہے۔

عمارتیں بلند ہو گئی ہیں،

ٹیکنالوجی حیران کر دینے والی ہو گئی ہے،

انسان چاند تک پہنچ گیا،

مگر افسوس،

اپنے رب سے دور بھی ہوتا چلا گیا۔

آج ہم میں سے بہت سے لوگ قرآنِ مجید کو صرف گھروں کی زینت بنا کر رکھ دیتے ہیں، پڑھتے بھی ہیں تو اکثر صرف رسم کے طور پر، اور سنتِ نبوی ﷺ کو جاننے اور اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش کم ہی کرتے ہیں۔

ہمیں دین کا اتنا حصہ ضرور یاد رہتا ہے جس سے ہم دوسروں کے سامنے خود کو اچھا ثابت کر سکیں،

مگر وہ حصہ اکثر بھول جاتے ہیں جو ہمیں خود اپنے نفس کو بدلنے کا حکم دیتا ہے۔

آج عبادت سے زیادہ عبادت کی تصویر اہم ہو گئی ہے،

صدقے سے زیادہ یہ بتانا اہم ہو گیا ہے کہ صدقہ دیا ہے،

نیکی سے زیادہ اُس کا چرچا ہونے لگا ہے،

مگر یاد رہے، نیک دِکھنے اور نیک بننے میں فرق ہوتا ہے،

اور آہستہ آہستہ دکھاوا بھی ہماری عبادتوں میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ ہمارے چہروں، لباسوں یا لوگوں کی تعریف کو نہیں دیکھتا۔

وہ ہمارے دلوں کی نیت کو دیکھتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔"

(Sahih al-Bukhari، Sahih Muslim)

سوچنے کی بات یہ ہے،

اگر ہم لوگوں کو دکھانے کے لیے نیک بن رہے ہیں،

تو کیا ہم واقعی اللہ کے لیے نیک ہیں؟

اور اگر ہمیں ہر وقت لوگوں کی رائے کی فکر ہے،

تو کیا ہم نے کبھی یہ سوچا کہ اللہ ہمارے بارے میں کیا جانتا ہے؟

دین صرف لمبی داڑھی، خوبصورت لباس یا چند مذہبی جملوں کا نام نہیں،

دین سچ بولنے کا نام ہے،

امانت داری کا نام ہے،

نگاہوں کی حفاظت کا نام ہے،

حلال و حرام کی پہچان کا نام ہے،

اور سب سے بڑھ کر،

اپنے رب کے سامنے عاجزی اختیار کرنے کا نام ہے۔

شاید اسی لیے آج ہمارے پاس معلومات تو بہت ہیں،

مگر ہدایت کم ہے۔

الفاظ تو بہت ہیں،

مگر عمل کم ہے۔

اور یہی وہ خلا ہے،

جس نے ہماری زندگیوں سے سکون چھین لیا ہے۔

لاہور

آج ریان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونے والا تھا۔

یہ اُس کی ملازمت کا پہلا دن تھا۔

صبح سویرے ہی وہ تیار ہو کر آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔

سیاہ رنگ کی پینٹ،

سفید رنگ کی نفیس شرٹ،

گلے میں سیاہ ٹائی،

بال ترتیب سے سنوارے ہوئے، ہلکی سبز آنکھوں میں اعتماد، اور چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ۔

شاہینہ نے اُسے ایک نظر دیکھا تو بے اختیار مسکرا اٹھیں۔

"ماشاءاللہ... میرا بیٹا تو آج کسی ہیرو سے کم نہیں لگ رہا۔"

ریان شرما کر ہنس پڑا۔

"امی، ہیرو نہیں... بس دعا کریں پہلا دن اچھا گزر جائے۔"

شاہینہ نے اُس کے ماتھے کو چوما۔

"اللہ تمہیں ہر قدم پر کامیاب کرے، آمین۔"

کچھ دیر بعد ریان کال سینٹر کے دفتر پہنچ گیا۔

استقبالیہ پر موجود خاتون نے مسکرا کر اُس کا خیر مقدم کیا اور اُسے شعبۂ انتظامیہ کے کمرے تک لے گئی۔

چند رسمی کارروائیوں کے بعد ایک نگران افسر اُسے پورے دفتر کا دورہ کروانے لگا۔

"یہ ہماری معاونت کی ٹیم ہے"

"یہ شکایات کا شعبہ"

"اور یہ فروخت کا شعبہ"

راستے میں جس سے بھی تعارف کروایا جاتا، ریان ادب سے مسکرا کر سلام کرتا۔

اُس کی شائستگی دیکھ کر کئی ملازمین نے بھی مسکرا کر جواب دیتے۔

آخر کار نگران افسر اُسے ایک قطار کے سامنے لے جا کر رکا۔

"اور ریان، یہ آپ کی نشست ہے۔ آج سے آپ یہیں کام کریں گے۔"

ریان نے نظر اٹھا کر دیکھا،

اُس کی میز کے بالکل ساتھ والی میز پر ایک لڑکی پہلے سے بیٹھی اپنے کام میں مصروف تھی۔

وہ نور منہاج تھی۔

نور نے ایک سرسری نظر ریان پر ڈالی،

پھر دوبارہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اسی دوران اُس کی دوست عائشہ آہستہ سے اُس کے قریب آئی اور مسکراتے ہوئے بولی،

"لگتا ہے، یہ کل والا ہی ہے۔"

نور نے دوبارہ ریان کو دیکھا،

پھر ہونٹ سکیڑ کر دھیمی آواز میں بولی،

"ہاں... اور تیاری دیکھو جناب کی۔"

عائشہ نے ہنسی دباتے ہوئے پوچھا،

"کیوں؟"

نور نے شرارتی انداز میں جواب دیا،

"یہ تیار تو ایسے ہو کر آیا ہے جیسے جاب کرنے نہیں... کسی کو متاثر کرنے آیا ہو۔"

دونوں آہستہ سے ہنس پڑیں۔

پھر نور نے ریان کی طرف ایک بار پھر دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی،

"خیر... دیکھتے ہیں، یہ بھی کتنے دنوں میں اپنا اصل رنگ دکھاتا ہے۔"

عائشہ نے مذاقاً کہا،

"ہو سکتا ہے یہ واقعی اچھا لڑکا ہو۔"

نور نے فوراً جواب دیا،

میں نے اس دفتر میں جتنے نئے لڑکے دیکھے ہیں، شروع کے چند دن سب فرشتے بنتے ہیں... پھر آہستہ آہستہ اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔

عائشہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔

ادھر ریان کو اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اُس کے برابر والی نشست پر بیٹھی لڑکی نے پہلے ہی دن اُس کے بارے میں اپنی رائے قائم کر لی ہے۔

وہ تو خاموشی سے اپنی میز پر بیٹھا،

اللہ کا نام لے کر،

اپنی زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز کر رہا تھا۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔

کال سینٹر میں کام کا وقت ختم ہوتے ہی ایک ایک کر کے ملازمین اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہونے لگے۔

ریان نے اپنی میز سمیٹی، اللہ کا نام لیا، باہر نکل آیا۔

پارکنگ میں پہنچ کر اُس نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور آہستہ آہستہ دفتر سے نکل گیا۔

اُسے کیا معلوم تھا کہ اُس کے جاتے ہی دو جوڑی نظریں اُسے دیکھ رہی تھیں۔

دفتر کے مرکزی دروازے کے باہر نور منہاج اور اُس کی ساتھی عائشہ اپنی بس کا انتظار کر رہی تھیں۔

عائشہ نے جاتے ہوئے ریان کو دیکھا، پھر شرارتی انداز میں نور کی طرف دیکھ کر بولی،

"ویسے ایک بات تو ماننی پڑے گی۔"

"کون سی بات؟" نور نے بے دلی سے پوچھا۔

عائشہ ہنس دی۔

"یہ پہلا لڑکا ہے جس نے پہلے دن تمہیں بالکل نظر انداز کر دیا۔"

نور نے بھنویں اُٹھائیں۔

"تو؟"

عائشہ نے چھیڑتے ہوئے کہا،

ورنہ یہاں جتنے بھی نئے لڑکے آتے ہیں، پہلے سلام کرتے ہیں، پھر بہانے بہانے سے بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نور ہلکا سا مسکرائی۔

"اچھا ہی ہوا۔"

"کیوں؟"

نور نے بڑے سکون سے جواب دیا،

"بھلا میں کیوں مردوں کی آنکھوں کی زینت بنوں؟"

پھر اُس نے بس آنے والی سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

غیر مرد کی آنکھوں کی زینت بننے سے نہ تو عورت قیمتی بنتی ہے، نہ بے توجہی سے اُس کی عزت کم ہوتی ہے۔

عائشہ خاموشی سے اُس کی بات سنتی رہی۔

نور نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مزید کہا،

"اور جہاں تک ایسے دو ٹکے کے مردوں کی بات ہے"

وہ ذرا سا رکی۔

"انہیں اُن کی اوقات میں رکھنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔"

عائشہ ہنس پڑی۔

"اللہ خیر کرے... جس سے تمہارا واسطہ پڑا، اُس کی تو شامت ہی آجائے گی۔"

نور نے کندھے اچکائے۔

میں کسی کے پیچھے نہیں جاتی... لیکن جو میری حد پار کرے، پھر اُسے جواب دینا بھی خوب جانتی ہوں۔

اتنے میں بس آگئی اور دونوں اُس میں سوار ہو گئیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد نور اپنے کرائے کے چھوٹے سے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

جیسے ہی اُس نے دروازہ کھولا، اندر مکمل اندھیرا تھا۔

اُس نے لمبی سانس لی اور آسمان کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولی،

"اُف... یا اللہ! پھر بجلی چلی گئی۔"

لیکن اگلے ہی لمحے وہ مسکرا دی۔

"چلو... کوئی بات نہیں، یہ بھی گزر جائے گا۔"

اُس نے موبائل کی ٹارچ جلائی، چھوٹے سے باورچی خانے میں گئی اور برتن میں رکھا کل کا بچا ہوا کھانا نکال لیا۔

گیس پر اُسے گرم کیا، ایک پلیٹ میں ڈالا اور خاموشی سے بیٹھ کر کھانے لگی۔

نہ کسی سے شکوہ،

نہ قسمت سے شکایت،

نہ حالات کو برا بھلا کہا۔

بس ہر نوالے سے پہلے دل ہی دل میں "الحمدللہ" کہتی رہی۔

شاید،

زندگی نے اُسے یہ سکھا دیا تھا کہ جس کے پاس شکر کرنے کی عادت ہو،

وہ اندھیروں میں بھی روشنی ڈھونڈ لیتا ہے۔

جانتے ہو...؟

الحمدللہ "صرف ایک لفظ نہیں"

یہ ایک ایسا احساس ہے جو انسان کے دل کو سکون عطا کرتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ شکر صرف اُس وقت ادا کرتے ہیں جب ہماری ہر دعا قبول ہو جائے، ہر خواہش پوری ہو جائے اور زندگی ہماری مرضی کے مطابق چلنے لگے۔

مگر حقیقی شکر تو وہ ہے،

جو تکلیف میں بھی زبان پر ہو،

جو اندھیروں میں بھی دل سے نکلے،

اور جو آنسوؤں کے درمیان بھی انسان کو اپنے رب سے جوڑے رکھے۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتے ہیں:

﴿لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾

"ترجمہ "اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ عطا کروں گا۔"

(سورۃ ابراہیم: 7)

سوچنے کی بات ہے،

ہم ہر روز کتنی نعمتیں استعمال کرتے ہیں؟

سانس،

بینائی،

صحت،

ماں کی دعا،

اپنوں کی محبت،

اور پھر بھی ہم اکثر اُس ایک چیز کا رونا روتے رہتے ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہوتی۔ جبکہ اللہ نے ہمیں سینکڑوں ایسی نعمتیں عطا کر رکھی ہوتی ہیں جن کا ہم کبھی حساب ہی نہیں کرتے۔

شکر کا مطلب صرف "الحمدللہ" کہہ دینا نہیں،

بلکہ یہ یقین رکھنا بھی ہے کہ، اللہ کا ہر فیصلہ میرے حق میں بہتر ہے، چاہے آج میری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

یاد رکھو،

جو شخص ہر حال میں "الحمدللہ" کہنا سیکھ لیتا ہے،

اللہ اُس کے دل میں ایسا سکون اُتار دیتا ہے جو دنیا کی کوئی دولت، کوئی انسان اور کوئی آسائش نہیں دے سکتی۔ کیونکہ سکون حالات سے نہیں،

اپنے رب پر بھروسہ کرنے سے ملتا ہے۔

پیرس

صبح کا وقت تھا۔

حمزہ اسفند سیاہ رنگ کی گاڑی میں بیٹھا شہر کی مصروف شاہراہوں سے گزرتا ہوا ایک معروف فلمی ادارے کی عمارت کے سامنے آکر رکا۔

آج اُس کی برسوں کی محنت کا پہلا امتحان تھا۔ وہ پُراعتماد قدموں سے عمارت کے اندر داخل ہوا۔ چند رسمی گفتگو اور مختصر آزمائش کے بعد اُسے انتظار گاہ میں بٹھا دیا گیا۔

چند منٹ بعد ایک شخص مسکراتے ہوئے اُس کے سامنے آیا۔

"مسٹر حمزہ اسفند... مبارک ہو۔"

حمزہ نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"ہم نے آپ کو اپنے نئے ڈرامے کے مرکزی کردار کے لیے منتخب کر لیا ہے۔"

چند لمحوں کے لیے جیسے وقت تھم گیا۔ حمزہ کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ لمحہ جس کا اُس نے برسوں سے خواب دیکھا تھا، آخرکار حقیقت بن چکا تھا۔

اُس کا پہلا ڈرامہ، اور اُس میں بھی مرکزی کردار۔

ادارے سے باہر نکلتے ہی اُس نے سب سے پہلے اپنے دوست فینگ کو فون ملایا۔

"کہاں ہو؟"

دوسری طرف سے ہمیشہ کی طرح شوخ آواز آئی۔

"کیوں؟ آج پھر کس مصیبت میں پھنس گئے ہو؟"

حمزہ ہنس پڑا۔

"مصیبت نہیں... خوشخبری ہے۔"

"جلدی بولو، اب تجسس ہو رہا ہے۔"

حمزہ نے گہری سانس لی۔

"مجھے میرا پہلا ڈراما مل گیا ہے... اور میں اُس کا ہیرو ہوں۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر اچانک فینگ زور سے چلایا۔

"کیاااا...؟"

"حمزہ! مجھے معلوم تھا ایک دن تم ضرور کامیاب ہو گے۔"

حمزہ مسکرا دیا۔

"اتنا بھی خوش مت ہو، ابھی تو بس آغاز ہے۔"

فینگ ہنسا۔

"آغاز ہی اگر ہیرو کے کردار سے ہو تو انجام کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا۔"

دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے رہے۔

شام ڈھلے جب حمزہ گھر پہنچا تو گرینی ہمیشہ کی طرح دروازے پر اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔ جیسے ہی حمزہ اندر داخل ہوا، اُس نے بچوں کی طرح خوشی سے گرینی کو گلے لگا لیا۔ گرینی حیران رہ گئیں۔

"ارے... آج کیا بات ہے؟"

حمزہ کی آنکھوں میں برسوں بعد سچی خوشی جھلک رہی تھی۔

"گرینی... مجھے میرا پہلا ڈراما مل گیا ہے۔"

"اور"

وہ مسکراتے ہوئے بولا،

"میں اُس کا ہیرو ہوں۔"

گرینی کی آنکھیں خوشی سے نم ہو گئیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا،

"خدا تمہیں ہر کامیابی عطا کرے، میرے بچے۔"

حمزہ نے اُن کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"آج اگر کوئی میری خوشی کو سب سے زیادہ سمجھ سکتا ہے... تو وہ آپ ہیں۔"

چند لمحوں بعد اچانک اُسے اپنے والد کا خیال آیا۔

"انہیں بھی بتانا چاہیے... شاید آج وہ خوش ہوں۔"

اُس نے فوراً موبائل نکالا اور اپنے والد، اسفند صاحب، کا نمبر ملایا۔

رِنگ۔۔۔

مگر اگلے ہی لمحے اسکرین پر ایک ہی جملہ نمودار ہوا۔

کالر ناٹ آنسر نگ!

حمزہ نے دوبارہ کوشش کی۔

پھر وہی جواب۔

تیسری بار،

چوتھی بار،

مگر ہر مرتبہ وہی۔ حمزہ نے آہستہ سے موبائل نیچے کر لیا۔ چہرے پر پھیلی خوشی دھیرے دھیرے ماند پڑنے لگی۔ وہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ آہستہ سے بولا لگتا ہے..."کاروبار آج بھی اپنے بیٹے کی خوشی سے زیادہ ضروری ہے۔" گرینی خاموشی سے اُسے دیکھتی رہیں۔

وہ جانتی تھیں، حمزہ کو کامیابی کی خوشی سے زیادہ، آج اپنے والد کے ایک جملے کی ضرورت تھی۔

صرف ایک جملہ،

"مجھے تم پر فخر ہے، بیٹا۔"

مگر بعض اوقات، یہ چند لفظ بھی دنیا کی سب سے مہنگی دولت بن جاتے ہیں۔

حمزہ اسفند کی زندگی اب ایک نئی رفتار اختیار کر چکی تھی۔

ڈرامے کی عکس بندی، مکالموں کی مشق، نئے لوگوں سے ملاقاتیں، تصویری نشستیں اور مسلسل مصروفیات، صبح کب شام میں بدل جاتی، اور شام کب رات بن جاتی، اُسے خود بھی احساس نہ ہوتا۔

وہ اپنے خواب کے مزید قریب جا رہا تھا۔

مگر اپنے رب سے اب بھی اتنا ہی دور تھا۔

دوسری طرف،

لاہور

حذیفہ آخر کار لاہور پہنچ چکا تھا۔ خالہ شاہینہ نے دروازہ کھولتے ہی اُسے سینے سے لگا لیا۔

"میرا بچہ آ گیا"

"السلام علیکم! خالہ!"

"وعلیکم السلام، جیتے رہو۔"

چند ہی لمحوں میں گھر کا ماحول ہنسی مذاق سے بھر گیا۔ مگر ریان ابھی کال سینٹر میں اپنی ڈیوٹی پر تھا۔

حذیفہ نے صوفے پر بیٹھتے ہی موبائل نکالا اور ریان کو واٹس ایپ پر میسج کیا۔

"کہاں مر گیا ہے؟"

چند لمحے گزر گئے، میسج دیکھا ہی نہیں گیا۔ حذیفہ نے پھر میسج کیا،

"اوئے، زندہ ہے یا نہیں؟"

پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔

حذیفہ نے مصنوعی غصے سے کہا،

"اچھا جی... اب فون کرتا ہوں۔" اُس نے فوراً ریان کا نمبر ملا دیا۔

ادھر ریان ایک کلائنٹ سے بات ختم کر ہی رہا تھا کہ فون بج اٹھا۔ وقفہ ملتے ہی اُس نے کال اُٹھائی۔

"السلام علیکم!"

دوسری طرف سے حذیفہ کی آواز گونجی۔

"وعلیکم السلام... اوئے یار! میں تجھے کب سے واٹس ایپ پر میسج کر رہا ہوں، دیکھ کیوں نہیں رہا؟"

ریان نے ہنستے ہوئے کہا،

"بھائی، دفتر میں ہوں۔"

حذیفہ فوراً بولا،

"ہاں ہاں... لگتا ہے بھابھی وابھی کا چکر ہے، اسی لیے میسج دیکھنے کی فرصت نہیں۔"

ریان نے ماتھا پکڑ لیا۔

"خبیث! دو نمبر انسان! میں دفتر کام کرنے آتا ہوں، تیری فضول باتیں سننے نہیں۔"

حذیفہ زور سے ہنس پڑا۔

"اچھا جی... مان لیا۔"

ریان نے پوچھا،

"ویسے آج اتنی یاد کیسے آگئی؟"

حذیفہ شرارت سے بولا،

"بس ایسے ہی... شام کو جلدی گھر آجانا۔"

"کیوں؟"

"سرپرائز ہے۔" ریان نے ہنستے ہوئے کہا،

"اللہ خیر کرے، تیرے سرپرائز سے ہمیشہ ڈر ہی لگتا ہے۔"

"زیادہ سوال نہ کر، بس جلدی آجانا۔"

"اچھا، اب فون رکھ... سپروائزر گھور رہا ہے۔"

"جا جا... کام کر، بڑے آئے ایماندار ملازم"

دونوں ہنستے ہوئے فون بند کر دیتے ہیں۔

شام ڈھلنے کے بعد ریان اپنی موٹر سائیکل پر گھر پہنچا۔

جیسے ہی اُس نے دروازہ کھولا، اگلے ہی لمحے اُس کی نظریں صوفے پر بیٹھے ایک شناسا چہرے پر جا ٹھہریں۔

"حذیفہ...؟"

حذیفہ فوراً کھڑا ہوا۔

"سرپرائز"

ریان کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اوئے پاگل! تو نے بتایا کیوں نہیں کہ لاہور پہنچ گیا ہے؟"

"اگر بتا دیتا تو سرپرائز کیسے رہتا؟"

اگلے ہی لمحے دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

کئی مہینوں بعد ملنے والے دو دوست، جن کا رشتہ صرف خالہ زاد بھائیوں کا نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی زندگی کا سب سے خوبصورت سہارا بھی تھا۔

شاہینہ دروازے پر کھڑی دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

اُن کے چہرے پر ایک پُرسکون مسکراہٹ تھی۔

کیونکہ بعض رشتے،

خون سے نہیں،

محبت سے زندہ رہتے ہیں۔

اس رات گھر کا ماحول کئی دنوں بعد پہلے سے بھی زیادہ خوشگوار تھا۔ شاہینہ نے اپنے دونوں بچوں کے لیے محبت سے کھانا لگایا۔

حذیفہ ایک نوالہ کھاتا اور دوسرا ریان کی پلیٹ میں ڈال دیتا۔

ریان نے گھورتے ہوئے کہا،

"اوئے! اپنی پلیٹ میں کھا، میری پلیٹ کو یتیم خانہ کیوں بنا رکھا ہے؟"

حذیفہ ہنس پڑا۔

"خالہ! دیکھیں نا، دوستی بھی نہیں نبھاتا۔"

شاہینہ مسکراتے ہوئے بولیں،

"تم دونوں کبھی بڑے بھی ہو گے یا نہیں؟"

دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا، "نہیں"

یہ سن کر شاہینہ بے اختیار ہنس پڑیں۔

کھانا کھانے کے بعد دونوں نے موٹر سائیکل نکالی اور لاہور کی ٹھنڈی شام میں نکل پڑے۔

کبھی مال روڈ کی روشنیاں،

کبھی چائے کے ڈھابے،

کبھی بچپن کی یادیں،

اور کبھی ایک دوسرے کی ٹانگ کھنچائی۔

جس طرف بھی جاتے، دونوں کی ہنسی رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

کافی دیر گھومنے پھرنے کے بعد جب وہ واپس گھر پہنچے تو رات کافی ہو چکی تھی۔

شاہینہ نے پہلے ہی کمرے میں بستر بچھا دیا تھا۔

ریان نے اندر آتے ہی کہا،

"چل جناب، سو جائیں۔"

حذیفہ نے بستر کو دیکھا، پھر ریان کو دیکھا اور حیران ہو کر بولا،

"ایک ہی بستر؟"

"ہاں، تو کیا ہوا؟"

حذیفہ نے فوراً دونوں ہاتھ اوپر کیے۔

"نہیں خالہ! میری عزت کو خطرہ ہے۔"

ریان ہنسی روکنے لگا۔

حذیفہ پوری سنجیدگی سے بولا،

"کل کو اگر میری عزت چلی گئی تو میں لوگوں کو منہ کیسے دکھاؤں گا؟"

شاہینہ زور سے ہنس پڑیں۔

"ارے شرارتی! تم دونوں بچپن سے ایک ہی بستر پر سوتے آئے ہو۔"

حذیفہ نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا،

"وہ بچپن تھا، خالہ! اب حالات بدل گئے ہیں۔"

ریان نے فوراً تکیہ اٹھا کر اُس کی طرف پھینکا۔

"چپ کر، ڈرامے باز"

پھر جان بوجھ کر ناراض ہونے کا ڈراما کرتے ہوئے بولا،

"اچھا... ایسی بات ہے تو میں باہر صحن میں جا کر سو جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

حذیفہ فوراً اُس کے پیچھے بھاگا۔

"ارے یار! ناراض کیوں ہو گیا؟"

"مزاق تھا... صرف مزاق"

ریان نے مڑ کر اُسے دیکھا۔

"پکا؟"

"قسم سے"

"اب آجا، اتنا بھی دل پر نہ لیا کر۔"

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔

شاہینہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا،

"اللہ جانے تم دونوں کب سمجھدار ہو گے۔"

حذیفہ فوراً بولا،

"خالہ! سمجھدار لوگ اتنا نہیں ہنستے۔"

یہ سن کر ایک بار پھر پورا گھر قہقہوں سے گونج اٹھا۔

اگلی صبح،

شاہینہ نے دونوں کو ناشتے کے لیے جگایا۔

ناشتہ کرنے کے بعد ریان کال سینٹر میں اپنی ملازمت کے لیے روانہ ہو گیا۔ جبکہ حذیفہ بھی اپنی فائل اٹھا کر آئی ایس ایس بی کی تیاری کے لیے قریبی تربیتی ادارے کی طرف نکل گیا۔

دونوں کی منزلیں الگ تھیں، مگر خواب ایک جیسے تھے ،اپنی ماں اور اپنے گھر کا نام روشن کرنا۔

وقت اپنی رفتار سے گزر تا رہا۔

پل، دنوں میں،

اور دن، مہینوں میں بدل گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے حذیفہ کو آئی ایس ایس بی کی تیاری کرتے ہوئے ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ صبح سویرے تربیتی ادارہ، دوپہر کو جسمانی مشقیں، شام کو تحریری تیاری اور رات گئے تک مطالعہ... اُس کی پوری زندگی اب صرف ایک خواب کے گرد گھوم رہی تھی۔

وہ جب بھی تھک جاتا تو دل ہی دل میں کہتا،

"یا اللہ! ایک دن میرے بابا کی طرح مجھے بھی اپنے وطن کی خدمت کا موقع عطا فرما۔"

دوسری طرف،

سکردو

ڈاکٹر عنایہ کی زندگی میں بھی ایک بڑا موڑ آنے والا تھا۔ چند روز قبل پیرس کے ایک معروف ہسپتال کی طرف سے اُنہیں نیفرولوجی سرجن کی حیثیت سے ملازمت کی پیشکش موصول ہوئی تھی۔ یہ وہ خواب تھا جس کے لیے انہوں نے برسوں محنت کی تھی۔ بہت سوچ بچار، استخارہ اور والدین کی رضا

کے بعد آخر کار فیصلہ ہو گیا۔ عنایہ ایک ہفتے بعد پیرس روانہ ہونے والی تھیں۔ روانگی سے چند دن پہلے عنایہ کے والدین بھی لاہور آ گئے تاکہ روانگی سے پہلے اپنے سب سے ملاقات کر سکیں۔

ہفتہ گزرنے کو تھا،

خالہ شاہینہ کے گھر آج غیر معمولی رونق تھی۔ کئی مہینوں بعد پورا خاندان ایک ہی چھت تلے جمع ہوا تھا۔ شاہینہ بار بار عنایہ کو گلے لگاتیں۔

"اپنا خیال رکھنا، بیٹی۔"

روبینہ کی آنکھوں میں بھی نمی تھی، مگر وہ بار بار مسکرا کر ماحول کو ہلکا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ریان خاموش بیٹھا سب کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے لیے عنایہ صرف خالہ زاد بہن نہیں تھیں ۔بلکہ ہمیشہ ایک بڑی بہن کی طرح اُس کی رہنمائی کرنے والی شخصیت تھیں،

روانگی کا دن آ پہنچا۔

پورا خاندان

Allama Iqbal International Airport ,Lahore

پہنچا۔

سامان پہلے ہی جمع ہو چکا تھا۔

اب صرف الوداعی لمحات باقی تھے۔ حذیفہ کافی دیر سے خاموش کھڑا تھا۔ عنایہ نے اُس کے قریب آ کر مسکراتے ہوئے کہا،

"کیا ہوا؟ آج اتنے خاموش کیوں ہو؟"

حذیفہ نے نظریں چرا لیں۔

چند لمحوں بعد دھیمی آواز میں بولا،

"ایک بات کہوں...؟"

"ہاں، کہو۔"

اُس نے بمشکل مسکرانے کی کوشش کی۔

"دیکھ لیں، آپی"

"شاید اب پتہ نہیں آپ مجھے دوبارہ کب دیکھیں گی"

وہ چند لمحے رکا، پھر ہلکی سی ہنسی کے پیچھے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے بولا،

"شاید کبھی بھی نہیں۔..."

یہ جملہ سنتے ہی عنایہ کا دل بھر آیا۔

انہوں نے فوراً اپنے چھوٹے بھائی کو مضبوطی سے گلے لگالیا۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے، حذیفہ۔"

"فاصلے محبت کو کم نہیں کرتے۔"

"اور پھر... ویڈیو کال نام کی بھی ایک چیز ہوتی ہے۔"

حذیفہ نے ہنسنے کی کوشش کی، مگر آنکھوں سے ایک آنسو بہہ ہی گیا۔

ریان خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

اُس نے آگے بڑھ کر عنایہ سے کہا،

"اپنا بہت خیال رکھیے گا، آپی۔"

عنایہ نے شفقت سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم بھی اپنی امی کا خیال رکھنا... اور حذیفہ کو پڑھائی سے بھاگنے مت دینا۔"

ریان ہنس پڑا۔

"یہ کام تو دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔"

حذیفہ فوراً بولا،

"میں سب سن رہا ہوں"

چند لمحوں کے لیے سب ہنس دیے،

مگر اُس ہنسی کے پیچھے چھپی اداسی ہر چہرے پر صاف محسوس ہو رہی تھی۔

اعلان ہوا کہ پیرس جانے والی پرواز کے مسافروں سے درخواست ہے کہ روانگی کے دروازے کی طرف تشریف لے جائیں۔

عنایہ نے ایک ایک کر کے سب سے گلے مل کر دعائیں لیں۔

پھر آخری بار مڑ کر اپنے خاندان کو دیکھا،

اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

اُنہیں معلوم نہیں تھا،

یہ سفر صرف ایک نئے ملک کا سفر نہیں،

بلکہ تقدیر کے اُس راستے کی ابتدا تھا،

جہاں بہت جلد اُس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہونے والی تھی، جس کی زندگی کو اللہ نے اُن کے ذریعے بدلنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

چند گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد آخر کار جہاز پیرس کی سرزمین پر اتر چکا تھا،

ڈاکٹر عنایہ نے جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو رات کی روشنیوں میں نہایا ہوا پیرس کسی خواب کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ امی اور بابا کی دعائیں، حذیفہ کی بھیگی آنکھیں اور ریان کی خاموش مسکراہٹ ابھی تک اُن کی یادوں میں تازہ تھیں۔ ایئرپورٹ سے ہسپتال کی جانب سے بھیجی گئی گاڑی اُنہیں اُن کے رہائشی اپارٹمنٹ تک لے گئی۔ لمبے سفر کی تھکن نے اُنہیں نڈھال کر دیا تھا، اس لیے وہ نماز ادا کرنے کے بعد گھر والوں سے بات کر کے پھر جلد ہی آرام کرنے چلی گئیں۔

اگلی صبح ایک نئے ملک، نئے ماحول اور نئی ذمہ داری کے ساتھ اُن کی زندگی کا ایک اور باب شروع ہوا۔ سفید کوٹ زیبِ تن کیے، گلے میں کارڈ آویزاں کیے، چہرہ نقاب سے پوشیدہ اور پُر اعتماد قدموں کے ساتھ وہ پیرس کے اُن بڑے اور جدید ترین ہسپتالوں میں سے ایک

Lariboisière Hospital AP-HP

میں داخل ہوئیں جہاں اب وہ بطور نیفرولوجی سرجن اپنی خدمات انجام دینے والی تھیں۔ ہسپتال اپنی وسعت، جدید مشینوں، مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹروں اور مصروف راہداریوں کی وجہ سے کسی چھوٹے شہر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہر طرف فرانسیسی اور انگریزی زبانیں سنائی دے رہی تھیں۔ اگرچہ زبان کا فرق موجود تھا، مگر عنایہ نے اپنی تعلیم اور تربیت کے دوران مختلف زبانوں میں

طبی اصطلاحات پر خاص مہارت حاصل کر لی تھی۔ مریض سے بات کرنا ہو، کسی سینئر ڈاکٹر سے مشورہ کرنا ہو یا سیریس سرجری کے بارے میں گفتگو، وہ ہر مرحلے پر اعتماد اور وقار کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھاتی رہیں۔ پہلے ہی دن اُن کی پیشہ ورانہ صلاحیت اور پُر سکون انداز نے بہت سے ساتھی ڈاکٹروں کو متاثر کر دیا۔

دوسری طرف، پیرس کے ہی ایک اور حصے میں حمزہ اسفند کی زندگی بالکل مختلف سمت میں دوڑ رہی تھی۔ اُس کا پہلا ڈراما نشر ہو چکا تھا، اور حیرت انگیز طور پر چند ہی اقساط میں اُس کا نام شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا تھا۔ سوشل میڈیا پر اُس کی تصاویر گردش کر رہی تھیں، مداح اُس کے ایک دیدار کے لیے بے تاب رہتے تھے، فلمی اداروں کی نظریں اُس پر تھیں اور ہر روز نئی پیشکشیں اُس کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔ بظاہر اُس کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کا لوگ خواب دیکھتے ہیں، دولت، شہرت، خوبصورتی اور کامیابی۔

مگر انسان کی سب سے بڑی محرومی ہمیشہ وہ نہیں ہوتی جو دنیا دیکھتی ہے،

بلکہ وہ ہوتی ہے جو صرف اُس کا دل جانتا ہے۔

شہرت نے حمزہ کو مشہور تو کر دیا تھا، مگر مطمئن نہیں۔

دولت نے اُسے آسائشیں تو دے دیں، مگر سکون نہیں۔

اور دین،

وہ اب بھی اُس کی زندگی سے اتنا ہی دور تھا جتنا برسوں پہلے تھا۔

نماز اُس کی ترجیحات میں شامل نہیں تھی،

قرآن اُس کی زندگی کا حصہ نہیں تھا،

حلال و حرام کا شعور ابھی تک اُس کے دل میں جگہ نہیں بنا سکا تھا۔

اور شاید اُس کے دل کا سب سے بڑا خلا وہ رشتہ تھا جو دو برس گزر جانے کے باوجود اپنے والد سے قائم نہ ہو سکا۔

اسفند صاحب کاروباری مصروفیات میں ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرتے رہے، مگر اپنے اکلوتے بیٹے سے ملنے کے لیے وقت نہ نکال سکے۔

حمزہ نے بھی آہستہ آہستہ انتظار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

کبھی کبھی انسان شکایت کرنا بھی چھوڑ دیتا ہے،

کیونکہ اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ سامنے والا کبھی سننے والا ہی نہیں۔

چند دن اسی طرح گزر گئے۔

حمزہ اسفند کی زندگی میں شہرت بڑھتی جا رہی تھی، مگر اُس کی عادتیں ویسی ہی تھیں۔ دن شوٹنگ میں گزرتا، رات محفلوں میں، اور زندگی ایک ایسے دائرے میں گھوم رہی تھی جس کا نہ کوئی مقصد دکھائی دیتا تھا، نہ کوئی منزل۔

اُس دن حمزہ گھر پر ہی موجود تھا۔ شوٹنگ سے چھٹی تھی، اس لیے وہ بیٹھک میں صوفے پر بیٹھے اپنے موبائل پر مداحوں کے پیغامات دیکھ رہا تھا، جبکہ گرینی باورچی خانے میں اُس کی پسند کا کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔

اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔

گرینی نے دروازہ کھولا۔

دروازے کے باہر جمی کھڑی تھی۔

وہی چہرے پر اُداسی،

اور وہی دل میں برسوں کے شکوے۔

"کیا حمزہ گھر پر ہے؟"

گرینی نے خاموشی سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

حمزہ نے جیسے ہی جمی کو دیکھا، اُس کے چہرے پر نہ حیرت آئی، نہ خوشی۔

بس ایک بے حس سی نظر،

جیسے سامنے کوئی اجنبی کھڑا ہو۔

جمی اُس کے قریب آئی۔

"آخر تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے تھے، حمزہ؟"

حمزہ نے بغیر کسی تاثر کے جواب دیا،

"یہ سوال تم پہلے بھی کئی بار پوچھ چکی ہو۔"

جمی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"میں نے تم سے سچی محبت کی تھی۔"

حمزہ ہلکا سا مسکرایا، مگر اُس مسکراہٹ میں احساس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

"اور میں نے کبھی تم سے محبت کا وعدہ نہیں کیا تھا۔"

"تم نے میری پوری دنیا اجاڑ دی۔"

"اگر تمہاری دنیا صرف مجھ پر قائم تھی...تو یہ میری غلطی نہیں۔"

جمی نے نم آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

" کبھی تو تمہیں احساس ہو گا کہ تم نے کتنے دل توڑے ہیں۔"

حمزہ نے میز سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے صرف اتنا کہا،

"احساس"

"یہ لفظ میری لغت میں بہت پہلے مر چکا ہے۔"

دروازہ بند ہوا،

اور جمی وہیں کھڑی رہ گئی۔

گرینی نے اُس کی آنکھوں میں ٹوٹن دیکھی، مگر وہ جانتی تھیں کہ حمزہ کے دل کے دروازے بھی اب تقریباً بند ہو چکے ہیں۔

زندگی نے اُسے اتنا سخت بنا دیا تھا کہ وہ دوسروں کے آنسو دیکھ تو سکتا تھا،

مگر محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

وہ ایک سائیکوپاتھ انسان بن چکا تھا!

THE PHYSCO PATH THEORY

سائیکوپاتھ تھیوری یہ کہتی ہے،"سب سے خوف چہرے وہ نہیں ہوتے جو اندھیرے میں چھپے ہو، بلکہ وہ ہوتے ہیں جو دن کی روشنی میں تمھارے سامنے مسکراتے ہیں۔ ایسے لوگ دکھنے میں عام انسان لگتے ہیں، مگر اِن کے اندر ہمدردی، پچھتاوا اور احساسِ جرم کی وہ چنگاری نہیں ہوتی جو اِنسان کو اِنسان بناتی ہے، اِن کے دِل دھڑکتے ہیں مگر کئی بار جذبات خاموش رہتے ہیں، یہی وجہ ہے ہم کبھی یقین سے نہیں جان سکتے اِن کے چہرے کے پیچھے کیا چھپا ہے۔"

شام ڈھلی تو فینگ کا فون آ گیا۔

"آجاؤ، سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

حمزہ نے بغیر کچھ پوچھے گاڑی اموڑی اور شہر کے ایک پُر تعیش ہوٹل پہنچ گیا۔

حسبِ معمول میز پر شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں، بلند موسیقی گونج رہی تھی اور آس پاس بے فکری کا مصنوعی شور تھا۔

حمزہ نے ایک کے بعد ایک گلاس پینا شروع کر دیا۔

فینگ نے ہنستے ہوئے کہا،

"آج تو لگتا ہے ساری بوتل اکیلے ختم کرنے کا ارادہ ہے۔"

حمزہ نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا،

"کچھ چیزیں جتنی زیادہ پیو... اتنی ہی کم محسوس ہوتی ہیں۔"

رات گہری ہوتی گئی،

اور نشہ بڑھتا گیا۔

آخرکار فینگ نے حسبِ معمول ڈرائیور کو فون کیا اور حمزہ کو اُس کے اپارٹمنٹ بھجوا دیا۔

گرینی دروازے پر کھڑی اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔

جیسے ہی دروازہ کھلا، شراب کی تیز بو پورے کمرے میں پھیل گئی۔

انہوں نے سہارا دے کر حمزہ کو اندر بٹھایا۔ اُن کی آنکھوں میں فکر صاف جھلک رہی تھی۔

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دھیرے سے بولیں،

"حمزہ... میں آج کل اسلام کے بارے میں پڑھ رہی ہوں۔"

حمزہ نے نیم غنودہ حالت میں اُن کی طرف دیکھا۔

گرینی نے نرم لہجے میں کہا،

"اسلام میں شراب حرام ہے۔"

یہ انسان کی عقل کو دھندلا دیتی ہے، اُس کے فیصلوں کو بگاڑ دیتی ہے اور آہستہ آہستہ اُس کی زندگی کو اپنے قبضے میں لے لیتی ہے۔

حمزہ نے آنکھیں بند کیے ہلکی سی ہنسی ہنسی۔

"گرینی"

"پھر وہی اسلام"

"جی ہاں، پھر وہی اسلام۔"

انہوں نے محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ ایک دن تم اُس راستے کو پہچان لو...جو تمہیں حقیقی سکون دے سکتا ہے۔"

حمزہ نے آہستہ سے نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔

اُسے آج بھی یقین تھا،

سکون بوتل کے آخری قطرے میں مل جائے گا۔

جبکہ گرینی جان چکی تھیں،

سکون کبھی شراب کے میں نہیں ملتا،

سکون ہمیشہ اپنے رب کی طرف لوٹنے میں ملتا ہے۔

جانتے ہو...؟

شیطان انسان کو ایک ہی دن میں گناہ گار نہیں بناتا۔ وہ آہستہ آہستہ انسان کے دل سے گناہ کی برائی ختم کرتا ہے، پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ گناہ، گناہ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ آج اگر کوئی نوجوان شراب پیتا ہے، یا نا محرم تعلقات کو "محبت" کا نام دیتا ہے تو یہ سب ایک دن میں نہیں ہوتا، یہ اُس دن شروع ہوتا ہے جب انسان قرآن کو بند کر دیتا ہے، نماز کو مؤخر کرتا رہتا ہے، اور اپنے نفس کی ہر خواہش کو آزادی دے دیتا ہے۔ پھر دل پر گناہوں کی ایسی تہہ جمتی جاتی ہے کہ حق بات بھی بوجھ لگنے لگتی ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتے ہیں:

﴿کَلَّا بَلۡ ٜ رَانَ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ﴾

"ترجمہ:* "ہر گز نہیں! بلکہ اُن کے اعمال نے اُن کے دلوں پر زنگ چڑھادیا ہے۔"

(سورۃ المطففین: 14)

یاد رکھو۔۔۔

شراب صرف بوتل میں موجود ایک مائع نہیں،

یہ انسان کی غیرت، عقل، حیا اور فیصلے کی صلاحیت کو آہستہ آہستہ چھین لیتی ہے۔

اور نامحرم سے ناجائز تعلق صرف ایک گناہ نہیں،

یہ دل کو اُس محبت کا عادی بنا دیتا ہے جس کی بنیاد اللہ کی رضا پر نہیں ہوتی۔

پھر انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ آزاد ہے،

حالانکہ حقیقت میں وہ اپنی خواہشات کا قیدی بن چکا ہوتا ہے۔

سب سے خطرناک لمحہ وہ نہیں جب انسان گناہ کرتا ہے،

بلکہ وہ ہوتا ہے جب گناہ کرنے کے بعد اُس کے دل میں ندامت بھی باقی نہ رہے۔

کیونکہ جس دل سے توبہ کی تڑپ ختم ہو جائے،

اُس دل کو سب سے زیادہ اپنے رب کی طرف لوٹنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسری طرف لاہور،

زندگی اپنے معمول کے مطابق رواں تھی۔ ریان کو کال سینٹر میں کام کرتے ہوئے اب کافی وقت گزر چکا تھا۔ ابتدا کی گھبراہٹ اب اعتماد میں بدل چکی تھی۔ اُس کے نرم لہجے، صبر اور خوش اخلاقی کی وجہ سے اکثر گاہک مطمئن ہو کر کال ختم کرتے۔ دفتر کے سینئر افسر بھی اُس کی ذمہ داری اور وقت کی پابندی سے متاثر تھے۔ وہ نہ غیر ضروری باتوں میں وقت ضائع کرتا تھا، نہ کسی لڑکی سے بلاوجہ گفتگو کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس کا مقصد صرف اپنی ماں کے چہرے پر سکون دیکھنا اور اپنی محنت سے حلال رزق کمانا تھا۔

نور منہاج حسبِ معمول اپنی نشست پر بیٹھی کام میں مصروف تھی۔ اگرچہ اُس نے پہلے دن ہی ریان کے بارے میں اپنی ایک رائے قائم کرلی تھی، مگر روزانہ اُسے خاموشی سے کام کرتے دیکھ کر اُس کے ذہن میں کئی سوال جنم لینے لگے تھے۔ وہ اکثر محسوس کرتی کہ دفتر کے دوسرے لڑکے موقع ملتے ہی لڑکیوں سے بات کرنے کی کوشش کرتے، مگر ریان نے آج تک نہ اُس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی، نہ فضول مذاق کیا اور نہ ہی اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ ایک دن ایک کلائینٹ نے فون پر نور سے انتہائی سخت لہجے میں گفتگو شروع کر دی۔ نور اپنی پوری کوشش کے باوجود اُس شخص کو مطمئن نہ کر سکی۔ ریان نے اپنی نشست سے یہ سب دیکھا تو خاموشی سے سپروائزر سے اجازت لے کر کال اپنے پاس منتقل کرلی۔ اُس نے نہایت تحمل اور احترام سے چند منٹ گفتگو کی، مسئلہ حل کیا اور کال ختم ہونے کے بعد بغیر کسی تعریف یا احساسِ برتری کے صرف اتنا کہا، "الحمدللہ... مسئلہ حل ہو گیا۔" پھر وہ دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ کر کام میں مصروف ہو گیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

نور چند لمحے اُسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ اُس کے ذہن میں بے اختیار خیال آیا، "شاید... میں نے اس لڑکے کو پہلی نظر میں غلط سمجھ لیا تھا۔ ہر مرد ایک جیسا نہیں ہوتا۔" مگر اگلے ہی لمحے اُس نے یہ سوچ جھٹک دی اور دل ہی دل میں خود سے کہا، "نہیں نور... اتنی جلدی کسی پر بھروسہ کرنا عقلمندی نہیں۔ وقت ہی انسان کی اصل پہچان کرواتا ہے۔"

دوسری طرف پیرس،

ڈاکٹر عنایہ بھی اپنی ذمہ داریوں میں پوری طرح مصروف ہو چکی تھیں۔ اُن کی قابلیت، تحمل اور مریضوں کے ساتھ نرم رویے نے چند ہی ہفتوں میں ہسپتال کے سینئر ڈاکٹروں کو متاثر کر دیا تھا۔ ایک روز گردے کے ایک نہایت پیچیدہ مریض کی سرجری کئی گھنٹوں تک جاری رہی۔ پورا طبی عملہ شدید دباؤ میں تھا، مگر عنایہ نے نہایت اطمینان اور مہارت سے اپنی ذمہ داری ادا کی۔ جب سرجری کامیاب ہوئی تو پورے آپریشن تھیٹر میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ ایک سینئر ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا، ڈاکٹر عنایہ، آپ نے آج کمال کر دیا۔" عنایہ نے عاجزی سے سر جھکا کر صرف اتنا کہا، "الحمدللہ... یہ اللہ کا فضل ہے۔"

اُسی دن قسمت ایک عجیب منظر لکھ رہی تھی۔ شہر کے دوسرے حصے سے حمزہ اسفند اپنی نئی ڈرامائی عکس بندی کے لیے اسی ہسپتال پہنچا۔ ایک منظر کی عکس بندی ہسپتال کی راہداری میں ہونا تھی۔ فلمی عملہ، کیمرے اور روشنیاں ہر طرف موجود تھیں۔ دوسری جانب عنایہ ایک مریض کی رپورٹ ہاتھ میں لیے تیزی سے راہداری سے گزر رہی تھیں۔ دونوں ایک ہی عمارت میں موجود تھے... دونوں کے درمیان صرف چند راہداریاں تھیں... مگر اُن کی نظریں ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ تقدیر نے اُنہیں ایک ہی جگہ تو پہنچا دیا تھا، مگر ملاقات کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔

دوسری طرف

... Lahore

ریان کی زندگی بھی آہستہ آہستہ سنورنے لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی ملازمت کو ایک مہینہ مکمل ہو چکا تھا، اور آج اُس کی پہلی تنخواہ اُس کے بینک کھاتے میں منتقل ہوئی تھی۔

پچاس ہزار روپے...

رقم شاید بہت زیادہ نہیں تھی، مگر ایک محنت کش بیٹے کے لیے یہ صرف نوٹ نہیں تھے، بلکہ اُس کی پہلی کمائی، اُس کی ماں کی دعاؤں اور اُس کی محنت کا پہلا پھل تھے۔ تنخواہ کا پیغام موبائل پر آتے ہی ریان بے اختیار مسکرا دیا اور سب سے پہلے اُس نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

شام کو دفتر سے فارغ ہوتے ہی اُس نے حذیفہ کو فون کیا۔ "پانچ منٹ میں گھر کے باہر آ جا، آج تجھے دعوت دینی ہے۔" دوسری طرف سے حذیفہ فوراً بولا، "لگتا ہے تنخواہ آ گئی ہے، ورنہ تیرے جیسے کنجوس کے منہ سے دعوت کا لفظ نہیں نکلتا۔" ریان ہنس پڑا۔ "زیادہ خوش نہ ہو، بس جلدی آ جا۔" چند ہی منٹ بعد دونوں موٹر سائیکل پر لاہور کی سڑکوں پر تھے۔ راستے بھر حذیفہ ریان کی ٹانگ کھینچتا رہا اور ریان اُسے خاموش کرانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد ریان ایک خوبصورت اور مہنگے سے ریستوران کے سامنے موٹر سائیکل روک کر بولا، "آج پہلی تنخواہ ہے، اس لیے سوچا تجھے اچھی جگہ کھانا کھلاؤں۔" دونوں اندر جا کر بیٹھ گئے۔ ویٹر نے آ کر کھانے کی فہرست اُن کے سامنے رکھ دی۔ حذیفہ نے جیسے ہی قیمتوں پر نظر ڈالی، اُس کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی۔ ایک ڈش کی قیمت دیکھ کر اُس نے دل ہی دل میں حساب لگایا کہ اس

رقم سے تو گھر کا کئی دن کا راشن آ سکتا ہے۔ اُس نے چوری سے ریان کی طرف دیکھا، جو خوشی خوشی کھانے کا انتخاب کر رہا تھا۔ حذیفہ کے دل میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ ریان نے یہ پیسے کتنی محنت سے کمائے ہیں، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی پہلی تنخواہ کا بڑا حصہ صرف ایک کھانے پر خرچ ہو جائے۔

اُس نے اچانک فہرست بند کی اور مصنوعی سنجیدگی سے بولا، "یار... مجھے یہاں کا کھانا پسند نہیں آیا۔

ریان نے حیران ہو کر پوچھا، "ابھی تو تُو نے کھانا دیکھا بھی نہیں، صرف قیمتیں دیکھی ہیں۔"

حذیفہ نے فوراً نظریں چرا لیں۔ "نہیں... میرا دل نہیں کر رہا۔"

"تو پھر کیا کھائے گا؟"

حذیفہ کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ آ گئی۔

"چل نا... باہر چلتے ہیں۔ مجھے آج گول گپے، چنے چاٹ اور آلو سموسے کھانے کا بہت دل کر رہا ہے۔"

ریان نے آنکھیں سکیڑ کر اُسے دیکھا۔

"سچ سچ بتا... بات کیا ہے؟"

حذیفہ نے ہنستے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"یار! شاہی کھانے روز تھوڑی کھائے جاتے ہیں، اصل مزہ تو ٹھیلے والے کے کھانے میں ہے۔"

ریان چند لمحے خاموش رہا، پھر اُسے سب سمجھ آ گیا۔

اُس نے مسکراتے ہوئے حذیفہ کے کندھے پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"پاگل آدمی... تُو میرے پیسوں کا سوچ رہا ہے نا؟"

حذیفہ نے نظریں جھکا کر آہستہ سے کہا،

یہ تیری پہلی کمائی ہے، ریان... میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے اس کا بڑا حصہ ایک ہی رات میں خرچ ہو جائے۔

ریان کی آنکھوں میں بے اختیار اپنائیت اتر آئی۔

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا،

پیسے دوبارہ آجائیں گے... مگر پہلی تنخواہ کی خوشی اپنے سب سے اچھے دوست کے ساتھ بار بار نہیں ملتی۔

حذیفہ نے فوراً جواب دیا،

اور میرے لیے تیرا ساتھ فائیو سٹار ہوٹل سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اب چل... ٹھیلے والے کی چٹ پٹی چاٹ کھلاتا ہے یا میں خالہ کو بتاؤں کہ صاحب پہلی تنخواہ پر فضول خرچی کر رہے تھے؟

ریان زور سے ہنس پڑا۔

"چل، آج پھر تیرے ہی نام رہی۔"

دونوں ریستوران سے باہر نکلے، موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور لاہور کی سڑکوں پر لگے ایک پرانے ٹھیلے کے سامنے جا کر رک گئے، جہاں سادہ سا کھانا تھا... مگر اُن کی دوستی کی طرح خالص، بے ریا اور دل سے بھرپور۔

Paris

پیرس کی صبح ہمیشہ کی طرح مصروف تھی۔ سڑکوں پر گاڑیوں کا شور، بلند و بالا عمارتوں کے درمیان دوڑتی ہوئی زندگی اور ہر شخص اپنے مقصد کی تلاش میں رواں دواں تھا۔

ڈاکٹر عنایہ حسبِ معمول وقت سے پہلے ہسپتال پہنچ چکی تھیں۔ سفید کوٹ، گلے میں کارڈ اور چہرے پر سنجیدگی... وہ اپنے شعبۂ گردہ و کلیہ کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ اچانک ہسپتال کے مرکزی دروازے پر غیر معمولی ہلچل مچ گئی۔ چند لمحوں میں کیمرے، روشنیاں اور فلمی عملے کے افراد ہسپتال کے صحن میں نظر آنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ایک مشہور ڈرامے کا مختصر منظر اسی ہسپتال میں عکس بند کیا جانا تھا۔

اُدھر حمزہ اسفند بھی اپنے مخصوص انداز میں سیاہ لباس، سیاہ چشمہ اور پُراعتماد چال کے ساتھ فلمی عملے کے درمیان ہسپتال میں داخل ہوا۔ اب وہ پیرس کی فلمی صنعت کا ایک ابھرتا ہوا نام بن چکا تھا۔ جہاں بھی جاتا، لوگ اُسے دیکھنے کے لیے رک جاتے۔ کسی کے ہاتھ میں موبائل تھا تو کوئی اُس کے ساتھ تصویر بنوانے کی خواہش رکھتا تھا۔ حمزہ ہمیشہ کی طرح سب کے درمیان موجود تھا، مگر پھر بھی تنہا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور تھی، لیکن اُس مسکراہٹ کے پیچھے چھپا خالی پن کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ڈرامے کے ایک منظر کی عکس بندی شروع ہوئی۔ منظر کے مطابق حمزہ کو تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے دوڑنا تھا، مگر دوڑتے ہوئے اُس کا توازن اچانک بگڑ گیا۔ وہ سیڑھی کے کنارے سے ٹکرایا اور اُس کے بازو پر گہرا زخم آ گیا۔ اگرچہ چوٹ زیادہ خطرناک نہیں تھی، لیکن خون بہنے لگا۔ فلمی عملے نے فوراً عکس بندی روک دی اور اُسے ہسپتال کے ایمرجنسی شعبے کی طرف لے گئے تاکہ ابتدائی علاج کیا جا سکے۔

اسی دوران ڈاکٹر عنایہ ایک مریض کی رپورٹ ہاتھ میں لیے راہداری سے گزر رہی تھیں۔ شور سن کر اُنھوں نے بے اختیار اُس طرف دیکھا۔ اُن کی نظر چند لمحوں کے لیے زخمی نوجوان پر پڑی، جس کے گرد کئی لوگ جمع تھے۔ وہ صرف اتنا دیکھ سکیں کہ ایک لمبا قد، سیاہ لباس اور چہرے پر عجیب سی بے حسی لیے ایک نوجوان علاج کے لیے اندر لے جایا جا رہا ہے۔ اُن کے قدم ایک لمحے کو رکے، مگر اگلے ہی لمحے اُنہیں ایک نرس نے دوسرے مریض کے لیے آواز دی، اور وہ فوراً اپنی ذمہ داری کی طرف بڑھ گئیں۔

ادھر حمزہ کی پٹی کی جا رہی تھی۔ درد معمولی تھا، مگر اُس کی بے زاری ہمیشہ کی طرح نمایاں تھی۔ اتفاق سے اُس نے بھی ایمرجنسی وارڈ کے شیشے سے باہر گزرتی ہوئی ایک سفید کوٹ میں ملبوس ڈاکٹر کو دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے اُس کی نظریں اُس شخصیت پر ٹھہر گئیں، مگر وہ یہ جانے بغیر دوبارہ دوسری طرف متوجہ ہو گیا کہ وہ کون تھی۔

تقدیر نے اُس دن دونوں کو ایک ہی چھت کے نیچے ضرور جمع کر دیا تھا۔

مگر صرف چند لمحوں کے لیے۔

نہ تعارف ہوا،

نہ گفتگو،

نہ سلام،

بس دو اجنبی ایک دوسرے کے قریب سے گزر گئے، جیسے دو راستے چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے کو چھو کر پھر الگ ہو جائیں۔

بعض ملاقاتیں فوراً نہیں ہوتیں،

وقت پہلے آزماتا ہے، پھر ملواتا ہے۔

چند دن بعد پیرس کی ایک مصروف صبح،

حمزہ اسفند اپنے نئے ڈرامے کی عکس بندی میں مصروف تھا۔ کیمرے چل رہے تھے، ڈائریکٹر بار بار منظر دہرانے کی ہدایت دے رہا تھا اور ہر شخص اپنی ذمہ داری نبھا رہا تھا۔ حمزہ حسبِ معمول پورے اعتماد کے ساتھ مکالمے ادا کر رہا تھا کہ اچانک اُس نے اپنی کمر کے دائیں جانب ایک تیز درد محسوس کیا۔

ابتدا میں اُس نے اسے نظر انداز کیا۔

"صرف پٹھے میں کھنچاؤ ہو گا..." اُس نے خود سے کہا۔

مگر چند ہی لمحوں بعد درد اتنا بڑھ گیا کہ اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اُس نے منظر مکمل کیا مگر جیسے ہی "کٹ" کی آواز آئی، وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

حمزہ! کیا ہوا؟" عملے کے ایک فرد نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں... بس معمولی درد ہے۔"

اُس نے فوراً اپنا موبائل نکالا اور صرف ایک شخص کو فون کیا۔

"فینگ"

"ہاں بھائی؟"

"جلدی آ... مجھے ہسپتال جانا ہے۔"

دوسری طرف فانگ کی آواز فوراً سنجیدہ ہو گئی۔

"پانچ منٹ۔"

واقعی پانچ ہی منٹ بعد ایک بڑی ہیوی بائیک سیٹ کے باہر آکر رکی۔

حمزہ نے جلدی سے فینگ کے سر سے ہیلمٹ اتارا اور خود پہن لیا، اور کہاں جلدی چلو۔

فینگ نے حیران ہو کر پوچھا،

"گاڑی کیوں نہیں لے جا رہے؟"

حمزہ نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا،

"اب لوگ میری گاڑی بھی پہچاننے لگے ہیں۔ اگر میڈیا کو خبر لگ گئی تو کل کی بریکنگ نیوز یہی ہو گی کہ مشہور اداکار ہسپتال پہنچ گیا۔"

فینگ ہنسا۔

"واہ جناب! شہرت بھی عجیب آزمائش ہے۔"

"کم بولو... درد ہو رہا ہے۔"

دونوں تیزی سے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

چند ہی منٹ بعد وہ ہسپتال کے ایمرجنسی شعبے میں موجود تھے۔

حمزہ نے ہیلمٹ اتارنے سے صاف انکار کر دیا۔

استقبالیہ پر موجود نرس نے حیرانی سے پوچھا،

"کیا آپ علاج بھی ہیلمٹ پہن کر کروائیں گے؟"

حمزہ نے مختصر جواب دیا،

"جی۔"

فینگ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

چند لمحوں بعد ایک آواز سنائی دی۔

یہ وہ لمحہ تھا جب گہری سیاہ آنکھیں ہلکی جھیل جیسی سبز آنکھوں سے ٹکرانے والی تھی۔

"مریض کو اندر بھیج دیجیے۔"

یہ ڈاکٹر عنایہ تھیں۔

وہ سفید کوٹ، دستانوں اور نقاب کے ساتھ موجود تھیں۔ صرف اُن کی گہری سیاہ آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

حمزہ اندر آیا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔

عنایہ نے سلپ اٹھائی اور انگریزی میں پوچھا،

" What seems to be the problem?"

حمزہ نے بھی انگریزی میں جواب دیا،

"Severe pain on the right side of my lower back."

عنایہ نے مزید سوال کیے، درد کب شروع ہوا، پہلے بھی ہوا تھا یا نہیں، کون سی دوائیں استعمال کیں۔

فائل دیکھتے ہوئے پوچھا:

"You're taking NSAIDs?"

حمزہ نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"Yes."

"Who prescribed these?"

(حمزہ)"No one."

عنایہ نے پہلی بار سخت لہجہ اختیار کیا۔

"This is not acceptable."

حمزہ نے بے پروائی سے کہا،

"They help."

عنایہ نے سنجیدگی سے جواب دیا،

"They can also harm your kidneys if used carelessly."

حمزہ چند لمحے خاموش رہا، پھر بے اختیار اردو میں بولا،

"اتنی سی بات پر اتنا غصہ؟"

عنایہ کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکے۔

انہوں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"آپ... اردو بول سکتے ہیں؟"

حمزہ ہلکا سا مسکرایا۔

"تھوڑی بہت آتی ہے۔"

"تو پہلے کیوں انگریزی بول رہے تھے؟"

"آپ نے شروع انگریزی میں کیا تھا۔"

عنایہ نے ہلکی سی سانس لی۔

"خیر... اب اردو ہی میں بات کرتے ہیں۔"

انہوں نے دوبارہ فائل کی طرف دیکھا۔

"آپ کئی دنوں سے درد برداشت کر رہے تھے، پھر بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں آئے؟"

"وقت نہیں تھا۔"

"یا پھر لاپرواہی زیادہ تھی؟"

حمزہ خاموش رہا۔

عنایہ نے دوائیوں کی فہرست میز پر رکھتے ہوئے کہا،

یہ جو آپ اپنی مرضی سے درد والی ادویات کھا رہے ہیں، یہ اچھی عادت نہیں۔ ہر درد کو گولی سے دبانا علاج نہیں ہوتا۔

حمزہ نے شرارتی انداز میں کہا،

"آپ ہر مریض کو اتنا ہی ڈانٹتی ہیں؟"

"جو مریض اپنی صحت کے ساتھ کھلواڑ کرے، اُسے ڈانٹنا بھی علاج کا حصہ ہے۔"

فینگ ایک طرف کھڑا بمشکل ہنسی روک رہا تھا۔

حمزہ نے آہستہ سے کہا،

"پہلی ڈاکٹر دیکھی ہے جو سلام سے پہلے ڈانٹتی ہے۔"

عنایہ نے سن لیا۔

اور پہلے ایسے مریض بھی دیکھے ہیں جو اپنی مرضی سے اتنی دوائیں کھا کر پھر کہتے ہیں، کچھ نہیں ہوا۔

فینگ بے اختیار ہنس پڑا۔

"ڈاکٹر صاحبہ! آج پہلی بار کسی نے اس کی بولتی بند کی ہے۔"

حمزہ نے فوراً اُسے گھورا۔

"خاموش رہو۔"

عنایہ نے معائنہ مکمل کیا، ضروری ٹیسٹ لکھے اور مناسب علاج تجویز کیا۔

پھر نہایت سنجیدگی سے بولیں،

"صحت اللہ کی امانت ہے۔ اس کے ساتھ لاپرواہی کرنا درست نہیں۔"

اور اگلی مرتبہ جب آئیں تو یہ ہیلمٹ اتار کر آیئے گا۔

یہ جملہ حمزہ کے دل میں کہیں ہلکا سا اتر گیا، اگرچہ اُس نے چہرے پر کوئی تاثر ظاہر نہ ہونے دیا۔

جب وہ جانے لگا تو ایک لمحے کے لیے دونوں کی نظریں ملیں۔

حمزہ صرف اُن کی سیاہ، پُر سکون آنکھیں دیکھ سکا،

اور عنایہ کو ہیلمٹ کے شیشے کے پیچھے صرف وہ ہلکی سبز آنکھیں نظر آئیں، جو کسی پُر سکون جھیل کی مانند تھیں۔ مگر نجانے کیوں عنایا کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ آنکھیں وہ پہلے کہیں دیکھ چکی تھی۔

کمرے سے باہر نکلتے ہی فینگ نے شرارت سے پوچھا،

"تو جناب! ڈاکٹر صاحبہ کیسی لگیں؟"

حمزہ چند لمحے خاموش رہا، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا:

"بہت ڈانٹتی ہیں"

فینگ ہنسنے لگا۔

"پھر کیا نام رکھ رہے ہو اُن کا؟"

حمزہ نے ایک بار دروازے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا،

"آج سے... ان کا نام 'ڈان'۔"

"کیوں؟"

کیونکہ جیسے ہی سامنے آئیں، حکم بھی وہی دیتی رہیں...ڈانٹ بھی ...اور عجیب بات یہ ہے کہ انسان ان کی بات مان بھی لیتا ہے۔

فینگ نے قہقہہ لگایا۔

"مجھے لگتا ہے، حمزہ اسفند... تمہیں پہلی بار کسی نے صحیح معنی میں خاموش کرایا ہے۔"

حمزہ نے جواب تو نہ دیا،

مگر جاتے جاتے اُس کی سبز آنکھیں ایک بار پھر اسی کمرے کی طرف اٹھ گئیں، جہاں ایک باحیا ڈاکٹر اپنی اگلی مریضہ کی فائل کھول چکی تھی۔

رات کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ حمزہ اسفند حسبِ معمول گرینی کے ساتھ کھانا کھا چکا تھا، مگر آج ایک عجیب سی خاموشی اُس پر طاری تھی۔ گرینی نے کئی بار محسوس کیا کہ وہ کبھی پلیٹ کو دیکھتا، کبھی بے اختیار مسکرا دیتا۔ آخر کار وہ بول ہی پڑیں،

"حمزہ... آج خیر تو ہے؟ کہیں بخار وغیرہ تو نہیں؟"

حمزہ چونک گیا، فوراً پانی کا گلاس اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولا، "گرینی، آپ بھی نا... میں بالکل ٹھیک ہوں۔" گرینی نے شک بھری نظروں سے اُسے دیکھا مگر خاموش رہیں۔

کھانا ختم کر کے حمزہ اپنے کمرے میں آیا۔ دروازہ بند کیا، جیکٹ کرسی پر پھینکی اور سیدھا آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ چند لمحے وہ خود کو دیکھتا رہا، پھر اچانک اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے

دونوں ہاتھ کمر پر رکھے، چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کی اور بالکل ویسی ہی آواز بنانے لگا جیسی آج اُس ڈاکٹر کی تھی۔

"آپ اتنی زیادہ درد والی دوائیں کیوں استعمال کر رہے ہیں؟"

پھر خود ہی اپنی آواز بدل کر بولا،

"ڈاکٹر صاحبہ، درد تھا اس لیے کھالیں۔"

فوراً دوبارہ عنایہ کے انداز میں گردن ذرا سی ٹیڑھی کر کے بولا،

"واہ! پھر تو کل سے پورا ڈبہ ہی کھا لیجیے گا۔"

یہ کہتے ہی وہ خود ہنس پڑا۔

حمزہ نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اوپر کیے۔

"جی ڈاکٹر صاحبہ... آئندہ اجازت لے کر بیمار ہوں گا"

وہ اپنی ہی بات پر اتنا ہنسا کہ خود کو سنبھالنے کے لیے بستر پر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں بعد اُس نے گہری سانس لی اور آہستہ سے مسکراتے ہوئے بولا،

"عجیب لڑکی ہے"

"نہ یہ جانتی ہے میں کون ہوں... نہ اُس نے ایک بار پوچھا۔"

پھر اُس نے مذاق میں خود ہی جواب دیا،

"پوچھتی بھی کیوں؟ اُس کے نزدیک تو میں صرف ایک لاپرواہ مریض تھا۔"

وہ دوبارہ آئینے کے سامنے آیا، اپنی سبز آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا،

"ویسے ڈانٹتی بہت ہے"

چند لمحے خاموشی رہی۔

پھر اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"بس... آج سے تمہارا نام ڈان۔"

"پتہ نہیں اصل نام کیا ہے... مگر ڈانٹنے میں تو واقعی پوری ڈان ہو۔"

یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنس دیا۔

پھر اچانک اُس کے ذہن میں وہ سیاہ، پُرسکون آنکھیں ابھریں جو نقاب کے پیچھے سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

"عجیب بات ہے"

وہ آہستہ سے خود سے بولا۔

میں نے اُس کا چہرہ نہیں دیکھا... اُس نے میرا چہرہ نہیں دیکھا... پھر بھی نہ جانے کیوں اُس کی آنکھیں بار بار یاد آرہی ہیں۔

وہ سر ہلا کر خود ہی اپنی سوچ پر ہنس پڑا۔

"لگتا ہے حمزہ اسفند... تُو واقعی پاگل ہو رہا ہے۔"

اور کمرے میں اُس کی اپنی ہنسی دیر تک گونجتی رہی، جبکہ اُسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اُس کی زندگی کا ایک نیا باب خاموشی سے شروع ہو چکا ہے۔

اگلے دن دوپہر کے وقت حمزہ اسفند کو ءِجمی کا پیغام موصول ہوا۔

براہِ کرم... صرف ایک آخری ملاقات۔ اس کے بعد میں کبھی تمہیں پریشان نہیں کروں گی۔

حمزہ نے چند لمحے پیغام کو خاموشی سے دیکھا، پھر مختصر سا جواب لکھا۔

"ایک گھنٹے بعد۔"

شام ہوتے ہی وہ طے شدہ جگہ پہنچ گیا۔ ءِجمی پہلے سے وہاں موجود تھی۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تھی، مگر شاید آج وہ لڑنے نہیں آئی تھی۔

کافی دیر دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔

آخر کار ءِجمی نے دھیمی آواز میں کہا،

"شاید میں واقعی تمہیں کبھی سمجھ ہی نہیں سکی۔"

حمزہ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا،

"اور شاید میں نے کبھی خود کو کسی کے لیے سمجھانا ضروری ہی نہیں سمجھا۔"

ءِجمی نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔

"میں آج تم سے کوئی شکوہ کرنے نہیں آئی... صرف الوداع کہنے آئی ہوں۔"

حمزہ خاموش رہا۔

جِمی نے اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کیے۔

"امید ہے... ایک دن تمہیں کوئی ایسا انسان ضرور ملے گا... جو تمہارے دل کی خاموشی بھی سن لے۔"

یہ کہہ کر وہ مڑی اور بغیر پیچھے دیکھے وہاں سے چلی گئی۔

حمزہ کافی دیر تک اُسے جاتا ہوا دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

گھر واپس آتے ہوئے نہ جانے کیوں اُس نے اپنی گاڑی سیدھی فینگ کے گھر کے باہر روک دی۔

فینگ باہر نکلا تو حیران ہو کر بولا،

"خیر تو ہے؟"

حمزہ نے گاڑی کی چابی اُس کی طرف اچھال دی۔

"گاڑی یہیں رہنے دو۔"

"اور تم؟"

"آج تمھاری بائیک چاہیے۔"

فینگ نے مسکراتے ہوئے اپنی بائیک اور ہیلمٹ اُس کے حوالے کر دیے۔

"لیکن جانا کہاں ہے؟"

حمزہ نے ہیلمٹ پہنتے ہوئے بے نیازی سے کہا،

"بس... ایک جگہ۔"

فینگ نے شرارتی انداز میں آنکھیں سکیڑیں۔

"کہیں وہی ڈاکٹر تو نہیں؟"

حمزہ ایک لمحے کو رکا، پھر مصنوعی سنجیدگی سے بولا،

"تم وکیل ہو... نجومی نہیں۔"

فیننگ زور سے ہنس پڑا۔

"یعنی نشانہ ٹھیک لگا"

حمزہ نے جواب دینے کے بجائے بائیک اسٹارٹ کی اور وہاں سے نکل گیا۔

چند ہی دیر بعد وہ دوبارہ اُسی ہسپتال کے احاطے میں موجود تھا۔

اس بار نہ اُسے کوئی درد تھا،

نہ کوئی ایمرجنسی۔

وہ بس راہداریوں میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا، جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو اور خود بھی یہ ماننے کو تیار نہ ہو۔

اچانک ایک مانوس آواز سنائی دی۔

"ہیلمٹ والے مریض...ذرا اِدھر آیئے۔"

حمزہ کے قدم وہیں رک گئے۔

وہ مُڑا تو چند فاصلے پر ڈاکٹر عنایہ کھڑی تھیں۔

آج بھی سفید کوٹ، نقاب اور وہی پُر سکون سیاہ آنکھیں۔

حمزہ آہستہ آہستہ اُن کے قریب آ گیا۔

عنایہ نے بازو باندھتے ہوئے کہا،

"آپ پھر آ گئے؟"

حمزہ نے معصوم بننے کی کوشش کی۔

"جی"

عنایہ نے فائل بند کرتے ہوئے کہا،

"امید ہے اس بار اپنی مرضی سے درد والی دوائیں نہیں کھائیں۔"

حمزہ نے کندھے اچکائے۔

"صرف... تھوڑی سی۔"

عنایہ نے فوراً سخت لہجے میں کہا،

"میں نے آپ کو واضح طور پر منع کیا تھا۔"

"اگر آپ اسی طرح ااستعمال کرتے رہے تو ساری زندگی ہسپتال کے چکر لگاتے رہیں گے۔"

حمزہ نے سر جھکا لیا، جیسے کوئی شرارتی طالبِ علم استاد کی ڈانٹ سن رہا ہو۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اُس نے بہت آہستہ، تقریباً سرگوشی کے انداز میں کہا،

"شکر ہے"

عنایہ نے بھنویں سکیڑیں۔

"کس بات کا شکر؟"

حمزہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"کم از کم... آپ سے ملنے کا ایک بہانہ تو مل گیا۔"

ایک لمحے کے لیے عنایہ خاموش رہ گئیں۔

پھر فوراً سنبھل کر بولیں،

"ہسپتال لوگوں سے ملنے کی جگہ نہیں، علاج کروانے کی جگہ ہے۔"

حمزہ نے بے ساختہ کہا،

"اچھا... تو پھر آئندہ بیمار ہو کر ہی آؤں؟"

عنایہ نے گہری سانس لی اور بے اختیار مسکرا دیں، مگر اگلے ہی لمحے اپنی مسکراہٹ چھپا لی۔

"اللہ نہ کرے۔ میری دعا ہے کہ آپ کو دوبارہ یہاں مریض بن کر آنے کی ضرورت نہ پڑے۔"

حمزہ نے دل ہی دل میں سوچا،

"یہ عجیب لڑکی ہے... ڈانٹ بھی دعا کے ساتھ دیتی ہے۔"

اور شاید پہلی بار،

اُسے ہسپتال کی راہ اتنی بُری نہیں لگی۔

اگلے چند دن عجیب انداز میں گزرنے لگے۔

ڈاکٹر عنایہ نے محسوس کیا کہ وہ ہیلمٹ والا مریض اب کبھی کبھار ہسپتال میں نظر آجاتا تھا، مگر وہ ہمیشہ اپنی حد میں رہتا۔ نہ غیر ضروری بات کرتا، نہ راستہ روکتا اور نہ ہی بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا۔ عنایہ نے دل ہی دل میں یہی فیصلہ کیا کہ وہ اُسے صرف ایک مریض ہی سمجھیں گی۔ اُن کے نزدیک نامحرم سے ضرورت سے زیادہ گفتگو نہ پیشہ ورانہ تھی اور نہ ہی اسلامی آداب کے مطابق۔

دوسری طرف حمزہ اسفند کی حالت بھی عجیب ہو چکی تھی۔

پہلی بار اُس نے ڈاکٹر کی دی ہوئی دوائیں وقت پر استعمال کرنا شروع کر دیں۔

اپنی مرضی سے درد والی ادویات کھانا تقریباً چھوڑ دی۔

جب بھی گولی ہاتھ میں لیتا تو بے اختیار اُسے وہی سخت لہجہ یاد آجاتا۔

"اگر آپ نے دوبارہ ان کا بے جا استعمال کیا تو ساری زندگی ہسپتال کے چکر لگاتے رہیں گے۔"

وہ ہلکا سا مسکرا دیتا اور گولی واپس رکھ دیتا۔

ایک شام فینگ اُس کے اپارٹمنٹ آیا تو اُس نے میز کے قریب دسٹ بن میں وہی گولیاں دیکھی جو عنایا نے منع کی تھیں۔

اُس نے حیرت سے حمزہ کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہو گیا؟"

حمزہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"کیا؟"

فینگ نے آنکھیں پھیلا دیں۔

"تم... اور یہ دوائیں نہ کھاؤ؟"

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

حمزہ نے کندھے اچکا دیے۔

"ضرورت نہیں پڑی۔"

فینگ زور سے ہنس پڑا۔

"شراب میں تو آج تک کسی کی نہ مانی... لیکن ایک ڈاکٹر کی ڈانٹ نے یہ دوائے چھڑا دیں۔"

حمزہ نے مصنوعی غصے سے تکیہ اُٹھا کر اُس کی طرف پھینکا۔

"بند کر اپنی بکواس۔"

فینگ ہنستے ہوئے بولا۔

"مان لو بھائی... کچھ تو گڑبڑ ہے۔"

حمزہ نے بات بدل دی۔

"چائے پیئے گا؟"

فینگ نے مسکراتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا،

"کچھ تو گڑبڑ ہے۔"

اگلے ہی دن حمزہ نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔

اُس نے ہسپتال میں رات ٹائم کینٹین میں جز وقتی ملازمت اختیار کر لی۔

فینگ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ تقریباً ہکا بکا کر سا ہی رہ گیا۔

"تم؟"

"پیرس کا مشہور اداکار... اور کینٹین میں کام کرے گا؟"

حمزہ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کام کوئی چھوٹا نہیں ہوتا۔"

فینگ نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

"اور یہ ہسپتال ہی کیوں ملا؟"

حمزہ نے نظریں چرا لیں۔

"بس... قسمت۔"

فینگ نے قہقہہ لگایا۔

"قسمت نہیں...ڈاکٹر صاحبہ"

اگلے دن رات کو حمزہ ہسپتال میں اپنی شفٹ کے لیے پہنچ گیا،

رات کا وقت تھا۔

ہسپتال کی کینٹین میں زیادہ رش نہیں تھا۔

حمزہ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا سر ہیلمٹ سے ڈھکا ہوا، کافی کے کپ ترتیب دے رہا تھا کہ دروازہ کھلا۔

ڈاکٹر عنایہ اندر داخل ہوئیں۔

پورا دن مسلسل مریض دیکھنے کے بعد اُن کے چہرے پر تھکن صاف محسوس ہو رہی تھی۔

جیسے ہی اُنہوں نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا،

اُن کی نظریں ایک لمحے کے لیے رک گئیں۔

"ہیلمٹ والے مریض؟"

حمزہ نے فوراً سر اٹھایا۔

چہرے پر معصومیت سجا کر بولا،

"جی، ڈاکٹر صاحبہ؟"

عنایہ نے حیرانی سے پوچھا،

"آپ... یہاں کام کرتے ہیں؟"

حمزہ نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔

"جی باجی۔"

عنایہ ایک لمحے کے لیے چونک گئیں۔

"باجی؟"

حمزہ نے ہلکی سی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا،

"جی... غریب بندہ ہوں۔"

"پیٹ پالنے کے لیے دو دو کام کرنے پڑتے ہیں۔"

عنایہ نے چند لمحے اُسے دیکھا۔

پھر بولیں،

"لیکن آپ تو مریض تھے۔"

حمزہ نے فوراً جواب دیا۔

"مریض بھی ہوں... اور ملازم بھی۔"

"زندگی آسان تھوڑی ہے، باجی۔"

عنایہ بے اختیار مسکرادیں۔

"آپ ہر بات کا جواب مزاق میں کیوں دیتے ہیں؟"

حمزہ نے ٹرے اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا،

"کیونکہ اگر ہر بات دل پر لے لوں... تو شاید ہنسنا بھول جاؤں۔"

عنایہ چند لمحے خاموش رہیں۔

پھر آہستہ سے بولیں،

"ویسے... مریضوں کو اپنی دوا وقت پر لینی چاہیے۔"

حمزہ نے مسکرا کر جواب دیا،

"جی باجی... اب ڈانٹ کھانے کے بعد ہمت نہیں ہوتی چھوڑنے کی۔"

"اور ایک بات"

عنایہ نے بھنویں اُٹھائیں۔

"کیا؟"

حمزہ نے شرارت سے کہا،

"آج پہلی بار کسی نے مجھے مریض سے زیادہ انسان سمجھ کر نصیحت کی تھی...اس لیے یاد رہ گئی۔"

عنایہ نے نظریں جھکالیں۔

"اللہ آپ کو صحت دے۔"

"آمین۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی ٹرے اٹھاکر ایک میز کی طرف بڑھ گئیں۔

اور حمزہ کی نگاہیں چند لمحوں تک اُنہیں خاموشی سے دیکھتی رہیں۔

دوسری طرف، لاہور

صبح آج معمول سے مختلف تھی۔

حذیفہ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد خاموشی سے اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر اُس کی فائل، شناختی کارڈ اور تمام ضروری کاغذات رکھے تھے۔ آج اُس کی کئی مہینوں کی محنت کا امتحان تھا۔ وہ آئی ایس ایس بی کے مرحلے میں شرکت کرنے جارہا تھا۔ شاہینہ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی، "اللہ تمہیں کامیاب کرے، بیٹا۔" ریان بھی جلدی تیار ہو گیا تاکہ اُسے وقت پر امتحانی مرکز تک پہنچا سکے۔ راستے بھر دونوں حسبِ معمول ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہے، مگر ریان بار بار یہی کہتا،

"آج مذاق اپنی جگہ، لیکن گھبرانا مت۔ جیسے گھر میں ہوتا ہے، ویسے ہی اعتماد سے جواب دینا۔" حذیفہ مسکرا کر بولا، "اگر پاس ہو گیا تو سب سے پہلے تجھے فون کروں گا، اور اگر فیل ہو گیا تو بھی تجھے ہی رلاؤں گا۔" دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔

امتحانی مرکز کے باہر پہنچ کر ریان نے حذیفہ کو گلے لگایا۔ "اللہ پر بھروسا رکھ۔ نتیجہ اُس کے ہاتھ میں ہے، محنت تم نے پوری کی ہے۔" حذیفہ نے اثبات میں سر ہلایا، آخری بار ہاتھ ہلایا اور اندر داخل ہو گیا۔ ریان کچھ دیر تک اُسے جاتا ہوا دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے واپس دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اُدھر کال سینٹر میں آج معمول سے زیادہ مصروفیت تھی۔ ریان اپنی نشست پر بیٹھتے ہی مسلسل کالوں میں مصروف ہو گیا۔ دوسری طرف نور منہاج بھی اپنے کام میں لگی ہوئی تھی، مگر نہ جانے کیوں آج اُس کی نظریں بے اختیار کبھی کبھی ریان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ حیران تھی کہ یہ لڑکا ہر مشکل کلائینٹ سے بھی نرمی سے بات کیسے کر لیتا ہے، جبکہ دوسرے ملازمین چند منٹ میں جھنجھلا جاتے تھے۔

دوپہر کے وقفے میں ریان حسبِ معمول چائے لینے اُٹھا۔ واپسی پر اُس نے دیکھا کہ نور کی میز پر موجود پانی کی بوتل خالی ہے۔ اور وہ بڑھنے کے لیے اُٹھنے لگی تھی ریان نے اس کی بوتل پکڑی اور بغیر کچھ کہے قریب رکھے واٹر کولر سے بوتل بھر دی اور خاموشی سے اُس کی میز پر رکھ دی۔ نہ اُس نے نور کی طرف دیکھا، نہ کوئی بات کی، اور اپنی نشست پر واپس آ کر کام میں مصروف ہو گیا۔

چند لمحوں بعد نور نے بوتل دیکھی تو حیران رہ گئی۔ اُس نے گردن موڑ کر دیکھا، ریان ہیڈ فون لگائے پوری توجہ سے ایک کلائینٹ سے بات کر رہا تھا، جیسے اُسے اس چھوٹے سے کام کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

نور نے دل ہی دل میں سوچا،

"عجیب انسان ہے"

"نہ احسان جتاتا ہے، نہ بات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔"

پہلی بار اُس کے دل میں ریان کے لیے احترام کا ایک ننھا سا احساس پیدا ہوا، مگر اُس نے فوراً اپنے دل کو سمجھایا،

نور... صرف اچھے اخلاق دیکھ کر کسی کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ انسان کو پرکھنے میں وقت لگتا ہے۔

مگر دل بعض اوقات عقل سے پہلے سچ بول دیتا ہے،

اور شاید نور کے دل میں ایک نئی کہانی کا پہلا خاموش باب لکھا جا چکا تھا۔

جانتے ہو؟ محبت انسان کو اچانک نہیں ہوتی، بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے دل میں جگہ بنتی ہے۔ کبھی کسی کا اچھا اخلاق، کبھی کسی کی فکر، کبھی کسی کی دعا اور کبھی کسی کا احترام انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ مگر یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں انسان کا ایمان آزمایا جاتا ہے۔ اگر اُس محبت کو اللہ اور اُس کے احکام سے بڑھا دیا جائے تو وہی احساس انسان کو گناہوں کی طرف لے جا سکتا ہے، اور اگر اللہ کی رضا کو اپنی خواہش پر مقدم رکھا جائے تو وہی محبت عبادت کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ افسوس! آج کے دور میں اکثر لوگ محبت کے نام پر حدودِ شریعت بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ اسلام محبت سے منع نہیں کرتا، بلکہ

اُسے پاکیزہ راستہ دیتا ہے۔ اصل کامیاب وہ نہیں جو کسی کا دل جیت لے، بلکہ وہ ہے جو محبت میں بھی اپنے رب کو ناراض نہ کرے۔

کال سینٹر کی مصروف شام اپنے عروج پر تھی۔ ہر ملازم اپنے ہیڈ فون لگائے مسلسل کلائینٹ سے بات کر رہا تھا۔ کسی کی آواز میں غصہ تھا، کوئی شکایت کر رہا تھا، نور منہاج بھی اپنی نشست پر بیٹھی ایک کلائینٹ کو سمجھانے کی پوری کوشش کر رہی تھی، مگر دوسری طرف موجود شخص نہ صرف اُس کی بات سننے کو تیار تھا بلکہ مسلسل بد تمیزی بھی کیے جا رہا تھا۔ نور نے کئی مرتبہ تحمل سے بات کرنے کی کوشش کی، مگر آخر کار اُس کے چہرے پر بھی ناگواری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

ریان نے ساتھ والی نشست سے یہ سب محسوس کیا۔ اُس نے ایک نظر نور کی طرف دیکھا، پھر خاموشی سے اپنے سپر وائزر سے اجازت لی اور وہ کال اپنے نظام پر منتقل کر لی۔ اُس کے لہجے میں نہ غصہ تھا، نہ تلخی۔ اُس نے انتہائی نرمی اور صبر سے کلائینٹ کا مسئلہ سنا، ایک ایک بات اطمینان سے سمجھائی اور چند ہی منٹوں میں معاملہ حل ہو گیا۔ کال ختم ہونے کے بعد اُس نے صرف اتنا کہا، "اللہ آپ کے لیے آسانی فرمائے، اپنا خیال رکھیے گا۔" پھر ہیڈ فون اتار کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا، جیسے اُس نے کوئی خاص کام ہی نہ کیا ہو۔

نور کچھ لمحے خاموش بیٹھی اُسے دیکھتی رہی۔ اُس نے آہستہ سے پوچھا، تم ہر وقت اتنے پُر سکون کیسے رہتے ہو؟ میں تو پانچ منٹ میں تنگ آ جاتی ہوں۔

ریان نے کمپیوٹر کی اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، "میری امی ہمیشہ ایک بات کہتی ہیں... انسان کی اصل پہچان اُس وقت نہیں ہوتی جب سب کچھ اُس کے مطابق ہو، بلکہ اُس وقت ہوتی ہے جب کوئی اُس کے ساتھ سختی کرے اور پھر بھی وہ اپنے اخلاق نہ چھوڑے"، اگر ہم بھی ہر غصے کا جواب غصے سے دیں، تو فرق کیا رہ جائے گا؟۔"

نور نے پہلی بار اُس کی بات کا کوئی مذاق نہیں اُڑایا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ شاید ریان کی بات اُس کے دل کے کسی کونے میں جا کر ٹھہر گئی تھی۔

شام ڈھلنے ہی والی تھی کہ کال سینٹر کے دروازے سے ایک مانوس آواز گونجی، "او، ریان ... کہاں ہو؟"

ریان نے سر اٹھایا تو سامنے حذیفہ دونوں ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ اٹھائے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے کی مسکراہٹ ہی بتا رہی تھی کہ کوئی اچھی خبر ہے۔ ریان اپنی نشست سے اٹھا اور دونوں نے گرمجوشی سے ایک دوسرے کو گلے لگالیا۔

"مبارک ہو!" ریان نے خوشی سے پوچھا، "لگتا ہے پہلے مرحلے میں کامیاب ہو گئے ہو؟"

حذیفہ نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا، صرف کامیاب نہیں ہوا، اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا ہوں۔ اب مٹھائی تو بنتی ہے نا!

یہ کہتے ہوئے وہ دفتر میں موجود سب لوگوں کو مٹھائی بانٹنے لگا۔ جب وہ نور کی میز کے پاس پہنچا تو مسکراتے ہوئے بولا، "السلام علیکم، میں حذیفہ ہوں... ریان کا سب سے اچھا دوست اور سب سے بڑا سر درد۔"

نور نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، "وعلیکم السلام... سر درد والا حصہ تو آپ کے چہرے سے ہی ظاہر ہو رہا ہے۔"

دفتر میں بیٹھے چند ملازمین ہنس پڑے۔

حذیفہ نے حیران بننے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا، ارے واہ! یہ تو پہلی ملاقات میں ہی حملہ ہو گیا۔

"نور نے فوراً جواب دیا، "حملہ نہیں، صرف تعارف تھا۔"

ریان نے دونوں کو دیکھ کر ماتھے پر ہاتھ مارا اور ہنستے ہوئے بولا، "بس کرو تم دونوں... ایک دن بھی سکون سے نہیں رہ سکتے کیا؟"

حذیفہ نے فوراً مٹھائی کا ایک ٹکڑا ریان کے منہ میں رکھتے ہوئے کہا، "میں تو رہ سکتا ہوں... لیکن لگتا ہے یہ بہن جی مجھے آسانی سے نہیں چھوڑیں گی۔"

نور نے مصنوعی غصے سے کہا، "بہن جی کس کو کہا آپ نے؟۔"

حذیفہ فوراً ایک قدم پیچھے ہٹ گیا، "معاف کیجیے... ابھی تو پہلی ملاقات ہے، اتنی جلدی دشمنی نہیں پالنی۔"

اس بار نور بھی اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ ریان خاموشی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ کئی دنوں بعد نور کے چہرے پر دل سے نکلی ہوئی مسکراہٹ آئی ہے۔

پھر دونوں دوست موٹر سائیکل پر گھر کے لیے روانہ ہو گئے،

گھر پہنچ کر حذیفہ نے یہ خبر سب کو بتائی، کال پر اپنے ماما بابا کو بھی یہ خوش خبری دی۔ پھر،

رات کو عنایا سے کال پر بات کی، آدھا گھنٹا دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔

دوسری طرف...

پیرس کی رات آج غیر معمولی طور پر روشن تھی۔ شہر کے ایک نہایت پُر تعیش ہوٹل میں حمزہ اسفند کے پہلے ڈرامے کی شاندار کامیابی کی خوشی میں ایک بڑی تقریب منعقد کی گئی تھی۔ ہر طرف کیمرے، چمکتی روشنیاں، قیمتی لباس، قہقہے اور میڈیا کے نمائندے موجود تھے۔ مشہور اداکار، اداکارائیں، سرمایہ کار اور فلمی دنیا کی بڑی شخصیات ایک ہی چھت تلے جمع تھیں۔ جیسے ہی حمزہ ہال میں داخل ہوا، درجنوں کیمرے ایک ساتھ اُس کی طرف مڑ گئے۔ ہر کوئی اُس کے ساتھ تصویر بنوانا چاہتا تھا، کوئی مصافحہ کر رہا تھا تو کوئی مستقبل کے منصوبوں پر بات کر رہا تھا۔ چند ہی مہینوں میں وہ پیرس کی فلمی دنیا کا ایک پہچانا ہوا چہرہ بن چکا تھا، مگر اتنی شہرت کے باوجود اُس کے دل کی ویرانی آج بھی ویسی ہی تھی۔

تقریب اپنے عروج پر تھی۔ موسیقی کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی، شراب کے گلاس ایک میز سے دوسری میز تک منتقل ہو رہے تھے اور بے حیائی کو جدید تہذیب کا نام دے کر عام کیا جا رہا تھا۔ ایک مشہور اداکارہ مسکراتے ہوئے حمزہ کے قریب آئی، اُس نے بے تکلف انداز میں بات شروع کی اور کچھ ہی دیر بعد اُسے رقص کی دعوت بھی دے دی۔ چند ماہ پہلے والا حمزہ شاید ایک لمحہ بھی نہ سوچتا، مگر آج اُس کے قدم جیسے بے اختیار رک گئے۔ نہ جانے کیوں اُس کے کانوں میں ایک مانوس آواز گونج اٹھی۔

صحت اللہ کی امانت ہے... اور انسان کو اپنی زندگی کے بارے میں بھی اللہ کے سامنے جواب دینا ہوگا۔

یہ الفاظ تو صرف دواؤں کے بارے میں کہے گئے تھے، مگر نہ جانے کیوں آج وہ اُس کے دل پر کسی اور انداز سے دستک دے رہے تھے۔

ویٹر ایک قیمتی شراب کا گلاس اُس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ حمزہ نے گلاس ہاتھ میں لیا، چند لمحے اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا، پھر آہستہ سے واپس میز پر رکھ دیا۔

فینگ دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے حمزہ کے پاس آیا اور حیرت سے بولا، "آج سورج مغرب سے کیسے نکل آیا؟ حمزہ اسفند... اور شراب سے انکار؟"

"حمزہ نے مصنوعی بے نیازی سے کہا، "آج دل نہیں چاہ رہا۔

فینگ نے ہنستے ہوئے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "دل نہیں چاہ رہا... یا کسی کی ڈانٹ اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے؟"

حمزہ نے جواب نہ دیا، صرف ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آئی اور فوراً غائب بھی ہو گئی۔

اسی لمحے وہ اداکارہ دوبارہ اُس کے قریب آئی اور بولی، "آج تم بہت خاموش لگ رہے ہو۔ چلو، سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

حمزہ نے نہایت مہذب انداز میں جواب دیا، "معذرت... آج میرا دل نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ہال کی بالکونی کی طرف بڑھ گیا، جہاں شور کم تھا اور رات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ساتھ ہلکی ہلکی بارش برس رہی تھی۔

وہ ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر خاموشی سے شہر کی روشنیاں دیکھنے لگا۔

کتنی عجیب بات ہے،

باہر کی دنیا جتنی روشن دکھائی دیتی ہے، ہر انسان کا باطن اتنا ہی روشن ہو، یہ ضروری نہیں۔

کبھی کبھی سب سے زیادہ ہنسنے والے لوگ بھی رات کو تنہائی میں سب سے زیادہ روتے ہیں۔

جانتے ہو؟

شیطان انسان کے سامنے گناہ کو ہمیشہ خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ بے حیائی کو آزادی، شراب کو سکون، اور حرام تعلقات کو محبت کا نام دیتا ہے، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ چند لمحوں کی لذت انسان کو وقتی خوشی تو دے سکتی ہے، مگر دل کا سکون کبھی نہیں دے سکتی۔ سکون نہ دولت میں ہے، نہ شہرت میں، نہ تعریفوں میں اور نہ ہی گناہوں سے بھری محفلوں میں۔ حقیقی سکون صرف اُس دل کو نصیب ہوتا ہے جو اپنے رب کے قریب ہو۔ افسوس کہ آج کی دنیا نے ترقی تو بہت کر لی، مگر کامیابی کا معیار بدل دیا۔ اب کردار سے زیادہ شہرت دیکھی جاتی ہے، حیا سے زیادہ فیشن، اور اللہ کی رضا سے زیادہ لوگوں کی تعریف کو اہمیت دی جاتی ہے۔ حالانکہ قیامت کے دن نہ کیمرے ساتھ ہوں گے، نہ تالیاں، نہ شہرت... اُس دن صرف اعمال کا وزن ہو گا، اور وہی انسان کامیاب ہو گا جس کا تعلق اپنے رب سے مضبوط ہو گا۔

حمزہ نے آسمان کی طرف دیکھا، پھر نہ جانے کیوں اُس کی نگاہوں کے سامنے ایک بار پھر وہ نقاب میں چھپی سیاہ آنکھیں آ گئیں۔

وہ خود ہی دھیرے سے مسکرایا اور سر جھٹک کر بولا،

"ڈان... عجیب مسئلہ بن گئی ہو آپ بھی۔"

مگر وہ نہیں جانتا تھا،

بعض اوقات اللہ کسی انسان کو ہماری زندگی میں محبت دینے کے لیے نہیں، بلکہ ہدایت کا دروازہ کھولنے کے لیے بھیجتا ہے۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ تقریب اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی، مگر حمزہ اسفند کے ذہن میں عجیب سی بے چینی تھی۔ نہ موسیقی کا شور اُس کے ساتھ آیا تھا، نہ لوگوں کی تعریفیں۔ وہ خاموشی سے اپنی گاڑی چلاتا ہوا پیرس کی سنسان سڑکوں پر نکل آیا۔ بارش مسلسل تیز ہو رہی تھی۔ شیشے پر گرتے قطرے شہر کی روشنیاں دھندلا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں اُس کے ہاتھ خود بخود اُس راستے پر مڑ گئے، جس کے آخر میں وہی ہسپتال تھا۔

ہسپتال کے مرکزی دروازے کے قریب پہنچ کر اُس نے گاڑی آہستہ کر دی۔ اُس کی نظر اچانک دروازے کے باہر کھڑی ایک شناسا شخصیت پر جا ٹھہری۔ سفید کوٹ، چہرے پر نقاب اور ہاتھ میں ایک بیگ... ڈاکٹر عنایہ اپنی ڈیوٹی مکمل کر چکی تھیں اور مسلسل برسنے والی بارش میں ٹیکسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ تیز ہوا کے جھونکے بارش کے قطروں کو اُن تک پہنچا رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں اُن کا عبایا اور آستینیں بھیگ چکی تھیں۔

حمزہ نے بے اختیار بریک لگا دی۔

آج اُس کے پاس نہ ہیلمٹ تھا، نہ کوئی چیز جس سے وہ اپنی شناخت مکمل طور پر چھپا سکتا۔ وہ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ دل چاہتا تھا جا کر پوچھے، "آپ ٹھیک ہیں؟" مگر اگلے ہی لمحے اُس نے خود کو روک لیا۔

"اگر میں سامنے گیا تو وہ پہچان جائیں گی کہ میں ایکٹر ہوں"

اُس نے آہستہ سے گہری سانس لی، پھر اپنی نشست سے اٹھا، گاڑی سے باہر نکلا اور اپنا لمبا سیاہ کوٹ اتار لیا۔

سر جھکائے، نظریں زمین پر رکھے، وہ آہستہ آہستہ عنایہ کے قریب سے گزرا۔ دونوں کے درمیان صرف چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے کوٹ اُن کی طرف بڑھایا اور نہایت دھیمی آواز میں صرف اتنا کہا،

"بارش بہت تیز ہے... بیمار نہ پڑ جائیے گا۔"

عنایہ کچھ سمجھ پاتیں، اُس سے پہلے ہی حمزہ کوٹ اُن کے ہاتھوں میں دے کر تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

عنایہ حیرت سے چند لمحے وہیں کھڑی رہ گئیں۔

"سنیے!"

اُنہوں نے بے اختیار آواز دی، مگر وہ شخص مڑے بغیر بارش میں آگے بڑھتا رہا۔

عنایہ نے جلدی سے چند قدم آگے بڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھا، مگر بارش اور رات کی دھند میں وہ اجنبی کہیں گم ہو چکا تھا۔

اُنہوں نے اپنے ہاتھوں میں موجود کوٹ کو دیکھا۔ کوٹ ابھی بھی اُس شخص کی ہلکی سی خوشبو لیے ہوئے تھا، مگر اُس پر نہ کوئی نام تھا، نہ کوئی پہچان۔

عنایہ آہستہ سے خود کلام ہوئیں،

"یہ... کون تھے؟"

"اور میری مدد کر کے بغیر کچھ کہے چلے کیوں گئے؟"

اسی لمحے ایک ٹیکسی ہسپتال کے سامنے آکر رکی۔ عنایہ نے ایک آخری نظر اُس سمت ڈالی جہاں وہ اجنبی غائب ہوا تھا، پھر کوٹ کو احتیاط سے اپنے بازو پر رکھا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔

اُدھر چند فاصلے پر کھڑا حمزہ اپنی گاڑی کے شیشے سے ٹیکسی کو روانہ ہوتے دیکھ رہا تھا۔

اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"ڈان"

وہ آہستہ سے بولا،

"آج پہلی بار آپ نے مجھے نہیں دیکھا... مگر شاید میری دعا آپ تک پہنچ گئی۔"

بارش بدستور برس رہی تھی،

مگر دونوں میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ تقدیر اُن کے درمیان فاصلے کم کرنا شروع کر چکی ہے۔

چند دن گزر گئے۔

ڈاکٹر عنایہ حسبِ معمول رات کے وقفے میں ہسپتال کی کینٹین کی طرف آئیں، مگر آج اُن کی نظر بے اختیار کاؤنٹر پر جا ٹھہری۔

وہ جگہ خالی تھی۔

نہ وہ ہلکی سی شرارتی مسکراہٹ،

نہ "جی باجی" کہنے والی آواز،

اور نہ ہی وہ ہیلمٹ والا مریض۔

عنایہ نے لاشعوری طور پر پورا کینٹین ہال ایک نظر دیکھا، پھر خود ہی چونک گئیں کہ آخر وہ کس کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

کاؤنٹر پر موجود ملازم سے اُنہوں نے معمول کے انداز میں پوچھا،

وہ... جو چند دن پہلے رات کی ڈیوٹی کرتا تھا... ہیلمٹ والا لڑکا... آج کل نظر نہیں آرہا؟"

ملازم مسکرا دیا۔

"اوہ! وہ؟ اُس نے تو یہ کام چھوڑ دیا ہے، ڈاکٹر صاحبہ۔"

"اچھا"

عنایہ نے مختصر سا جواب دیا، مگر نہ جانے کیوں اُن کے دل میں ایک لمحے کے لیے خاموشی سی اتر آئی۔

وہ اپنی ٹرے اٹھا کر ایک میز پر جا بیٹھیں اور خود ہی آہستہ سے بولیں،

"عجیب انسان تھا"

پھر فوراً اپنے آپ کو ٹوکا۔

"مجھے اس سے کیا؟"

اور دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گئیں۔

اُدھر حمزہ اسفند ہیلمٹ میں اپنا سر چھپائے ہسپتال کے انتظامی دفتر میں کھڑا تھا۔

"مجھے کوئی اور کام چاہیے۔"

افسر نے حیرت سے پوچھا،

"تم نے کینٹین کیوں چھوڑی؟"

حمزہ نے سنجیدگی سے جواب دیا،

"وہاں بہت کم لوگوں سے ملاقات ہوتی تھی... میرا مطلب ہے... کام کم تھا۔"

افسر نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

"اچھا... توصفائی کے شعبے میں آدمی چاہیے، کروگے؟"

حمزہ نے فوراً جواب دیا،

"جی، کیوں نہیں؟"

چند ہی گھنٹوں بعد وہ ہسپتال کی وردی پہنے ہاتھ میں صفائی کا سامان لیے اور ہیلمٹ پہنے راہداری میں کھڑا تھا۔

اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر آہستہ سے بولا،

"حمزہ اسفند... پیرس کا مشہور اداکار... اور اب صفائی والا"

پھر خود ہی ہنس دیا۔

"زندگی بھی عجیب کہانی لکھتی ہے۔"

دوسرے دن صبح ڈاکٹر عنایہ مریضوں کی فائلیں ہاتھ میں لیے راہداری سے گزر رہی تھیں۔

پیچھے سے صفائی کرنے کی آواز آرہی تھی۔

عنایہ نے توجہ نہ دی اور آگے بڑھتی رہیں۔

اچانک پیچھے سے ایک مانوس آواز آئی۔

"باجی... آپ چلتی جائیں، میں آپ کے قدموں کے نشان صاف کرتا جاتا ہوں۔"

عنایہ فوراً رک گئیں۔

وہ مُڑیں،

اور سامنے جھاڑو ہاتھ میں لیے وہی ہیلمٹ والا مریض کھڑا تھا۔

سبز جھیل جیسی آنکھیں نمایاں،

عنایہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"آپ؟"

حمزہ نے معصومیت سے سر ہلایا۔

"جی باجی۔"

"آپ... صفائی کا کام بھی کرنے لگے؟"

حمزہ نے پورے اطمینان سے جواب دیا،

"جی، روزی حلال ہو تو کام چھوٹا نہیں ہوتا۔"

عنایہ بے اختیار مسکرادیں۔

"لیکن چند دن پہلے تو آپ کینٹین میں تھے۔"

حمزہ نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا،

"جی باجی! ترقی ہو گئی ہے۔"

عنایہ حیران ہوئیں۔

"ترقی؟"

"جی، پہلے لوگوں کے برتن صاف کرتا تھا... اب راستے صاف کرتا ہوں۔"

عنایہ اپنی ہنسی نہ روک سکیں۔

"آپ واقعی بہت عجیب ہیں۔"

حمزہ نے جھاڑو ایک طرف رکھتے ہوئے ہلکے سے کہا،

"یہ تعریف تھی یا شکایت؟"

عنایہ نے مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے جواب دیا،

"ابھی فیصلہ نہیں کیا۔"

اتنے میں ایک نرس نے عنایہ کو آواز دی۔

"ڈاکٹر، ایمرجنسی میں آپ کی ضرورت ہے۔"

عنایہ نے فوراً سنجیدگی اختیار کی۔

"میں آرہی ہوں۔"

جانے سے پہلے اُنہوں نے ایک لمحے کے لیے حمزہ کی طرف دیکھا اور کہا،

"اور ہاں... اپنی دوائیں وقت پر لیتے رہیے گا۔"

حمزہ نے مسکرا کر جواب دیا،

"جی باجی... آپ کی ڈانٹ ابھی تک یاد ہے۔"

عنایہ سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئیں، جبکہ حمزہ اُنہیں جاتا ہوا دیکھ کر آہستہ سے خود سے بولا،

"ڈان... لگتا ہے آج پہلی بار آپ نے دل کھول کر مسکرایا ہے۔"

اور پھر وہ خاموشی سے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ایک دن،

حمزہ اسفند پوری بے فکری سے جھاڑو لگا رہا تھا۔

اچانک اُس نے ارد گرد دیکھا، راہداری خالی تھی۔

وہ فوراً جھاڑو کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بولا،

"حمزہ اسفند! آج کا بہترین اداکار کا انعام آپ کو جاتا ہے"

پھر خود ہی ہاتھ سے تالیاں بجانے لگا۔

"واہ حمزہ! واہ"

اتنے میں اُس نے جھاڑو کو مائیک بنایا اور فلمی انداز میں بولا،

"میں سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، خاص طور پر اس جھاڑو کا جس نے آج تک میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔"

اسی وقت پیچھے سے آواز آئی۔

"ہیلمٹ والے مریض"

حمزہ کے ہاتھ سے جھاڑو پھسل گیا۔

وہ مڑا،

سامنے ڈاکٹر عنایہ کھڑی تھیں۔

بازو بندھے ہوئے،

چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ،

اور آنکھوں میں صاف صاف شرارت۔

حمزہ نے ایک سیکنڈ میں جھاڑو اٹھایا اور پوری سنجیدگی سے فرش صاف کرنے لگا۔

"السلام علیکم، باجی! میں تو بس صفائی کا معیار دیکھ رہا تھا۔"

عنایہ نے ارد گرد دیکھا۔

"اچھا؟"

"یہ معیار صرف اس وقت چیک ہوتا ہے جب راہداری خالی ہو؟"

حمزہ کھنکھارا۔

"جی... عوام کے سامنے تحقیق کرنا مناسب نہیں ہوتا۔"

عنایہ ہنسی روک کر بولیں،

"آپ واقعی عجیب آدمی ہیں۔"

اسی دوران ایک نرس آئی۔

"ڈاکٹر عنایہ !وارڈ نمبر سات میں آپ کو بلا رہے ہیں۔"

حمزہ نے فوراً سر اٹھایا۔

"اوہ"

وہ دل ہی دل میں بولا،

"توڈان کا نام عنایہ ہے"

پھر آہستہ سے مسکرایا۔

"عنایہ"

عنایہ چونک کر بولیں،

"آپ نے کچھ کہا؟"

حمزہ نے فوراً جھاڑو چلانا شروع کر دیا۔

"نہیں باجی... میں تو جھاڑو سے بات کر رہا تھا۔"

عنایہ نے حیرت سے پوچھا،

"جھاڑو سے؟"

"جی، اسے سمجھا رہا تھا کہ ڈیوٹی کے وقت شرارت نہیں کرنی چاہیے۔"

عنایہ اب جانے لگیں، پھر اچانک رُک گئیں۔

"ویسے"

حمزہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"جی باجی؟"

"آپ کا نام کیا ہے؟"

حمزہ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا،

"ہیلمٹ والا مریض۔"

عنایہ نے آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔

"اصل نام۔"

"وہی ہے۔"

"آپ کے شناختی کارڈ پر بھی یہی لکھا ہے؟"

حمزہ نے فوراً کہا،

"نہیں... وہاں 'ہیلمٹ والا مریض ولد ہیلمٹ والے انکل' لکھا ہے۔"

عنایہ بے اختیار ہنس پڑیں۔

"اللہ کے بندے! کوئی انسان اتنا بھی ڈرامہ نہیں کرتا۔"

حمزہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا،

"میں ڈرامہ نہیں کرتا باجی"

ایک لمحہ رکا، پھر مسکرا کر بولا،

"میں تو ڈراموں میں کام کرتا ہوں۔..."

عنایہ نے فوراً جواب دیا،

"اوہ تو آپ خواب بھی دیکھتے ہیں۔"

دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر عنایہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"ٹھیک ہے، ہیلمٹ والے مریض... جس دن آپ اپنا اصل نام بتائیں گے، اُس دن میں آپ کو اس نام سے بلاؤں گی"

حمزہ نے جھاڑو کندھے پر رکھا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا،

"اور شاید اس دن آپ مجھ سے نفرت کریں۔"

عنایہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا،

"آپ کا علاج واقعی مشکل ہے۔"

حمزہ نے فوراً جواب دیا،

"ڈاکٹر اچھی مل جائے تو مشکل علاج بھی ہو جاتا ہے، باجی۔"

عنایہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

حمزہ نے اُنہیں جاتے دیکھا، پھر جھاڑو کو دیکھ کر آہستہ سے بولا،

"دیکھا دوست... آج پھر ڈان کو ہنسا دیا۔"

اسی وقت پیچھے سے سپر وائزر کی آواز گونجی،

"اوئے! جھاڑو سے باتیں بعد میں کرنا، پہلے راہداری صاف کرو"

حمزہ نے فوراً سیدھا ہو کر کہا،

"جی سر"

وہ سمجھ چکا تھا، اس کے دل میں عنایہ کے لیے کچھ ہے۔

رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے۔ ہسپتال کی عمارت کے باہر ہلکی ہلکی بارش کے بعد موسم خوشگوار ہو چکا تھا۔ زیادہ تر عملہ جا چکا تھا اور پارکنگ تقریباً خالی تھی۔ ڈاکٹر عنایہ اپنے کندھے پر بیگ لٹکائے مرکزی دروازے کے قریب کھڑی ٹیکسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ وقفے وقفے سے سڑک کی طرف دیکھتیں، پھر گھڑی پر نظر ڈال لیتیں۔

اُدھر سڑک کے دوسری طرف ایک سیاہ رنگ کی گاڑی خاموشی سے کھڑی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر حمزہ اسفند بیٹھا تھا۔

اب نہ اُس نے صفائی والے کی وردی پہنی تھی، نہ ہی ہیلمٹ۔ سفید ڈریس شرٹ، ہاتھ میں گھڑی اور معمول کے برعکس مکمل خاموشی۔ وہ صرف اتنی دوری پر تھا کہ عنایہ اُسے پہچان نہ سکیں، مگر وہ اُن پر نظر رکھ سکے۔

وہ زیرِلب مسکرایا۔

"ڈان... آج بھی ڈیوٹی سب سے آخر میں ختم ہوئی۔"

اچانک ایک نوجوان تیزی سے عنایہ کے قریب آیا۔

عنایہ کچھ سمجھ پاتیں، اُس سے پہلے اُس نے اُن کے ہاتھ سے بیگ چھینا اور پوری رفتار سے بھاگ نکلا۔

"میرا بیگ!"

عنایہ بے اختیار چلائیں، مگر وہ شخص چند ہی لمحوں میں سڑک پار کر چکا تھا۔

حمزہ نے یہ منظر دیکھا تو اُس کی مسکراہٹ ایک لمحے میں غائب ہو گئی۔

اُس نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی۔

"غلط بندے سے پنگا لے لیا۔"

گاڑی تیزی سے اس کے پیچھے بڑھی۔ چند گلیاں پار کرنے کے بعد حمزہ نے اُس کا راستہ روک دیا۔ وہ گھبرا کر دوسری طرف بھاگنے لگا، مگر حمزہ بھی گاڑی سے اتر چکا تھا۔

"بیگ نیچے رکھ"

اس نے جواب دینے کے بجائے بھاگنے کی کوشش کی، مگر حمزہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔

بیگ زمین پر گر گیا۔

"خبردار، اگر آج کے بعد اس لڑکی کے آگے پیچھے بھی نظر آئے۔"

وہ بیگ چھوڑ کر اندھیری گلی میں غائب ہو گیا۔

حمزہ نے بیگ اٹھایا، گرد جھاڑی اور دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

واپسی کے پورے راستے اُس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔

"اگر میں سامنے گیا تو ڈان میری آنکھیں پہچان لے گی کہ او سمجھ جائے گی وہ ہیلمٹ والا میں ہی ہوں... نہیں، آج بھی راز راز ہی رہے۔"

چند لمحوں بعد گاڑی دوبارہ ہسپتال کے باہر آ کر رکی۔

عنایہ اب بھی پریشان کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔

گاڑی آہستہ سے اُن کے قریب رکی۔

شیشہ صرف اتنا نیچے ہوا کہ ایک ہاتھ باہر آ سکے۔

"یہ... آپ کا بیگ۔"

عنایہ نے چونک کر بیگ تھاما۔

"آپ...، کون؟"

حمزہ نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ رکھا تھا تاکہ روشنی اُس پر نہ پڑے۔

عنایہ نے حیرت سے پوچھا،

"آپ نے میرا بیگ...؟"

حمزہ نے مختصر جواب دیا،

"راستے میں مل گیا۔"

عنایہ نے فوراً کہا،

"کم از کم اپنا نام تو بتایئے، میں آپ کا شکریہ بھی"

"شکریہ اللہ کا ادا کیجیے۔"

حمزہ نے اُن کی بات کاٹ دی۔

"ہم تو صرف ایک ذریعہ تھے۔"

عنایہ خاموش ہو گئیں۔

اُنہوں نے بیگ مضبوطی سے پکڑا، پھر بے اختیار اُس شخص کے ہاتھ کی طرف دیکھا جو ابھی تک گاڑی کی کھڑکی پر ٹکا ہوا تھا۔

اُس کی انگلی میں چاندی کی ایک خوبصورت انگوٹھی تھی، جس میں سبز رنگ کا ایک نہایت نایاب پتھر جڑا ہوا تھا۔ ہسپتال میں کئی بار ہیلمٹ والے مریض کے ہاتھ پر بھی اُن کی نظر اسی انگوٹھی پر پڑ چکی تھی۔

عنایہ کی نظریں ایک لمحے کے لیے ٹھہر گئیں۔

"یہ انگوٹھی"

وہ دل ہی دل میں بولیں۔

"میں یہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہوں"

اُنہوں نے دوبارہ گاڑی کے اندر جھانکنے کی کوشش کی، مگر اُس شخص نے اسی لمحے شیشہ اوپر کر دیا۔

گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔

عنایہ چند قدم آگے بڑھیں۔

"سنیے!"

مگر گاڑی رات کی خاموش سڑک میں دور ہوتی چلی گئی۔

وہ کافی دیر تک اُسی سمت دیکھتی رہیں، پھر اُن کی نگاہ دوبارہ اپنی یادداشت میں ابھرتی اُس سبز پتھر والی انگوٹھی پر جا ٹھہری۔

وہ آہستہ سے خود کلام ہوئیں،

"کیا یہ... محض اتفاق تھا؟"

یا،

"ہیلمٹ والا مریض... اتنا بھی اجنبی نہیں جتنا وہ خود کو ظاہر کرتا ہے۔"

اگلی صبح ہسپتال معمول کے مطابق مصروف تھا، مگر ڈاکٹر عنایہ کے ذہن میں گزشتہ رات کا واقعہ مسلسل گردش کر رہا تھا۔ وہ جب بھی کسی راہداری سے گزرتیں، اُن کی نظریں بے اختیار ہیلمٹ والے لڑکے کے ہاتھوں پر چلی جاتیں۔ دل بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ شاید وہی شخص تھا... مگر عقل ہر بار یہی جواب دیتی، "یہ صرف ایک اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔"

دوسری طرف حمزہ اسفند بھی کم ہوشیار نہیں تھا۔ جیسے ہی اُس نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر عنایہ کی نظریں بار بار اُس کے ہاتھوں کی طرف جا رہی ہیں، اُس نے فوراً انگوٹھی اتار کر صفائی والے موٹے دستانے پہن لیے۔ عنایہ چند لمحے اُسے دیکھتی رہیں، پھر آہستہ سے بولیں،

"آج دستانے بھی پہن لیے؟"

حمزہ نے جھاڑو ایک طرف رکھتے ہوئے معصومیت سے جواب دیا،

"جی باجی... صفائی میں ہاتھ گندے ہو جاتے ہیں۔"

عنایہ نے قدرے سنجیدہ لہجے میں پوچھا،

"ویسے... آپ کے ہاتھ میں کبھی کوئی انگوٹھی بھی ہوتی ہے؟"

حمزہ کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے تیز ہوئی، مگر چہرے کے تاثرات نہ بدلے۔

وہ ہلکا سا ہنسا اور بولا،

باجی... میری تنخواہ دیکھی ہے؟ اُس میں تو مہینے کے آخر میں چائے کے بسکٹ پورے نہیں ہوتے، آپ انگوٹھی کی بات کر رہی ہیں۔

عنایہ چند لمحے خاموش رہیں، پھر خود بھی مسکرا دیں۔

"بات تو ٹھیک ہے"

لیکن نہ جانے کیوں اُن کے دل نے ابھی تک اُس جواب کو قبول نہیں کیا تھا۔

اسی دوران اچانک ایمرجنسی وارڈ کی طرف سے ایک نرس بھاگتی ہوئی آئی۔

ڈاکٹر عنایہ! فوراً آئیے، مریض کو آپریشن تھیٹر منتقل کر دیا گیا ہے۔ "گردے کی سرجری کے لیے "

عنایہ کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر تیزی سے آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھ گئیں۔

حمزہ بھی بے اختیار اُنہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

چند گھنٹوں بعد،

آپریشن تھیٹر کی سرخ بتی بجھ چکی تھی۔

تمام ڈاکٹر خاموش کھڑے تھے۔

عنایہ نے اپنی پوری کوشش کی تھی، مگر شدید پیچیدگی کی وجہ سے مریض کو بچایا نہ جا سکا۔

انہوں نے آہستہ سے اپنے دستانے اتارے۔

اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

وہ باہر نکلیں، دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور پہلی بار اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ بار بار خود سے یہی کہہ رہی تھیں،

"کاش... میں اسے بچا لیتی"

"کاش میں کچھ اور کر سکتی"

حمزہ دور راہداری میں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

اُس نے پہلی بار اُس مضبوط لڑکی کو اس طرح ٹوٹتے دیکھا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا عنایہ کے قریب آیا، مگر مناسب فاصلہ برقرار رکھا۔

کچھ لمحے خاموشی رہی۔

پھر اُس نے ہلکے لہجے میں کہا،

"باجی"

عنایہ نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔

"آپ...؟"

حمزہ نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا،

"ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھیے۔"

"اگر کبھی میری بھی ایسی ہی کوئی خطرناک سرجری ہوئی"

وہ چند لمحے رکا، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا،

"اور فرض کریں... میں مر گیا"

عنایہ نے فوراً غصے سے اُس کی بات کاٹ دی۔

"فضول باتیں مت کیجیے۔"

حمزہ اپنی عادت کے مطابق مسکرا دیا۔

"نہیں، فرض کریں"

"تو کیا آپ بھی ایسے ہی روئیں گی؟"

عنایہ نے چند لمحے اُسے خاموشی سے دیکھا۔

پھر آنسوؤں کے باوجود اپنے مخصوص انداز میں بولیں،

"ہرگز نہیں۔"

حمزہ نے حیران بننے کی اداکاری کی۔

"اچھا جی؟"

عنایہ نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا،

"میں تو خوش ہوں گی"

حمزہ نے بھنویں اٹھائیں۔

"خوش؟"

"جی ہاں۔"

"کیونکہ دنیا سے ایک پاگل انسان کا بوجھ کم ہو جائے گا۔"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

پھر حمزہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور ڈرامائی انداز میں بولا،

"!یا اللہ... اتنی بے رحم ڈاکٹر"

"مریض ابھی زندہ ہے، اور اُس کی وفات پر خوشیاں بھی منائی جا رہی ہیں"

عنایہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"آپ واقعی باز نہیں آئیں گے۔"

حمزہ بھی مسکرا دیا، مگر اُس کی مسکراہٹ کے پیچھے ایک عجیب سی سنجیدگی چھپی ہوئی تھی۔

وہ آہستہ سے بولا،

"ویسے باجی"

"آج ایک بات سمجھ آئی۔"

عنایہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

حمزہ نے مریض کے اہلِ خانہ کی طرف اشارہ کیا، جو روتے ہوئے اپنے عزیز کو آخری بار دیکھ رہے تھے۔

"ڈاکٹر کبھی کسی مریض کی موت پر خوش نہیں ہوتے"

"وہ صرف اپنی پوری کوشش کرتے ہیں... باقی فیصلہ اللہ کا ہوتا ہے۔"

عنایہ خاموش ہو گئیں۔

شاید پہلی بار اُس "پاگل انسان" نے ایسی بات کہی تھی جس میں مذاق نہیں، حقیقت تھی۔

وہ آہستہ سے بولیں،

"شاید... آپ اتنے بھی پاگل نہیں ہیں۔"

حمزہ فوراً مسکرا کر بولا،

"یہ جملہ دوبارہ کہہ دیجیے، میں اسے فریم کروا کر دیوار پر لگا لوں گا۔"

عنایہ بے اختیار ہنس پڑیں۔

اور کئی گھنٹوں کے بعد،

یہ اُن کی پہلی مسکراہٹ تھی۔

کئی ہفتے گزر چکے تھے۔

حمزہ اسفند نے اچانک فلمی دنیا سے وقتی وقفہ لے لیا تھا۔ میڈیا روز نئی نئی افواہیں پھیلا رہا تھا۔ کوئی کہتا وہ نئے منصوبے کی تیاری کر رہا ہے، کوئی کہتا وہ بیرونِ ملک چلا گیا ہے، مگر حقیقت صرف چند لوگ جانتے تھے۔ حمزہ زیادہ تر وقت گھر میں گرینی کے ساتھ گزارتا، کبھی کتاب ہاتھ میں لے لیتا، کبھی خاموشی سے کھڑکی کے پاس بیٹھ کر بارش دیکھتا، مگر اُس کی طبیعت اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ کمر کے ایک طرف ہلکا ہلکا درد اکثر اُٹھتا، مگر حسبِ عادت وہ اسے نظر انداز کر دیتا۔

ایک شام وہ گرینی کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ اچانک اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس نے کپ میز پر رکھا اور دونوں ہاتھ اپنی کمر کے دائیں حصے پر رکھ لیے۔ درد اتنا شدید تھا کہ چند ہی لمحوں میں اُس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

"گرینی گھبرا کر بولیں، "حمزہ! کیا ہوا بیٹا؟

حمزہ نے دانت بھینچتے ہوئے بمشکل کہا، "ک... کچھ نہیں گرینی... بس معمولی درد ہے"

اتنے میں درد کئی گنا بڑھ گیا۔ وہ صوفے سے نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

گرینی نے فوراً فینگ کو فون کیا۔

چند ہی منٹوں میں فینگ گھر پہنچ گیا۔ اُس نے حمزہ کی حالت دیکھی تو پہلی بار اُس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"یہ معمولی درد نہیں ہے۔ فوراً ہسپتال چلتے ہیں۔"

حمزہ نے کمزور آواز میں کہا،

"نہیں... دو گولیاں کھالیتا ہوں، ٹھیک ہو جاؤں گا"

فینگ نے سخت لہجے میں جواب دیا،

"بس! یہی کھا کھا کر آج یہ حالت بنائی ہے۔ اب ایک لفظ نہیں سنوں گا۔"

درد کے باوجود حمزہ نے ایک بات کا خاص خیال رکھا۔

اُس نے جاتے جاتے اپنا ہیلمٹ اٹھایا اور سر پر پہن لیا۔

فینگ نے حیرت سے پوچھا،

"ہسپتال جا رہے ہیں یا موٹر سائیکل ریس میں؟"

حمزہ نے درد کے عالم میں بھی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"ڈان ڈیوٹی پر ہوئی تو پہچان نہ لے۔"

فینگ نے ماتھا پیٹ لیا۔

"قسم سے !تو مرنے کے قریب بھی ہو، پھر بھی یہی فکر ہے"

ہسپتال پہنچتے ہی حمزہ کو فوری طور پر ایمرجنسی میں منتقل کر دیا گیا۔

ڈاکٹرز نے خون کے نمونے لیے، کئی معائنے کیے اور فوری اسکین بھی کروایا۔

کمرے میں غیر معمولی خاموشی تھی۔مانیٹر کی مدھم آواز اس سکوت کو توڑ رہی تھی۔ڈاکٹر نے رپورٹ میز پر رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا،

آپ کو دائمی گردوں کی بیماری

(Chronic Kidney Disease – CKD)

ہے۔اس بیماری میں گردے آہستہ آہستہ اپنی کارکردگی کھونے لگتے ہیں۔علاج، ادویات، پرہیز اور باقاعدہ فالو اَپ سے بیماری کی رفتار کو کم کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر بیماری آخری مرحلے تک پہنچ جائے تو ڈائیلاسز یا گردے کی پیوندکاری کی ضرورت پیش آ سکتی ہے، اور آپ کی جان بھی جا سکتی ہے۔

اسے معمولی درد سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حمزہ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔

اُس کے چہرے پر پہلی بار ہنسی نہیں تھی۔

صرف خاموشی،

فینگ نے رپورٹ اپنے ہاتھ میں لی تو اُس کا رنگ بھی اُڑ گیا۔

گرینی نے آہستہ سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

چند گھنٹے بعد جب درد کچھ کم ہوا تو ڈاکٹرز نے ضروری ہدایات کے ساتھ اُسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

گھر واپس آتے ہوئے گاڑی میں غیر معمولی خاموشی تھی۔

حمزہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

پھر سب کو ہنسانے کے لیے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر بول پڑا:

جلدی سے ڈاکٹر کو بلاؤ مجھے ایسے لگ رہا ہے، جیسے ابھی مجھے کڈنی اٹیک آ جائے گا۔

فینگ نے پوری سنجیدگی سے کہا،

"یہ کڈنی کو کب سے اٹیک آنے لگ گئے خیر اگر آ بھی گیا تو میں ہوں نا تجھے دفنانے کے لیے۔"

حمزہ بے اختیار ہنس پڑا۔

گرینی بھی ہلکا سا مسکرا دیں۔

لاہور

صبح کی اذان کے ساتھ ہی شاہینہ کی آنکھ کھل گئی۔ ہمیشہ کی طرح اُنہوں نے نماز ادا کی، پھر ناشتے کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔ چند ہی لمحوں بعد حذیفہ بھی نیند سے بیدار ہو گیا۔ بال بکھرے ہوئے، آنکھیں آدھی بند اور ہاتھ میں تکیہ لیے وہ سیدھا باورچی خانے میں پہنچا۔

"خالہ... پہلے چائے، پھر دنیا کے باقی کام۔"

شاہینہ ہنس پڑیں۔

"پہلے منہ تو دھو لو، ایسا لگ رہا ہے ابھی خواب سے سیدھے زمین پر اترے ہو۔"

اتنے میں ریان بھی دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے آیا۔ سفید شرٹ، سیاہ پینٹ اور گلے میں ٹائی دیکھ کر حذیفہ نے فوراً کہا،

"قسم سے! اگر مجھے نہ پتا ہوتا کہ تُو کال سینٹر جا رہا ہے تو میں سمجھتا آج تیرا نکاح ہے۔"

ریان نے مسکراتے ہوئے اُس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"جلدی ناشتہ کر، ورنہ تیرے حصے کے پراٹھے بھی میں کھا جاؤں گا۔"

ناشتے کی میز پر ہمیشہ کی طرح قہقہوں کا بازار گرم تھا۔ شاہینہ کبھی دونوں کو ڈانٹتیں اور کبھی خود ہی اُن کی باتوں پر ہنسنے لگتیں۔ حذیفہ نے اچانک ریان کی طرف دیکھ کر پوچھا،

"سچ سچ بتا... دفتر میں کوئی پسند تو نہیں آ گئی؟"

ریان نے پانی پیتے پیتے کھانسی شروع کر دی۔

"اللہ کا نام لے! صبح صبح کیا بکواس شروع کر دی؟"

حذیفہ نے شرارتی انداز میں آنکھ ماری۔

"میں نے صرف سوال پوچھا ہے، رنگ تو تمہارے اُڑ گئے ہیں۔"

شاہینہ نے ہنستے ہوئے کہا،

"تم دونوں اگر ایک دن لڑائی نہ کرو تو شاید سورج مغرب سے نکل آئے۔"

دوسری طرف،

لاہور کی ایک پرانی گلی میں واقع چھوٹے سے کرائے کے مکان کی کھڑکی سے صبح کی ہلکی ہلکی دھوپ اندر داخل ہو رہی تھی۔ گھر میں عجیب سی خاموشی تھی، ایسی خاموشی جو اُس گھر کی پہچان بن چکی تھی۔ نہ کسی کے قدموں کی آہٹ، نہ کسی کی آواز، نہ ناشتے کی خوشبو۔ صرف دیوار پر لگی ایک پرانی گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔

نور منہاج کی آنکھ حسبِ معمول الارم بجنے سے چند لمحے پہلے ہی کھل گئی۔ اُس نے چند لمحے چھت کو خاموشی سے دیکھا، پھر گہرا سانس لیا اور بستر سے اٹھ گئی۔ وضو کیا، نماز ادا کی اور سجدے میں کافی دیر تک روتی رہی۔

یا اللہ... میرے ماں باپ اس دنیا میں نہیں رہے، مگر تو آج بھی میرے ساتھ ہے۔ مجھے کبھی اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کرنا۔

سلام پھیرنے کے بعد اُس نے سامنے الماری پر رکھی اپنے والدین کی تصویر کو دیکھا۔ آہستہ سے تصویر اٹھائی، اس پر جمی گرد صاف کی اور مسکرا کر بولی،

امّی... آج بھی دیر نہیں کروں گی۔ آپ ہمیشہ کہتی تھیں کہ رزق کی تلاش میں نکلنے والا کبھی سست نہیں ہوتا۔

یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے ایک آنسو تصویر پر آگرا۔ اُس نے فوراً آنسو صاف کیا، تصویر واپس رکھی اور خود ہی مسکرا دی۔

"رونا منع ہے، نور... زندگی ابھی ختم نہیں ہوئی۔"

وہ باورچی خانے میں گئی۔ فریج کھولا تو اس میں صرف آدھی بوتل پانی، دو انڈے اور گزشتہ رات کی بچی ہوئی دال رکھی تھی۔ اُس نے دال گرم کی، ایک روٹی کے ساتھ خاموشی سے ناشتہ کیا، پھر برتن خود دھوئے۔ گھر میں کرنے والا اُس کے سوا کوئی تھا ہی نہیں۔

ناشتہ کرنے کے بعد اُس نے ایک پرانی ڈائری نکالی۔ ہر مہینے کی طرح اُس نے تنخواہ اور اخراجات کا حساب لکھنا شروع کیا۔

گھر کا کرایہ،

بجلی کا بل،

گیس کا بل،

راشن،

آخر میں اُس نے پیسے گنے اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی،

"چلو نور... اس مہینے بھی بھوکا نہیں مرنا پڑے گا۔"

یہ جملہ مذاق میں کہا گیا تھا، مگر اس کے پیچھے ایک تلخ حقیقت چھپی ہوئی تھی۔

تیار ہو کر وہ دفتر جانے کے لیے نکلی۔ دروازے کو تالا لگاتے وقت اُس نے ہمیشہ کی طرح ایک نظر اپنے گھر پر ڈالی۔ وہ جانتی تھی کہ شام کو واپس آئے گی تو یہی خاموشی اُس کا استقبال کرے گی۔

گلی سے نکلتے ہوئے ایک پڑوسن نے آواز دی،

"بیٹی، ابھی تک اکیلی رہتی ہو؟"

نور نے مسکرا کر جواب دیا،

"جی خالہ، ابھی تک تو اللہ ہی میرا ہمسفر ہے۔"

پڑوسن نے ہمدردی سے کہا،

"اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔"

نور نے ادب سے آمین کہا اور آگے بڑھ گئی۔

دفتر پہنچتے ہی ہمیشہ کی طرح اُس نے سب سے پہلے اپنی نشست صاف کی، کمپیوٹر چلایا اور کام میں مصروف ہو گئی۔ چند ہی لمحوں بعد عائشہ اُس کے پاس آئی۔

"نور، ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھ۔"

"تم ہمیشہ اتنی مضبوط کیسے رہتی ہو؟ کبھی تمہیں تنہائی نہیں ستاتی؟"

نور چند لمحے خاموش رہی، پھر کمپیوٹر کی سکرین پر نظریں جمائے بولی،

تنہائی تو ہر روز رلاتی ہے، عائشہ... مگر آنسو پونچھنے والا کوئی نہ ہو تو انسان خود ہی مضبوط بننا سیکھ جاتا ہے۔

عائشہ بھی خاموش ہو گئی۔

دوپہر کے کھانے کے وقفے میں سب لوگ ہنسی مذاق کر رہے تھے، مگر نور حسبِ معمول خاموش بیٹھی تھی۔ اُس کی نظریں کھڑکی سے باہر تھیں، جیسے وہ کسی کو ڈھونڈ رہی ہو... حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اب کوئی آنے والا نہیں۔

اسی دوران ریان دور سے گزرا۔ اُس نے دیکھا کہ نور آج بھی اکیلی بیٹھی ہے، مگر اُس نے حسبِ عادت صرف سلام کیا اور بغیر کسی غیر ضروری گفتگو کے اپنے دوستوں کے ساتھ جا بیٹھا۔

نور نے دل ہی دل میں سوچا،

"عجیب لڑکا ہے"

" نہ فضول باتیں کرتا ہے... نہ بے تکلف بننے کی کوشش"

"یا تو بہت سمجھدار ہے"

"یا پھر واقعی اچھا انسان۔"

اُس نے فوراً اپنے ہی خیال کو جھٹک دیا۔

"نہیں نور... لوگوں کو اتنی جلدی اچھا سمجھنے کی غلطی دوبارہ مت کرنا۔"

شام کو چھٹی ہوئی تو وہ حسبِ معمول بس میں بیٹھ کر واپس اپنے گھر آ گئی۔ دروازہ کھولا تو ہمیشہ کی طرح اندھیرا اُس کا منتظر تھا۔

اُس نے بتی جلائی، دوپٹہ کرسی پر رکھا اور پورے گھر پر ایک نظر ڈالی۔

خاموشی،

وہی خاموشی،

جس کی اب اُسے عادت ہو چکی تھی۔

وہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔

نور نے آہستہ سے کہا،

"ابا... امّی... لوگ کہتے ہیں وقت ہر زخم بھر دیتا ہے"

" شاید لوگ سچ کہتے ہوں"

"کیونکہ اب درد تو ہوتا ہے"

"مگر آنسو کم آتے ہیں۔"

وہ خاموشی سے مسکرائی، آستین سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

زندگی کسی کا انتظار نہیں کرتی،

اور نور منہاج نے بھی بہت پہلے انتظار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

اگلے چند ہفتے خاموشی سے گزر گئے۔ دفتر میں ریان اور نور کی گفتگو صرف کام تک محدود رہتی۔ اگر کسی منصوبے پر بات کرنا ضروری ہوتی تو دونوں مختصر الفاظ میں بات کرتے، پھر فوراً اپنے اپنے کام میں

مصروف ہو جاتے۔ نہ غیر ضروری ہنسی مذاق، نہ رات گئے پیغامات، نہ ہی ایسی بے تکلفی جو شریعت کی حدود سے تجاوز کرے۔

ایک دن دوپہر کے وقت کال سینٹر میں اچانک نظامِ کمپیوٹر میں خرابی آگئی۔ تمام ملازمین کو کچھ دیر انتظار کرنے کا کہا گیا۔ کسی نے موبائل نکال لیا، کوئی گپ شپ میں مصروف ہو گیا اور چند لڑکے لڑکیاں مل کر قہقہے لگانے لگے۔

عائشہ نے نور کو کہنی ماری۔

"چل نا، سب بیٹھے ہیں، تھوڑی دیر باہر چلتے ہیں۔"

نور نے اُس کی طرف دیکھا، پھر خاموشی سے بولی،

"نہیں... مجھے یہاں ہی ٹھیک لگ رہا ہے۔"

اسی دوران ایک ملازم نے ریان کو بھی آواز دی۔

"ریان! آئیں، آج کام تو ہے نہیں، تھوڑی محفل جما لیتے ہیں۔"

ریان مسکرا کر اُن کے قریب آیا، مگر بیٹھنے کے بجائے بولا،

"معاف کیجیے، میں تھوڑی دیر باہر جانا چاہتا ہوں۔۔"

چند لمحوں کے لیے وہاں خاموشی چھا گئی۔

کسی نے ہنستے ہوئے کہا،

"خیریت تو ہے نا؟"

ریان نے نہایت سکون سے جواب دیا،

"جی بلکل!۔"

یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

نور نے پہلی بار کسی نوجوان کو دفتر کے ماحول سے متاثر ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

کال سینٹر کے بلکل سامنے ایک مسجد تھی، ریان باہر گھومنے نہیں بلکہ وہاں نماز پڑھنے گیا تھا۔

نماز کے بعد ریان واپس آیا تو نور نے اسے مسجد سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔

ریان اندر آیا تو،

اُسی وقت ایک معمر صفائی کرنے والے ملازم سے غلطی سے پانی کی بالٹی گر گئی۔ چند نوجوان ملازمین اُس پر ہنسنے لگے۔

"بابا جی! اب ریٹائرمنٹ لے لیں، یہ کام آپ سے نہیں ہوتا۔"

بوڑھے شخص نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

ریان فوراً اپنی نشست سے اٹھا، بغیر کچھ کہے کپڑا اٹھایا اور خود فرش صاف کرنے لگا۔

بوڑھے ملازم نے گھبرا کر کہا،

"بیٹا، رہنے دو... یہ میرا کام ہے۔"

ریان نے ادب سے جواب دیا،

رزقِ حلال کمانے والا کوئی کام چھوٹا نہیں ہوتا، چچا۔ آج آپ کی جگہ میں کر دیتا ہوں، کل میری جگہ کوئی اور کر دے گا۔

نور خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ اچھا انسان وہ نہیں جو صرف اچھی باتیں کرے، بلکہ وہ ہے جس کا کردار اُس کی باتوں کی گواہی دے۔

شام کو دفتر سے نکلتے ہوئے عائشہ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"نور... لگتا ہے تمہاری رائے بدل رہی ہے۔"

نور نے حیرانی سے پوچھا،

"کس بارے میں؟"

"اسی ریان کے بارے میں۔"

نور نے چند لمحے خاموش رہ کر جواب دیا،

"میں کسی انسان کے دل کا حال نہیں جانتی"

"لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ کردار کبھی زبان سے نہیں، عمل سے پہچانا جاتا ہے۔"

ویسے بھی مرد کا عورت کو ٹریپ کرنے کا سب سے پہلا اور سب سے مشہور کام اس کے سامنے اچھا بننا اور اسے حسین خواب دیکھانا ہے۔

وہ چند قدم آگے بڑھی، پھر آہستہ سے بولی،

عائشہ نے نور کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

شاید۔

دیکھتے ہی دیکھتے وقت گزر گیا۔

لاہور کی صبح آج کچھ مختلف تھی۔ ہوا میں وہی تازگی تھی، سورج بھی حسبِ معمول طلوع ہوا تھا، مگر شاہینہ کے گھر کا ماحول پہلے جیسا نہ تھا۔ ہر طرف کپڑے، کتابیں، جوتے اور ضروری سامان بکھرا ہوا تھا۔ حذیفہ تمام امتحان کامیاب کرنے کے بعد اب اپنی چھ ماہ کی تربیت کے لیے پی ایم اے کاکول جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے کپڑے تہہ کرتا، کبھی فائل چیک کرتا اور کبھی کسی چیز کی تلاش میں پورا کمرہ اُلٹ پلٹ کر دیتا۔ اُدھر شاہینہ بار بار اُس کے سامان میں کچھ نہ کچھ رکھ دیتیں۔ کبھی گرم کپڑے، کبھی دوائیں اور کبھی کھانے پینے کی چیزیں۔ حذیفہ ہر بار مسکرا کر کہتا، خالہ! میں چھ ماہ کی تربیت پر جا رہا ہوں، ہجرت کر کے نہیں جا رہا۔" شاہینہ اُس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتیں اور کہتیں، ماں جیسا دل ہو تو بیٹے کا ہر سفر لمبا لگتا ہے۔

اسی دوران گھر کے دروازے پر گاڑی آکر رکی۔ روبینہ (حذیفہ کی ماں) اور اُن کے شوہر (حذیفہ کے بابا) بھی اپنا سامان لے کر لاہور منتقل ہو چکے تھے۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی گلے لگ گئیں۔ برسوں کی دوری چند لمحوں میں سمٹ گئی۔ گھر میں ایک بار پھر اپنائیت کی خوشبو پھیل گئی۔ روبینہ نے ہنستے ہوئے کہا، "اب دیکھنا، یہ گھر پہلے سے زیادہ آباد رہے گا۔" شاہینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "بس اللہ نظرِ بد سے بچائے۔" دونوں بہنیں باتوں میں مصروف ہو گئیں جبکہ حذیفہ اور ریان سامان اندر منتقل کرنے لگے۔

شام ڈھلنے لگی تو سب لوگ بیٹھک میں جمع تھے۔ میز پر موبائل رکھا تھا اور چند ہی لمحوں بعد پیرس سے ڈاکٹر عنایہ کی ویڈیو کال آ گئی۔ کال ملتے ہی سب کے چہروں پر خوشی آ گئی۔ حذیفہ نے بے صبری سے فون اٹھایا۔

"السلام علیکم آپی"

دوسری طرف عنایہ مسکرا رہی تھی، مگر آنکھوں میں اپنے گھر والوں کو دیکھنے کی بے چینی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"وعلیکم السلام، میرے بہادر بھائی! تیاری مکمل ہو گئی؟"

حذیفہ نے مصنوعی رعب سے سینہ چوڑا کیا۔

"بالکل! اب تو بس پاکستان کی فوج میرا انتظار کر رہی ہے۔"

یہ سنتے ہی سب ہنس پڑے۔ عنایہ بھی ہنسیں، پھر اچانک اُن کی آواز نرم ہو گئی۔

حذیفہ... ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ یونیفارم صرف عزت نہیں ہوتی، ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ کبھی اپنے رب سے غافل مت ہونا، نماز کسی حال میں نہ چھوڑنا، اور ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دینا۔

حذیفہ نے سر جھکا کر کہا،

"وعدہ کرتا ہوں آپی۔"

عنایہ چند لمحے خاموش رہیں، جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر الفاظ ساتھ نہ دے رہے ہوں۔

"اور... اپنا خیال رکھنا۔"

حذیفہ مسکرا تو دیا، مگر اُس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔

"آپ بھی اپنا خیال رکھنا... اتنی دور ہیں، پتہ نہیں اب دوبارہ کب ملنا ہو۔"

عنایہ نے مسکراتے ہوئے اپنے آنسو چھپا لیے۔

چھ ماہ گزر جانے دو، ان شاء اللہ، تمھاری پاسنگ پریڈ پر تمھارے سامنے ہوں گی۔ پھر تمہیں اسی وردی میں دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی مجھے ہو گی۔

اتنے میں ریان بھی فون کے قریب آ گیا۔

"السلام علیکم آپی"

"وعلیکم السلام ریان۔"

عنایہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"میرا ایک بھائی جا رہا ہے، اب دوسرا بھائی گھر کا خیال رکھے گا۔"

ریان نے فوراً سنجیدگی سے جواب دیا،

"جب تک میں ہوں، خالہ کو کسی چیز کی فکر نہیں ہو گی۔"

عنایہ نے اطمینان سے سر ہلایا۔

"مجھے تم پر بھروسہ ہے۔"

چند لمحے سب نے ہنستے بولتے ایک دوسرے سے باتیں کیں، پھر کال ختم ہو گئی۔ مگر کال ختم ہونے کے بعد بھی کچھ دیر تک کوئی کچھ نہ بولا۔ بعض اوقات خاموشی بھی بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔

اگلی صبح حذیفہ کی روانگی کا وقت آ پہنچا۔ فجر کی نماز کے بعد اُس نے گھر کے ہر فرد سے دعا لی۔ شاہینہ نے اُس کے ماتھے کو چوما اور بار بار اللہ کے سپرد کرتی رہیں۔ روبینہ نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا،

"ہمیشہ سچ کا ساتھ دینا، چاہے پوری دنیا مخالفت میں کیوں نہ کھڑی ہو جائے۔"

گاڑی دروازے پر کھڑی تھی۔

حذیفہ نے آخری بار گھر کی طرف دیکھا، پھر ریان کے قریب آیا۔ دونوں کچھ لمحے خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نہ مذاق تھا، نہ ہنسی... صرف جدائی کا احساس تھا۔

آخر حذیفہ نے آہستہ سے کہا،

"یار... اگر کبھی میری ہمت ٹوٹ گئی تو؟"

ریان نے اُس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

تو یاد رکھنا... مومن کی طاقت صرف اُس کے بازوؤں میں نہیں ہوتی، اُس کا اصل سہارا اللہ پر یقین ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں ہتھیار ختم ہو سکتے ہیں، لیکن جس کا توکل اللہ پر ہو، اُس کی ہمت کبھی ختم نہیں ہوتی۔

حذیفہ کی آنکھوں سے ایک آنسو نکل آیا۔ اُس نے فوراً ریان کو گلے لگا لیا۔

"میرے لیے دعا کرنا۔"

ریان نے بھی اُسے مضبوطی سے گلے لگا لیا۔

"ہر نماز میں۔"

دونوں کافی دیر تک خاموش کھڑے رہے، پھر حذیفہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ گلی سے نکل گئی۔ ریان اُس وقت تک اُسے دیکھتا رہا جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

اُدھر کال سینٹر میں بھی وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا۔ نور منہاج حسبِ معمول اپنی نشست پر بیٹھی کام کر رہی تھی، مگر نہ جانے کیوں آج اُس کی نظریں بار بار ریان کی خالی نشست کی طرف اٹھ جاتیں۔ اُسے معلوم تھا کہ ریان آج چھٹی پر ہے کیونکہ وہ حذیفہ کو رخصت کرنے گیا ہے۔

وہ خود پر ہلکا سا مسکرائی۔

" مجھے کیا فرق پڑتا ہے"

مگر دل نے فوراً جواب دیا،

"اگر فرق نہیں پڑتا... تو بار بار اُس کی نشست کی طرف کیوں دیکھ رہی ہو؟"

نور نے نظریں جھکا لیں۔

یہ کوئی فلمی محبت نہیں تھی۔

یہ اُس کردار کے لیے پیدا ہونے والا احترام تھا، جو آہستہ آہستہ دل کے کسی کونے میں جگہ بنا رہا تھا۔

مگر اُس نے فوراً دل کو سمجھایا۔

نور... یاد رکھنا، نامحرم کے لیے دل میں جگہ بنانا آسان ہے، مگر اپنے نفس کو اللہ کے حکم کے تابع رکھنا ہی اصل امتحان ہے۔ اگر قسمت میں کوئی رشتہ لکھا ہو گا تو وہ حلال راستے سے آئے گا، اور اگر نہیں لکھا

تو کسی خواہش کے پیچھے اپنے رب کی ناراضی مول لینا خسارہ ہے۔

یہ سوچ کر اُس نے ایک گہرا سانس لیا، کمپیوٹر کی طرف دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

شاید،

یہ محبت کی ابتدا تھی۔

مگر اس محبت سے پہلے اُس کے دل میں اللہ کا خوف موجود تھا، اور یہی خوف اُس کے کردار کی اصل خوبصورتی تھا۔

پیرس

پیرس کی سرد صبح ہمیشہ کی طرح مصروف تھی۔ ہسپتال کی راہداریاں ڈاکٹروں، نرسوں اور مریضوں سے بھری ہوئی تھیں، مگر ڈاکٹر عنایہ کا ذہن آج اپنے کام پر پوری طرح مرکوز نہیں تھا۔ کئی دن گزر چکے تھے، لیکن اُس "ہیلمٹ والے مریض" کا خیال اب بھی بار بار اُس کے ذہن میں آ جاتا۔ کبھی اُس کی بے تکی باتیں یاد آتیں، کبھی اُس کا بچوں جیسا انداز، کبھی اُس کی خاموشی، اور کبھی وہ سبز نگوں والی انگوٹھی۔ نہ جانے کیوں دل بار بار یہی کہتا تھا کہ یہ شخص اتنا سادہ بھی نہیں جتنا خود کو ظاہر کرتا ہے۔

مریضوں کو دیکھنے کے بعد عنایہ سیدھی ریکارڈ روم کی طرف چلی گئیں۔ وہاں موجود عملے نے احترام سے سلام کیا۔ عنایہ نے چند لمحے سوچنے کے بعد آہستہ سے کہا، "چند ماہ پہلے ایک مریض ایمرجنسی میں آیا تھا۔ اُس نے ہر وقت ہیلمٹ پہنا ہوا تھا، کمر کے شدید درد کی شکایت تھی۔ اگر اُس دن کا ریکارڈ مل جائے تو ذرا دکھا دیجیے۔"

ریکارڈ روم کے ملازم نے کمپیوٹر میں تاریخ تلاش کرنا شروع کی۔ چند لمحوں بعد اُس نے ایک فائل نکالی اور عنایہ کی طرف بڑھا دی۔

"شاید یہی مریض ہے، ڈاکٹر۔"

عنایہ نے بے اختیار فائل اپنے ہاتھ میں لے لی۔ نہ جانے کیوں اُن کے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ تیز ہو گئی تھی۔ اُنہوں نے آہستہ آہستہ صفحے پلٹے۔ عمر... طبی معائنہ... ادویات... ابتدائی تشخیص

پھر اُن کی نظر نام پر جا کر ٹھہر گئی۔

"حمزہ"

بس اتنا ہی،

نہ والد کا نام، نہ خاندانی نام، نہ کوئی اور تفصیل۔

عنایہ نے حیرانی سے دوبارہ پوری فائل دیکھی۔

"صرف حمزہ...؟"

ریکارڈ روم کے ملازم نے جواب دیا،

جی ڈاکٹر، اُس دن مریض نے خود ہی اندراج کروایا تھا۔ شاید جلدی میں مکمل معلومات درج نہیں کروا سکا۔ اور یہ مریض چند دن پہلے دوبارہ آیا تھا، اسے "سی کے ڈی" ڈائیگنوز ہوا ہے۔

عنایہ نے فائل بند کر دی، مگر اُن کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی، مگر چہرے پر پریشانی بھی۔

" تو ہیلمٹ والے مریض کا نام حمزہ ہے"

وہ آہستہ سے خود کلامی کرتے ہوئے ریکارڈ روم سے باہر نکل آئیں۔

چند گھنٹوں بعد دوپہر کا وقت تھا۔ ہسپتال کے پچھلے حصے میں حسبِ معمول حمزہ جھاڑو ہاتھ میں لیے راہداری صاف کر رہا تھا۔ کبھی وہ زیرِ لب کچھ گنگناتا، کبھی خود ہی مسکرا دیتا۔ اُسے خبر بھی نہ تھی کہ آج اُس کے بارے میں ایک راز کھل چکا ہے۔

"حمزہ"

اچانک کسی نے آواز دی۔

یہ پہلا موقع تھا جب کسی نے اُس کا اصل نام لے کر پکارا تھا۔

حمزہ کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رک گئے۔

وہ آہستہ آہستہ پلٹا۔

سامنے ڈاکٹر عنایہ کھڑی تھیں۔

حمزہ نے دل ہی دل میں کہا،

"یا اللہ... یہ نام تک کیسے پہنچ گئیں؟"

مگر اگلے ہی لمحے اُس نے اپنے چہرے پر معصومیت سجا لی۔

"جی باجی؟"

عنایہ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"تو آخر کار تمہارا نام بھی معلوم ہو ہی گیا۔"

حمزہ نے حیران بننے کی اداکاری کی۔

"نام؟میرا؟"

"جی ہاں، ریکارڈ روم سے پتا چل گیا۔"

حمزہ نے دل میں لمبی سانس لی۔

شکر تھا،

صرف "حمزہ" لکھوایا تھا۔

عنایہ نے ہلکے لہجے میں کہا،

"ویسے... تمہارا نام بہت اچھا ہے۔"

حمزہ نے فوراً شرارتی انداز میں جواب دیا،

"نام اچھا ہے یا بندہ بھی؟"

عنایہ نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا،

"بندہ ابھی زیرِ تفتیش ہے۔"

حمزہ بے اختیار ہنس پڑا۔

"یعنی ابھی فیصلہ محفوظ ہے؟"

"بالکل۔"

چند لمحے دونوں خاموش رہے۔

پھر نہ جانے کیوں عنایہ کے چہرے کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگی۔

وہ کچھ دیر زمین کو دیکھتی رہیں، پھر دھیمی آواز میں بولیں،

تمھیں "سی کے ڈی" ہے؟

جی باجی!(وہ مسکرا کر بولا)

"جانتے ہو"(عنایا بولی)

"میرے ایک کزن کا نام بھی حمزہ تھا۔"

حمزہ نے پہلی بار اُن کے لہجے میں چھپی اداسی محسوس کی۔

اُس نے مذاق کرنے کے بجائے خاموشی سے پوچھا،

"پھر...؟"

عنایہ نے دور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا،

بچپن میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ ہر عید، ہر خوشی، ہر خاندانی تقریب میں ساتھ ہوتے تھے۔ پھر زندگی نے ایسے راستے بدل دیے کہ آہستہ آہستہ رابطے ختم ہوتے گئے۔

اُنہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

"اب تو یہ بھی نہیں معلوم"

"وہ کہاں ہے"

"کیسا ہے"

"زندہ بھی ہے یا نہیں"

حمزہ خاموشی سے اُنہیں دیکھتا رہا۔

عنایہ کی آنکھوں میں نمی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

وہ ہلکا سا مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں،

"عجیب بات ہے نا؟"

"کبھی کبھی صرف ایک نام بھی انسان کو برسوں پیچھے لے جاتا ہے۔"

حمزہ نے جھاڑو ایک طرف رکھا اور نہایت سنجیدگی سے کہا،

باجی! آپ کہے تو میں اپنا نام بدل لیتا ہوں تاکہ وہ آپ کو یاد نہ آئیں۔

عنایہ نے اُس کی طرف دیکھا۔

اور حمزہ،

وہ دل ہی دل میں صرف ایک دعا مانگ رہا تھا۔

"یااللہ... ایک دن ایسا ضرور آئے کہ یہ میرے نام کے ساتھ میری حقیقت کو بھی قبول کر لے۔"

پیرس کی راتیں عجیب خاموش ہوتی تھیں۔ بلند و بالا عمارتوں کی کھڑکیوں میں جلتی روشنیاں یوں محسوس ہوتیں جیسے ہر کمرے کے اندر ایک الگ کہانی سانس لے رہی ہو۔ انہی عمارتوں میں سے ایک وہ بھی تھی جہاں ڈاکٹر عنایہ گزشتہ چند ماہ سے رہ رہی تھیں۔ ہسپتال سے واپسی کے بعد وہ زیادہ تر اپنے

کمرے میں رہتیں، کتابیں پڑھتیں یا اگلے دن کی تیاری کرتیں۔ اُنہیں بالکل اندازہ نہ تھا کہ قسمت ایک بار پھر اُن کی زندگی کا رخ خاموشی سے بدلنے والی ہے۔

اُدھر حمزہ اسفند اپنی گاڑی میں بیٹھا اُس عمارت کے سامنے کافی دیر تک خاموشی سے دیکھتا رہا۔ چند دن پہلے ہی اُسے معلوم ہوا تھا کہ عنایہ اکیلی رہتی ہیں۔ اُس کے دل میں بار بار یہی خیال آتا تھا کہ پردیس میں ایک اکیلی لڑکی کی حفاظت کرنے والا کوئی ہونا چاہیے، مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اُس نے اپنی اصل شناخت ظاہر کر دی تو شاید عنایہ اُس سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں۔

چند دن بعد اُس نے خاموشی سے اُسی عمارت میں ایک فلیٹ خرید لیا۔

نہ کسی کو خبر ہوئی،

نہ عنایہ کو۔

حمزہ نے جان بوجھ کر وہی حلیہ اختیار کیا جو اُس رات اختیار کیا تھا جب اُس نے عنایہ کا بیگ واپس کیا تھا۔ سیاہ پینٹ، سفید شرٹ، اُس کے اوپر لمبا سیاہ کوٹ، آنکھوں پر چشمہ اور چہرے پر ماسک۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"ڈان... آج سے آپ کی حفاظت کا ذمہ میرا۔"

چند دن گزر گئے۔

حمزہ کبھی سیڑھیوں میں نظر آجاتا، کبھی پارکنگ میں، کبھی لفٹ کے قریب، مگر ہمیشہ اتنی دیر کے لیے کہ عنایہ صرف اُسے دیکھ سکیں، پہچان نہ سکیں۔

ایک رات تقریباً دس بج رہے تھے۔

عنایہ ابھی ابھی ہسپتال سے واپس آئی تھیں۔ سخت تھکن کے باوجود اُنہوں نے وضو کیا، نماز ادا کی اور باورچی خانے میں جا کر چائے بنانے لگیں۔

اچانک،

Knock,

Knock,

Knock,

دروازے پر دستک ہوئی۔

عنایہ نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"اس وقت...؟"

وہ احتیاط سے دروازے کے قریب گئیں چہرہ نقاب سے ڈھکا ہوا، اور پہلے دروازے کے سوراخ سے باہر دیکھا۔

سامنے ایک لمبے قد کا شخص کھڑا تھا۔

سیاہ لمبا کوٹ،

چشمہ،

چہرے پر ماسک،

عنایہ نے دروازہ آہستہ سے کھولا، مگر زنجیر نہیں اتاری۔

"جی؟"

دوسری طرف کھڑے شخص نے قدرے بھاری آواز میں کہا؛

"معذرت چاہتا ہوں... میں سامنے والے فلیٹ میں ابھی منتقل ہوا ہوں۔"

"کیا آپ کے پاس تھوڑی سی چینی ہو گی؟"

عنایہ نے چند لمحے اُسے غور سے دیکھا۔

"جی... ایک منٹ۔"

وہ اندر گئیں اور ایک چھوٹے برتن میں چینی لے آئیں۔

پھر بول پڑی ویسے آپ بھی اردو بول سکتے ہیں؟

جی! کوئی اور بھی بولتا ہے کیا؟

جی شاید، جیسے ہی اُنہوں نے برتن آگے بڑھایا، اُن کی نظر اُس شخص کے دائیں ہاتھ پر پڑی۔

انگوٹھی،

اور اُس میں جڑا ہوا وہی سبز نایاب پتھر،

عنایہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

اُنہوں نے فوراً اُس شخص کے ہاتھ کی طرف دوبارہ دیکھا۔

نہیں،

غلطی کا امکان نہیں تھا۔

یہ وہی انگوٹھی تھی۔

وہ بے اختیار بول اٹھیں،

"ایک منٹ"

حمزہ کا دل زور سے دھڑکا۔

عنایہ نے آہستہ سے کہا،

" آپ"

"وہی ہیں نا؟"

حمزہ نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے پوچھا،

"کون؟"

" جنہوں نے اُس رات میرا بیگ واپس کیا تھا۔"

چند لمحوں کے لیے دونوں کے درمیان خاموشی چھاگئی۔

حمزہ جانتا تھا،

اگر وہ ایک لمحہ بھی ہچکچایا تو عنایہ سب سمجھ جائیں گی۔

اُس نے فوراً لہجہ سرد کر لیا۔

"آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔"

عنایہ نے دوبارہ انگوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

" غلط فہمی نہیں"

"میں یہ انگوٹھی پہچانتی ہوں۔"

حمزہ نے بے زاری سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"دنیا میں ایک جیسی انگوٹھیاں ہزاروں ہوتی ہیں، ڈاکٹر صاحبہ۔"

"ہر چیز کو کہانی مت بنائیے۔"

عنایہ اُس کے لہجے پر چونک گئیں۔

"میں نے تو صرف"

حمزہ نے بات کاٹ دی۔

"آپ نے چینی دے دی، شکریہ۔"

"اب اگر اجازت ہو تو مجھے آرام کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ مڑنے لگا۔

عنایہ نے آواز دی،

"سنیے"

حمزہ رکا، مگر پیچھے نہیں مڑا۔

"کم از کم اپنا نام تو بتا دیجیے۔"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اُس نے مختصر جواب دیا،

"نام جان کر کیا کریں گی؟"

"پڑوسی ہوں"

"بس اتنا کافی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے فلیٹ کی طرف چل دیا۔

عنایہ کافی دیر تک دروازے پر کھڑی اُسے جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔

پھر دروازہ بند کیا، صوفے پر بیٹھیں اور ہلکی سی ناراضی سے خود کلامی کی،

"کتنا بد تمیز انسان ہے"

چند لمحے سوچنے کے بعد اُنہوں نے منہ بنایا اور آہستہ سے کہا،

"نہیں"

"بد تمیز بھی نہیں"

"یہ تو پورا"

وہ ایک لمحے کو رُکیں، پھر بے اختیار مسکرا دیں۔

"خرڑوس ہے"

اُدھر اپنے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی حمزہ نے ماسک اتارا، لمبی سانس لی اور دیوار سے ٹیک لگا کر ہنس پڑا۔

مگر اگلے ہی لمحے اُس کی نظریں عنایہ کے فلیٹ کی سمت اٹھ گئیں۔

دل ہی دل میں اُس نے دعا کی،

یا اللہ... مجھے صرف اتنی طاقت دینا کہ میں اس کی حفاظت کر سکوں، چاہے اسے کبھی یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے دروازے کے سامنے رہنے والا دراصل وہی ہیلمٹ والا مریض ہے۔

آج پیرس کی شام غیر معمولی طور پر خاموش تھی۔ آسمان پر سرمئی بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا درختوں کے پتوں کو آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی۔ ہسپتال سے واپسی کے بعد ڈاکٹر عنایہ ہمیشہ کی طرح اپنی عمارت کی طرف روانہ ہو گئی تھیں، جبکہ دوسری طرف حمزہ اسفند اپنی بالکونی میں کھڑا کافی دیر تک دور جاتے ہوئے اُنہیں دیکھتا رہا۔ اب اُس کی زندگی کا ہر دن ایک ہی دعا سے شروع ہوتا وہ اسلام سے دور رہنے والا لڑکا اب اسلام کو سمجھنے لگا تھا، نماز پڑھنے لگ تھا ہر نماز کے بعد جب وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا تو اس کی دعا ایک ہی دعا پر ختم ہوتا تھا۔ "یا اللہ! اگر عنایہ میری قسمت میں ہے تو اُسے میرے لیے حلال کر دے، اور اگر نہیں تو میرے دل سے اُس کی محبت نکال دے، مگر میرے ایمان کو سلامت رکھنا، کیونکہ یہ ایمان مجھے بہت مشکل سے ملا ہے۔ میں کوئی کامل انسان نہیں ہوں لیکن میں نے قرآن مجید میں پڑھا تھا کہ آپ نے مردوں کو عورتوں کی حفاظت کے لیے پیدا کیا ہے، میرے لیے اِس سے بڑی خوش نصیبی اور کوئی نہیں ہو گی کہ مجھے اس کی حفاظت کے لیے چنا جائے۔" وہ جانتا تھا کہ محبت کا سب سے پاکیزہ راستہ نکاح ہے، اسی لیے اُس نے کبھی عنایہ سے اپنی محبت کا اظہار تک نہیں کیا تھا۔

اگلی صبح حمزہ حسبِ معمول ہسپتال پہنچا۔ کبھی صفائی کے بہانے راہداریوں میں گھومتا، کبھی کینٹین میں کام کرتا، مگر اب اُس کی نظریں صرف عنایہ کو دیکھنے کے لیے نہیں ہوتیں، بلکہ اُس کی حفاظت کے لیے ہر وقت چوکنا رہتیں۔ دوسری طرف عنایہ بھی اب اُس "خڑوس پڑوسی" کی موجودگی کی عادی ہو

چکی تھیں، اگرچہ زبان سے وہ ہمیشہ اُسے خرّوس ہی کہتیں۔ اُنہیں معلوم نہ تھا کہ یہی خاموش آدمی اُن کی ہر آہٹ پر نظر رکھتا ہے۔

دوپہر ڈھل رہی تھی کہ اچانک حمزہ کے موبائل پر ایک نام نمودار ہوا۔

"جمی"

کئی لمحوں تک وہ سکرین کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اُس نے کال کاٹ دی۔

چند ہی لمحوں بعد دوبارہ کال آئی۔

پھر تیسری بار،

آخر کار اُس نے فون اٹھایا، مگر آواز پہلے جیسی نرم نہ تھی۔

"کیا چاہیے تمہیں؟"

دوسری طرف سے کچھ لمحے خاموشی رہی، پھر جمی کی بھاری آواز سنائی دی۔

"حمزہ... میں صرف ایک بار ملنا چاہتی ہوں۔"

حمزہ نے بے زاری سے آنکھیں بند کر لیں۔

"پھر؟ تم جانتی ہو نا! ہمارے درمیان اب کوئی بات باقی نہیں رہی۔"

جمی کی آواز میں غرور نہیں تھا۔

صرف شکست تھی۔

"مجھے معلوم ہے... لیکن یہ آخری ملاقات ہو گی۔"

حمزہ خاموش رہا۔

جمی نے دوبارہ کہا،

"میں تم سے کچھ مانگنے نہیں آرہی... نہ محبت، نہ رشتہ، نہ معافی۔ بس... ایک آخری بات کرنی ہے۔"

حمزہ نے سرد لہجے میں جواب دیا،

جمی، کچھ رشتے وقت کے ساتھ ختم نہیں ہوتے... وہ انسان کے غلط فیصلوں سے ختم ہو جاتے ہیں۔ اور ہمارا رشتہ اُس دن ختم ہو گیا تھا، جس دن تم نے اعتماد توڑا۔

دوسری طرف سے ہلکی سی سسکی سنائی دی۔

"پھر بھی... صرف دس منٹ۔"

حمزہ نے آسمان کی طرف دیکھا، گہرا سانس لیا اور بولا،

"یہ ہماری آخری ملاقات ہو گی۔ اس کے بعد نہ تم مجھے ڈھونڈو گی، نہ میں تمہیں۔"

"کل شام...۔"

یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔

فون بند ہوتے ہی اُس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا۔

دل عجیب بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

شام کو فینگ اُس کے فلیٹ میں آیا تو دیکھا حمزہ غیر معمولی خاموش بیٹھا ہے۔

"کیا ہوا؟"

حمزہ نے پوری بات اُسے بتادی۔

فینگ کا چہرہ فوراً سنجیدہ ہو گیا۔

"میرا دل کہہ رہا ہے... تمہیں نہیں جانا چاہیے۔"

حمزہ نے حیرانی سے پوچھا،

"کیوں؟"

فینگ کھڑکی کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔

"پتہ نہیں... لیکن بعض دفعہ دل ایسی بات محسوس کرلیتا ہے جو عقل نہیں سمجھ سکتی۔"

حمزہ ہلکا سا مسکرایا۔

"میں کسی محبت کے لیے نہیں جارہا، فینگ۔"

"میں صرف ایک باب ہمیشہ کے لیے بند کرنے جارہا ہوں۔"

فینگ نے اُس کی طرف مڑ کر دیکھا۔

"بس ایک بات یاد رکھنا"

"اگر ماضی خود چل کر واپس آئے تو ہمیشہ ضروری نہیں کہ وہ معافی مانگنے آیا ہو"

" کبھی کبھی وہ انسان کا مستقبل برباد کرنے بھی آتا ہے۔..."

حمزہ چند لمحے خاموش رہا۔

نہ جانے کیوں،

آج پہلی بار اُس کے دل میں ایک عجیب ساخوف پیدا ہوا تھا۔

ایسا خوف،

جس کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی،

اور شاید،

یہ آنے والے طوفان کی پہلی آہٹ تھی۔

اگلے دن پیرس کی فضا غیر معمولی طور پر پر سکون تھی۔ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، مگر حمزہ اسفند کے دل میں ایک عجیب سا بوجھ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آج وہ اپنے ماضی کے اُس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کرنے جا رہا ہے جس نے کبھی اُس کی اور جمی کی زندگی کو شدید اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اُس نے وضو کیا، دو رکعت نفل ادا کیے اور دیر تک دعا مانگتا رہا۔ یہ وہی حمزہ تھا جسے اسلام سے چِڑ تھی، مگر غیر محرم کی محبت نے اسے بدل دیا تھا۔ اس نے دعا مانگی، "یا اللہ! میرے دل کو ہر اُس چیز سے پاک کر دے جو تجھے پسند نہیں، اور اگر آج کا یہ فیصلہ میرے حق میں بہتر ہے تو اسے آسان فرما۔ مجھے کسی ایسے قدم سے بچا لینا جو میرے دین، میرے کردار یا کسی بے گناہ کی زندگی کو نقصان پہنچائے۔" دعا کے بعد اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور خاموشی سے گھر سے نکل گیا۔

حمزہ نے ملاقات کے لیے پیرس کے ایک عوامی باغ کا انتخاب کیا تھا، جہاں لوگ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بیٹھے تھے، بچے کھیل رہے تھے اور ہر طرف معمول کی رونق تھی۔ حمزہ جان بوجھ کر ایسی جگہ آیا تھا جہاں ہر چیز سب کے سامنے ہو، کیونکہ وہ اب کسی ایسے تعلق کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا جس میں

خلوت یا غلط فہمی کا کوئی پہلو ہو۔ اُس کے نزدیک اسلام نے نامحرم کے ساتھ تعلقات کی جو حدود مقرر کی ہیں، اُن میں ہی عزت، سکون اور حفاظت ہے۔ انسان جب ان حدود سے آگے بڑھتا ہے تو اکثر اُس کی خواہشیں اُس کی عقل پر غالب آجاتی ہیں، اور پھر ایک لمحے کی غفلت پوری زندگی کی ندامت بن جاتی ہے۔

چند لمحوں بعد جمی وہاں آگئی۔ حمزہ نے اُسے دیکھا تو محسوس کیا کہ وہ پہلے والی جمی نہیں رہی۔ اُس کے چہرے کی مصنوعی مسکراہٹ ختم ہو چکی تھی، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے اور لہجے میں وہ غرور بھی باقی نہ تھا جو کبھی اُس کی پہچان ہوا کرتا تھا۔ دونوں ایک مناسب فاصلے پر رک گئے۔ نہ مصافحہ ہوا، نہ بے تکلفی، نہ پرانی یادوں کا کوئی ڈرامائی منظر۔ صرف دو ایسے لوگ آمنے سامنے کھڑے تھے جنہیں وقت نے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ آخر کار جمی نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا کہ اُسے اب احساس ہو چکا ہے کہ دنیا کی چمک دمک، شہرت اور وقتی خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہوئے اُس نے سب سے قیمتی چیز کھو دی، اور وہ ایک مخلص انسان کا اعتماد تھا۔

حمزہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اُس کے چہرے پر نہ غصہ تھا، نہ نفرت، نہ خوشی۔ صرف ایک عجیب سی سنجیدگی تھی۔ کچھ لمحوں بعد اُس نے نہایت نرم مگر مضبوط لہجے میں کہا کہ اسلام انسان کو معاف کرنا سکھاتا ہے، انتقام لینا نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کر سکتا ہے تو ایک انسان دوسرے انسان کو کیوں معاف نہیں کر سکتا؟ پھر اُس نے آہستہ سے کہا کہ وہ جمی کو دل سے معاف کرتا ہے، اُس کے لیے خیر کی دعا بھی کرے گا، مگر اب اُن دونوں کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں۔ اُس نے واضح الفاظ میں کہا کہ جس دل میں اب کسی اور کے لیے نکاح کی نیت سے محبت پیدا ہو چکی ہو، وہاں

ماضی کو دوبارہ جگہ دینا نہ انصاف ہے، نہ دیانت۔ میں جانتا ہوں میں نے تمھاری زندگی کے ساتھ کھیلا ہے، مجھے معاف کر دو۔

یہ سنتے ہی جمی کی آنکھوں سے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا کہ کیا واقعی اُس کی زندگی میں کوئی اور آ چکا ہے؟ حمزہ چند لمحے خاموش رہا، پھر اُس نے صرف اتنا کہا کہ ابھی اُس نے اُس لڑکی کو اپنے دل کی بات بھی نہیں بتائی، لیکن اگر اللہ نے چاہا تو وہ اُسے صرف حلال رشتے کے ذریعے اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہے گا۔ محبت اگر اللہ کی رضا کے مطابق ہو تو عبادت بن جاتی ہے، اور اگر حدود توڑ دے تو آزمائش بن جاتی ہے۔ وہ اپنی محبت کو آزمائش نہیں، عبادت بنانا چاہتا ہے۔

جمی نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ اُس نے صرف ایک انسان نہیں کھویا، بلکہ ایک ایسا کردار کھو دیا تھا جو آج کے دور میں بہت کم ملتا ہے۔ اُس نے اپنے آنسو صاف کیے، حمزہ سے معافی مانگی اور کہا کہ وہ دل سے دعا کرتی ہے کہ اللہ اُسے اُس کی منزل عطا کرے۔ حمزہ نے بھی صرف اتنا کہا، "اللہ تمھیں ہدایت دے، تمہاری زندگی آسان کرے اور تمھیں سچی توبہ نصیب فرمائے۔"

دونوں الگ الگ سمت چل پڑے۔ اُنھیں معلوم نہ تھا کہ باغ کے دوسری طرف درختوں کے سائے میں کھڑا ایک شخص کافی دیر سے اُن پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اُس کے ہاتھ میں جدید کیمرہ تھا، جس کا لینز بار بار اُن دونوں کی طرف گھوم رہا تھا۔ وہ کبھی دور سے تصویر لیتا، کبھی ویڈیو بناتا اور کبھی ایسا زاویہ تلاش کرتا جس سے حقیقت کچھ اور اور منظر کچھ اور دکھائی دے۔ اُس کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ تھی، جیسے اُسے وہ موقع مل گیا ہو جس کا وہ مدتوں سے انتظار کر رہا تھا۔

حمزہ بے خبر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ راستے بھر اُس کے دل پر ایک عجیب سا سکون طاری تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے واقعی اپنی زندگی کا ایک مشکل باب بند کر دیا ہے۔ اب اُس کے دل میں صرف ایک ہی خواہش باقی تھی، اور وہ یہ کہ جلد از جلد ڈاکٹر عنایہ کے سامنے اپنے دل کی بات رکھے اور اگر اللہ نے چاہا تو اُن کے والدین سے نکاح کی اجازت مانگے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ آج جس باب کو وہ ختم سمجھ رہا ہے، در حقیقت اسی باب کا آخری صفحہ اُس کی پوری زندگی بدلنے والا تھا۔

پیرس کی شام آہستہ آہستہ رات کی آغوش میں سمٹ رہی تھی۔ سڑکوں پر جلتی ہوئی زرد روشنیاں یوں محسوس ہو رہی تھیں جیسے ہر چراغ کسی مسافر کا انتظار کر رہا ہو۔ جمی سے آخری ملاقات کے بعد حمزہ اسفند کے دل پر ایک عجیب سا سکون تھا۔ کئی سالوں سے اُس کے سینے پر رکھا ہوا ماضی کا بوجھ آج پہلی بار ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے گاڑی کا رخ سیدھا فینگ کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ دروازہ کھلا تو فانگ نے ایک ہی نظر میں اُس کے چہرے کو دیکھا اور مسکرا کر بولا، "لگتا ہے آج کوئی جنگ جیت کر آئے ہو۔" حمزہ صوفے پر بیٹھ گیا، گہری سانس لی اور دھیرے سے کہا، "جنگ نہیں... ایک باب بند کر کے آیا ہوں۔ آج میں نے اپنے ماضی کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔ اب میری زندگی میں اگر کوئی رشتہ ہو گا تو صرف وہی جس سے اللہ راضی ہو۔"

فینگ خاموشی سے اُس کی بات سنتا رہا۔ اگرچہ وہ ابھی اسلام پر عمل نہیں کر سکا تھا، مگر حمزہ کے ساتھ رہتے رہتے اُس نے اتنا ضرور سیکھ لیا تھا کہ سچی محبت وہ نہیں جو انسان کو اللہ سے دور کر دے، بلکہ وہ ہے جو اللہ کی رضا کے مطابق منزل تک پہنچے۔ اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا، "تو آخر کار وہ دن آ ہی گیا؟" حمزہ نے نظریں جھکا لیں۔ اُس کے چہرے پر وہ شرارت نہیں تھی جو ہمیشہ ہوتی تھی، بلکہ ایک عجیب سی سنجیدگی تھی۔ "میں عنایہ سے محبت کرتا ہوں، فینگ... میں اگر اُس سے کچھ کہوں

گا تو صرف اتنا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو میں اُس کے والدین سے اُس کا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی محبت کو حلال بنانا چاہتا ہوں، چھپانا نہیں۔"

فینگ نے چند لمحے خاموش رہ کر اُس کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولا، "اور اگر اُس نے انکار کر دیا تو؟" حمزہ نے بغیر ایک لمحہ سوچے جواب دیا،

"تو پھر بیڈ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لوں گا، یا زہر میں چینی ڈال کر پی لوں گا۔"

انسان اپنی پسند سے محبت کر سکتا ہے،

مگر اپنی قسمت خود نہیں لکھ سکتا۔

دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اچانک حمزہ اٹھا اور بولا، "چلو، ایک جگہ جانا ہے۔" فینگ نے حیرت سے پوچھا، "کہاں؟" حمزہ مسکرایا، "اگر آج نہ گیا تو شاید ہمت نہ کر سکوں۔" دونوں گاڑی میں بیٹھے اور پیرس کے ایک پرانے جیولری اسٹور پہنچ گئے۔ دکان کے اندر ہر طرف قیمتی زیورات جگمگا رہے تھے، مگر حمزہ کی نظر ایک نہایت سادہ سی انگوٹھی پر جا کر ٹھہر گئی۔ نہ اُس میں بڑا ہیرا تھا، نہ بے جا چمک دمک۔ بس سفید سونے کی باریک سی انگوٹھی تھی جس کے درمیان ایک ننھا سا سبز پتھر جڑا ہوا تھا۔ حمزہ نے اُسے ہاتھ میں لیا تو بے اختیار عنایہ کی آنکھیں اُس کے ذہن میں آ گئیں۔ وہ ہلکا سا مسکرایا اور دل ہی دل میں بولا، سادگی... یہی تو اُس کی پہچان ہے۔

دکاندار نے کئی مہنگی انگوٹھیاں بھی دکھائیں، مگر حمزہ نے سب واپس کر دیں۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا، "محبت کی قیمت سونے اور ہیروں سے نہیں لگتی، نیت سے لگتی ہے۔" فینگ نے پہلی بار محسوس کیا

کہ اُس کا دوست واقعی بدل چکا ہے۔ یہ وہ حمزہ نہیں تھا جو کبھی شہرت، فلموں اور پارٹیوں میں کھویا رہتا تھا۔ بیماری، تنہائی اور شاید عنایہ کی خاموش موجودگی نے اُس کے اندر کے انسان کو جگا دیا تھا۔

انگوٹھی خریدنے کے بعد دونوں دکان سے باہر نکل آئے۔ رات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حمزہ نے انگوٹھی والا چھوٹا سا ڈبہ جیب میں رکھا اور آسمان کی طرف دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا، "یا اللہ! اگر یہ رشتہ میرے دین، میری دنیا اور میری آخرت کے لیے بہتر ہے تو اسے آسان فرما، اور اگر اس میں میرے لیے کوئی شر ہے تو میرے دل کو اپنے فیصلے پر راضی کر دینا۔ میں اُس سے محبت ضرور کرتا ہوں، مگر تجھ سے بڑھ کر نہیں۔"

فینگ نے اُس کی طرف دیکھا اور ہلکے سے ہنس دیا۔ "تم جانتے ہو؟ میں نے تمہیں ہزاروں سین فلموں میں کرتے دیکھا ہے، مگر آج پہلی بار لگ رہا ہے کہ تم اپنی زندگی کا سب سے سچا کردار ادا کر رہے ہو۔"

حمزہ بھی مسکرا دیا، مگر اُس کے دل میں عجیب سی بے چینی اب بھی موجود تھی۔ نہ جانے کیوں اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ قسمت بہت خاموش ہو چکی ہے... اور قسمت جب حد سے زیادہ خاموش ہو جائے تو اکثر کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہوتا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اُس کی جیب میں رکھی یہی انگوٹھی چند گھنٹوں بعد اُس کی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش کی گواہ بننے والی ہے۔

رات کافی ہو چکی تھی۔

پیرس کی سڑکیں تقریباً سنسان ہو چکی تھیں اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا پورے شہر میں پھیل رہی تھی۔ حمزہ اسفند جب گھر پہنچا تو دروازہ ہمیشہ کی طرح گرینی نے ہی کھولا۔ اُن کے چہرے پر وہی ممتا بھری مسکراہٹ تھی جو ہر روز اُس کا استقبال کرتی تھی۔ جیسے ہی حمزہ اندر داخل ہوا، گرینی نے فوراً محسوس کر لیا کہ آج اُس کے چہرے کی خاموشی عام دنوں جیسی نہیں۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی، جیسے کوئی شخص برسوں بعد دل سے خوش ہوا ہو۔

کھانے کی میز پر دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے۔ گرینی نے حسبِ معمول اپنے ہاتھوں سے حمزہ کی پلیٹ میں کھانا رکھا اور محبت سے بولیں، "آج میرا بچہ بہت خاموش ہے... ضرور دل میں کوئی بڑی بات چھپا رہا ہے۔" حمزہ پہلے تو ہلکا سا مسکرایا، پھر چند لمحے تک کھانے کی پلیٹ کو دیکھتا رہا۔ آخر اُس نے جیب سے وہ چھوٹا سا مخملی ڈبہ نکالا اور آہستہ سے گرینی کے سامنے رکھ دیا۔ گرینی نے حیرت سے ڈبہ کھولا تو اندر رکھی انگوٹھی دیکھ کر اُن کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے پھیل گئیں۔ پھر اُنہوں نے مسکراتے ہوئے نظریں حمزہ پر جما دیں۔ "تو آخر کار وہ لڑکی آ ہی گئی... جس نے میرے ضدی بچے کو بدل دیا۔"

حمزہ شرمندگی سے مسکرا دیا۔ اُس نے نظریں جھکا لیں اور دھیرے سے کہا،

"گرینی... میں اُس سے محبت کرتا ہوں، لیکن میں اُس سے کبھی ایسا کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا جو میرے رب کو ناپسند ہو۔ میں چاہتا ہوں اگر وہ راضی ہو تو اُس کے والدین سے اُس کا ہاتھ مانگوں۔ اگر وہ انکار کر دے تو میں اُس کے فیصلے کی عزت کروں گا، مگر اپنی محبت کو کبھی گناہ نہیں بناؤں گا۔"

گرینی کچھ دیر خاموش رہیں۔ پھر اُنہوں نے محبت سے حمزہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اگرچہ وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئی تھیں، لیکن پچھلے کئی مہینوں سے اسلام کا مطالعہ کرتے کرتے اُن کے دل میں اس دین کے لیے بے حد احترام پیدا ہو چکا تھا۔ اُنہوں نے نرم لہجے میں کہا، "حمزہ... میں نے تمہاری اسلامی کتابوں میں ایک بات پڑھی تھی کہ پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے ہیں، اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے۔ شاید اسی لیے تم پہلے جیسے نہیں رہے۔ پہلے تم دنیا کی چمک کے پیچھے بھاگتے تھے، لیکن اب تم کسی کی عزت اور اللہ کی رضا کو اپنی خواہش پر ترجیح دے رہے ہو۔"

حمزہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اُس نے دھیرے سے کہا، "گرینی... میں کامل انسان نہیں ہوں۔ اور نہ ہی میرا کردار پاک ہے، مجھ سے بہت غلطیاں ہوئی ہیں۔

شراب...

گناہ...

نمازوں سے غفلت...

میں نے اپنی جوانی کا بہت سا حصہ ضائع کر دیا۔ کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ اللہ مجھے معاف بھی کرے گا یا نہیں۔"

گرینی نے فوراً اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محبت سے بولیں، "اگر تمہارا رب واقعی ویسا ہے جیسا تم مجھے اپنی کتاب سے بتاتے آئے ہو، تو پھر وہ ضرور معاف کرے گا۔ کیونکہ میں نے اُس کتاب میں یہ بھی پڑھا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ سے خوش ہوتا ہے۔ بیٹا، انسان کا ماضی اُس کی پہچان نہیں ہوتا، اُس کی سچی توبہ اُس کی نئی پہچان بن جاتی ہے۔"

یہ سن کر حمزہ کے دل کا بوجھ جیسے کچھ ہلکا ہو گیا۔ اُس نے پہلی بار گرینی کے کندھے پر سر رکھ دیا، اور بالکل ایک چھوٹے بچے کی طرح رو پڑا، میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا گرینی۔ گرینی اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہیں اور اُن کی آنکھوں سے بھی خاموشی سے آنسو بہنے لگے۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھیں کہ جس رب کو وہ ابھی پوری طرح جان بھی نہ سکی تھیں، وہ اُن کے اس بچے کو ہر آزمائش سے محفوظ رکھے۔

کچھ دیر بعد گرینی نے ہنستے ہوئے ماحول بدلنے کی کوشش کی۔ ویسے ایک بات پوچھوں؟

حمزہ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا۔

"اگر اُس لڑکی نے ہاں کر دی... تو کیا میں اُسے اپنی بہو کہہ سکتی ہوں؟"

حمزہ نے ہلکی سی شرمندہ ہنسی کے ساتھ جواب دیا، "گرینی... پہلے وہ ہاں تو کر دے، آپ نے تو ابھی سے رشتے بنا لیے۔"

گرینی بھی ہنس پڑیں۔ "مجھے نہیں معلوم وہ ہاں کرے گی یا نہیں... لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ جس لڑکے نے اپنی محبت کو اللہ کی رضا کے تابع کر دیا ہو، اللہ اُسے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔"

حمزہ نے آسمان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں صرف ایک دعا مانگی،

"یااللہ! اگر عنایہ میرے حق میں بہتر ہے تو اُسے میری زندگی کا حصہ بنادے، اور اگر میرے مقدر میں جدائی لکھی ہے تو مجھے اتنا صبر عطا کرنا کہ میں تیرے فیصلے پر راضی رہ سکوں۔"

اُس رات گرینی دیر تک جاگتی رہیں۔ اُنہوں نے اپنی میز پر رکھی قرآنِ مجید کی تفسیر کا ترجمہ کھولا، چند صفحات پڑھے اور پھر خاموشی سے حمزہ کے لیے دعا کرتی رہیں۔ اُنہیں کیا معلوم تھا کہ جس خوشی کی وہ اپنے دل میں امید باندھے بیٹھی ہیں، قسمت اُس خوشی کو ایک ایسے امتحان میں بدلنے والی ہے جس کے بعد اُن کے اس بچے کی پوری زندگی بدل جائے گی۔

22 June,

صبح کی پہلی کرن ابھی پوری طرح زمین پر نہیں اتری تھی۔ پیرس کی فضاؤں میں عجیب سا سکون تھا، مگر حمزہ اسفند کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ پوری رات وہ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ کبھی جیب میں رکھی انگوٹھی کو دیکھتا، کبھی عنایہ کا خیال آتا، کبھی اپنی بیماری یاد آتی، اور کبھی یہ خوف کہ اگر اللہ نے اُس کی زندگی کو زیادہ مہلت نہ دی تو؟ آخر کار وہ فجر سے پہلے اُٹھا، وضو کیا اور پہلی بار کئی برسوں بعد اس قدر خشوع کے ساتھ سجدے میں گر گیا کہ آنسو جائے نماز کو بھگونے لگے۔ اُس نے اپنے رب سے نہ شہرت مانگی، نہ دولت، نہ صحت، بلکہ صرف ایک دعا کی۔ "یااللہ! اگر عنایہ میری دنیا اور آخرت کے

لیے بہتر ہے تو اُسے میرے نصیب میں حلال طریقے سے لکھ دے، اور اگر میری بیماری، میرا ماضی یا میری قسمت اُس کے لیے تکلیف کا سبب بننے والی ہے تو مجھے اُس سے دور کر دے، مگر میرے دل میں اُس کے لیے کوئی شکوہ پیدا نہ ہونے دینا۔"

نماز کے بعد وہ کافی دیر خاموش بیٹھا تسبیح کے دانے گھماتا رہا۔ اُس کے دل میں عجیب سا اطمینان اترنے لگا۔ انسان جب اپنی خواہشوں کا فیصلہ اپنے رب کے سپرد کر دیتا ہے تو پھر نتیجے کا خوف بھی کم ہو جاتا ہے۔ اُس نے آہستہ سے انگوٹھی والا ڈبہ اٹھایا، اُسے چوما نہیں، سینے سے بھی نہیں لگایا، بلکہ احترام سے جیب میں رکھا اور خود سے کہا، "یہ صرف ایک انگوٹھی نہیں... میری نیت کی گواہ ہے۔"

8:56am,

طرف گرینی کچن میں ناشتے کی تیاری کر رہی تھیں۔ حمزہ جب اُن کے پاس آیا تو اُنہوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ آج اُس کی خاموشی میں بے چینی شامل ہے۔ اُنہوں نے کچھ کہے بغیر اُس کے سامنے ناشتے کی پلیٹ رکھی، پھر اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولیں، "بیٹا، بعض اوقات اللہ انسان کو اُس چیز تک پہنچانے سے پہلے اُس کے صبر کا امتحان لیتا ہے جس کی وہ سب سے زیادہ خواہش کرتا ہے۔ اگر آج تمہارے ساتھ سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق نہ بھی ہو، تب بھی اپنے رب سے بدگمان مت ہونا۔"

یہ سنتے ہی حمزہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ برسوں بعد ایک چھوٹے بچے کی طرح گرینی کے گلے لگ گیا۔ اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "گرینی... میں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کھویا ہے۔ میرے اپنے بابا نے مجھے کبھی بیٹے کی طرح قبول نہیں کیا، میں دین سے دور رہا، غلطیاں کرتا رہا، اور اب جب پہلی بار دل کسی کے لیے پاک نیت سے دھڑکا ہے تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں اللہ یہ خوشی بھی مجھ سے نہ لے لے۔"

گرینی نے اُس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کیے۔ "نہیں، حمزہ۔ اللہ ظالم نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی وہ ہمیں وہ چیز نہیں دیتا جو ہم چاہتے ہیں، کیونکہ وہ ہمیں وہ دینا چاہتا ہے جس کی ہمیں حقیقت میں ضرورت ہوتی ہے۔ تم نے مجھے اسلام کے بارے میں ایک بات سکھائی تھی، یاد ہے؟ تم کہتے تھے کہ مؤمن کی ہر حالت میں خیر ہوتی ہے۔ اگر خوشی ملے تو شکر، اور اگر آزمائش آئے تو صبر۔ دونوں صورتوں میں وہ کامیاب رہتا ہے۔ آج وہی بات خود پر بھی لاگو کرنا۔"

حمزہ نے سر ہلا دیا، مگر دل کی دھڑکن اب بھی تیز تھی۔

9:00am,

جاتے جاتے گرینی نے اپنی الماری سے ایک چھوٹا سا کپڑے کا تھیلا نکالا۔ اُس میں کوئی تعویذ نہیں تھا، بلکہ ایک چھوٹی سی کاغذ کی پرچی تھی جس پر اُنہوں نے حمزہ سے سیکھا ہوا قرآن کا ترجمہ لکھ رکھا تھا:
"اور اللہ پر بھروسہ کرو، اور اللہ ہی کارساز کافی ہے۔"

گرینی نے وہ پرچی حمزہ کی ہتھیلی میں رکھتے ہوئے کہا، "میں نہیں جانتی آج کیا ہونے والا ہے، مگر اتنا جانتی ہوں کہ اگر تم اللہ کا ہاتھ نہیں چھوڑو گے تو اللہ بھی تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔"

حمزہ نے خاموشی سے وہ پرچی اپنی بٹوے میں رکھ لی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اُس نے ایک بار مڑ کر گرینی کو دیکھا۔ نہ جانے کیوں اُس کا دل چاہا کہ آج کچھ دیر اور اُن کے پاس بیٹھا رہے۔ کچھ لمحوں کے لیے اُس کے قدم رک گئے۔ گرینی نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور کہا، "جاؤ... اور یاد رکھنا، محبت اگر اللہ کے لیے ہو تو اس میں جلد بازی نہیں ہوتی، صرف اخلاص ہوتا ہے۔"

9:03am,

حمزہ گاڑی میں بیٹھا اور انجن اسٹارٹ کیا۔ اُس کی جیب میں انگوٹھی تھی، دل میں دعا تھی اور لبوں پر خاموشی۔ اُسے یہ احساس نہیں تھا کہ آج سورج اُس کی زندگی کا سب سے روشن دن لے کر نہیں، بلکہ سب سے تاریک شام لے کر طلوع ہوا ہے۔ قسمت کبھی کبھی انسان کو خوشی کے دروازے تک صرف اس لیے پہنچاتی ہے تاکہ اگلے ہی لمحے اُسے آزمائش کے سمندر میں اتار دے، اور یہی وہ دن تھا جس کے بعد حمزہ اسفند کی زندگی پہلے جیسی کبھی نہیں رہنے والی تھی۔

9:10am,

ہسپتال پہنچ کر حمزہ نے ہمیشہ کی طرح اپنی ڈیوٹی شروع کر دی، مگر آج اُس کے ہاتھ کام نہیں کر رہے کر رہے تھے اور ذہن کسی اور دنیا میں تھا۔ کبھی وہ راہداری صاف کرتے ہوئے خود ہی مسکرا دیتا، کبھی دور سے عنایہ کو مریضوں کا معائنہ کرتے دیکھ کر نظریں جھکا لیتا۔ وہ جانتا تھا کہ محبت کی اصل خوبصورتی احترام میں ہے، بے جا نظریں اٹھانے یا بے تکلفی میں نہیں۔ اسلام انسان کو یہی سکھاتا ہے کہ جس سے محبت ہو، اُس کی عزت بھی اتنی ہی کی جائے۔ شاید اسی لیے حمزہ نے کبھی عنایہ کے قریب جانے کی جلدی نہیں کی تھی۔

12:00pm,

دوپہر کے وقت عنایہ مختصر وقفے کے لیے ہسپتال کی چھت پر چلی گئیں۔ یہ اُن کی پسندیدہ جگہ تھی، جہاں سے پورا پیرس دکھائی دیتا تھا۔ وہ تھکی ہوئی ریلنگ کے ساتھ کھڑی آسمان کو دیکھ رہی تھیں کہ پیچھے سے آہستہ آہستہ قدموں کی آواز آئی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہی ہیلمٹ والا مریض، وہی خڑوس پڑوسی، آج بغیر کسی مذاق کے اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی۔

چند لمحے دونوں خاموش رہے۔ ہوا تیز چل رہی تھی، مگر اُس خاموشی میں بھی جیسے کئی باتیں موجود تھیں۔ آخرکار حمزہ نے دھیرے سے کہا، "ڈاکٹر عنایہ... آج میں آپ سے کوئی مذاق کرنے نہیں آیا۔ اگر میری کسی حرکت سے کبھی آپ کو تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔"

عنایہ حیران ہو گئیں۔ اُنہوں نے پہلی بار اُس کی آواز میں ایسی سنجیدگی محسوس کی تھی۔ وہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہیں۔

حمزہ نے اپنی نظریں جھکا لیں اور نہایت باوقار لہجے میں کہا، "میں جانتا ہوں اسلام نامحرم مرد اور عورت کے درمیان غیر ضروری تعلق کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی لیے میں آپ سے نہ دوستی مانگنے آیا ہوں، نہ محبت کا اظہار کرنے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو میرے بارے میں کبھی یہ احساس ہو کہ میں ایک قابلِ اعتماد انسان ہوں... تو میں آپ کے والد صاحب سے آپ کا ہاتھ مانگنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اگر آپ انکار کر دیں گی تو میں دوبارہ کبھی اس موضوع پر بات نہیں کروں گا، اور نہ ہی آپ کو کسی قسم کی پریشانی ہو گی۔"

یہ کہتے ہی اس نے اپنا ہیلمٹ اتار کر چھت سے نیچے پھینک دیا،

سیاہ آنکھیں اور ہلکی جھیل جیسی سبز آنکھیں ایک دفع پھر آپس میں ٹکرائی مگر شاید اخری بار۔

یہ دیکھ کر عنایہ چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گئیں۔

تم؟ اس کا مطلب تم تو اداکار ہوں نا پھر یہ کام کیسے؟۔

جی میں وہی ہوں اور آپ کا پڑوسی بھی میں ہی ہوں اور ہاں وہ انگوٹھی والا میں ہی تھا۔

اُنہیں شاید پہلی بار احساس ہوا کہ یہ شخص واقعی دوسروں سے مختلف ہے۔ اُس نے نہ محبت کے بڑے بڑے دعوے کیے، نہ جذباتی جملے، نہ غیر شرعی تعلق کی بات کی، بلکہ سیدھا نکاح کی نیت کا اظہار کیا۔ اُن کے دل میں ایک عجیب سا سکون اترنے لگا۔ اُنہوں نے لب کھولے، جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں

مگر عین اُسی لمحے ہسپتال کے کئی ملازمین کے موبائل فون ایک ساتھ بج اٹھے۔

ٹن... ٹن... ٹن

ہر طرف نوٹیفکیشن کی آوازیں گونجنے لگیں۔

کسی نرس نے حیرت سے اپنا فون دیکھا۔

ایک ڈاکٹر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

دو وارڈ بوائز ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

عنایہ نے بھی بے اختیار اپنا موبائل نکالا۔

اسکرین پر سب سے اوپر ایک خبر نمایاں تھی۔

"پیرس کے مشہور اداکار حمزہ اسفند کی نجی ویڈیو لیک"

عنایہ کی نظریں ایک لمحے کے لیے جم گئیں۔

اُنہوں نے بے اختیار ویڈیو پر انگلی رکھ دی۔

اور قسمت نے اپنی سب سے خطرناک چال چل دی۔

ہسپتال کی چھت پر چلتی ہوا جیسے اچانک تھم گئی تھی۔ عنایہ کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں موبائل کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں، جہاں چند سیکنڈ کی ایک ویڈیو بار بار چل رہی تھی۔ ویڈیو میں حمزہ اور جمی ایک ایسے انداز میں دکھائے گئے تھے کہ حقیقت سے ناواقف کوئی بھی شخص فوراً غلط مطلب نکال لیتا۔ ایڈیٹنگ اتنی خطرناک تھی کہ فاصلے کو قربت اور خاموشی کو تعلق بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ عنایہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُن کے کانوں میں حمزہ کے چند لمحے پہلے کہے گئے الفاظ گونج رہے تھے، *"میں صرف نکاح کی نیت سے آیا ہوں..."* مگر اسکرین پر چلتی ویڈیو اُن کے یقین کو توڑنے پر تُلی ہوئی تھی۔

حمزہ نے عنایہ کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا تو وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ اُس نے دھیمے لہجے میں پوچھنا چاہا، "عنایہ... کیا ہوا؟" مگر جواب دینے کے بجائے عنایہ نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل اُس کے سامنے کر دیا۔ حمزہ کی نظریں اسکرین پر پڑیں اور اُس کے چہرے کا رنگ ایک دم اڑ گیا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے قدموں تلے زمین کھسک گئی ہو۔ وہ جان گیا تھا... وہی اندیشہ، جس سے فانگ نے اُسے خبردار کیا تھا، حقیقت بن چکا تھا۔

عنایہ کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ کیونکہ وہ بھی حمزہ کو تھوڑا تھوڑا پسند کرنے لگی تھی۔ وہ غصے، دکھ اور ٹوٹے ہوئے اعتماد کے درمیان کھڑی تھیں۔ اُنہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن کے دل کے اندر کسی نے ایک ساتھ سینکڑوں شیشے توڑ دیے ہوں۔ وہ بمشکل بول سکیں،

"یہ... یہی سچ تھا؟ اسی لیے تم اتنی اچھی اچھی باتیں کرتے تھے؟ نکاح... عزت... حلال محبت... یہ سب صرف الفاظ تھے؟"

حمزہ نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اُس کے ہونٹ ہلے، مگر الفاظ باہر نہ آ سکے۔ وہ چاہتا تو ایک لمحے میں کہہ دیتا کہ ویڈیو جعلی ہے، کہ اُس ملاقات کی حقیقت کچھ اور تھی، کہ یہ سب ایک سازش ہے... مگر اُس نے عنایہ کی آنکھوں میں بہتے ہوئے آنسو دیکھے۔ غصے میں انسان دلیل نہیں سنتا، صرف اپنا درد دیکھتا ہے۔

اچانک،

چھپّاک!

عنایہ کا ہاتھ پوری شدت سے حمزہ کے چہرے پر پڑا۔

آواز چھت کی خاموش فضا میں گونج اٹھی۔

حمزہ کا چہرہ ایک طرف مڑ گیا۔

چند لمحوں کے لیے ہر چیز ساکت ہو گئی۔

نہ ہوا چلی،

نہ کوئی بولا،

صرف عنایہ کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

حمزہ نے آہستہ آہستہ اپنا چہرہ سیدھا کیا۔ اُس کے چہرے پر تھپڑ کا نشان نمایاں تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں نہ غصہ تھا، نہ نفرت، نہ احتجاج۔ صرف ایک خاموش درد تھا... ایسا درد جو لفظوں سے کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

عنایہ روتے ہوئے بولیں، "مجھے خود پر شرم آ رہی ہے... میں نے تمہیں دوسروں سے مختلف سمجھا تھا۔ ایک پل کے لیے میں نے سوچا تھا کہ شاید اس دنیا میں ابھی بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو کردار کو شہرت پر ترجیح دیتے ہیں... مگر تم بھی ویسے ہی نکلے۔ مجھے تم سے صرف ہمدردی تھی جو آج ختم ہو گئی۔"

حمزہ نے نظریں جھکا لیں۔

وہ چاہتا تو صرف ایک جملہ کہہ دیتا،

"یہ ویڈیو جھوٹی ہے"

مگر اُس نے کچھ نہ کہا۔

وہ جانتا تھا کہ اگر اعتماد ایک ویڈیو سے ٹوٹ گیا ہے، تو چند الفاظ اُسے واپس نہیں لا سکتے۔

خاموشی بعض اوقات صفائی سے زیادہ باوقار ہوتی ہے۔

عنایہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، "آج کے بعد... میرے سامنے کبھی مت آنا۔"

حمزہ نے اُس کی طرف دیکھا۔

آنکھوں میں اب نفرت تھی،

جو چند لمحے پہلے امید کا گھر تھی۔

اور اب خاموش قربانی بن چکی تھی۔

اُس نے آہستہ سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہی مخملی ڈبہ، جس میں انگوٹھی رکھی تھی، اُس کی انگلیوں سے ٹکرایا۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے آنکھیں بند کیں۔ کتنے خواب تھے جو اُس چھوٹے سے ڈبے میں بند تھے... آج سب بکھر چکے تھے۔

اُس نے انگوٹھی باہر نہیں نکالی۔

بس جیب پر ہاتھ رکھا۔

اور آسمان کی طرف ایک نظر اٹھائی۔

دل ہی دل میں صرف اتنا کہا،

یا اللہ... تو جانتا ہے میں بے قصور ہوں۔ اگر میری خاموشی ہی آج میری آزمائش ہے، تو مجھے صبر بھی عطا فرما۔

پھر وہ بغیر کچھ کہے مڑ گیا۔

ہر قدم پہلے سے زیادہ بھاری تھا۔

چھت سے نیچے اترتے ہوئے اُس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

کم از کم آپ کی خاموشی اتنی گہری تو ہونی چاہیے کہ لوگ آپ کے شکوے سننے کو ترسے۔

عنایہ وہیں کھڑی روتی رہیں۔

اُسے لگ رہا تھا کہ اُنہوں نے ایک دھوکے باز کو اپنی زندگی سے نکال دیا ہے۔

اور حمزہ کو معلوم تھا کہ آج اُس نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی چیز کھو دی ہے، مگر پھر بھی اپنے حق میں ایک لفظ نہ بول سکا۔

کیونکہ بعض اوقات انسان اپنی بے گناہی ثابت کرنے سے پہلے، اللہ کے فیصلے کا انتظار کرنا سیکھ لیتا ہے۔

ہسپتال کی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے حمزہ اسفند کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے قدموں سے طاقت ختم ہو چکی ہو۔ جیب میں رکھی انگوٹھی اب کسی خواب کی نہیں، بلکہ ایک ٹوٹے ہوئے ارمان کی نشانی بن چکی تھی۔ وہ خاموشی سے پارکنگ تک آیا، گاڑی کا دروازہ کھولا، مگر بیٹھنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے آسمان کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں نمی تھی، مگر ہونٹ خاموش تھے۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ جس لڑکی سے وہ حلال طریقے سے نکاح کی بات کرنے آیا ہے، اُسی کے ہاتھ کا پہلا لمس ایک تھپڑ ہو گا۔

دوسری طرف عنایہ اپنے کمرے میں آچکی تھیں۔ دروازہ بند کرتے ہی اُن کے اندر کا مضبوط ڈاکٹر ٹوٹ گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئیں اور بے اختیار رونے لگیں۔ اُن کے ذہن میں بار بار حمزہ کا خاموش چہرہ آرہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اگر وہ واقعی مجرم تھا تو اُس نے صفائی کیوں نہیں دی؟ وہ چیخا کیوں نہیں؟ اُس نے یہ کیوں نہیں کہا کہ ویڈیو جھوٹی ہے؟ اُس کی خاموشی عنایہ کے دل کو اور زیادہ بے چین کر رہی تھی، مگر غصہ ابھی بھی اُن کے فیصلے پر غالب تھا۔ انسان جب جذبات کے طوفان میں ہوتا ہے تو اکثر سچ کی آواز بہت مدھم سنائی دیتی ہے۔

ادھر حمزہ نے گاڑی اسٹارٹ ہی کی تھی کہ موبائل فون مسلسل بجنے لگا۔ سوشل میڈیا، نیوز چینلز، فلم انڈسٹری کے لوگ، صحافی، پروڈیوسرز، سب کے فون آ رہے تھے۔ ہر نیوز چینل پر ایک ہی خبر چل رہی تھی۔

"مشہور اداکار حمزہ اسفند کی متنازع ویڈیو وائرل"

"کیا فلمی دنیا کا سب سے بڑا چہرہ دوہری زندگی گزار رہا تھا؟"

"کیا حمزہ اسفند کا اصل چہرہ بے نقاب ہو گیا؟"

حمزہ نے ایک نظر موبائل پر ڈالی، پھر خاموشی سے فون بند کر دیا۔

بعض جنگیں ایسی ہوتی ہیں جن کا جواب شور سے نہیں، وقت سے دیا جاتا ہے۔

اسی دوران فینگ کا فون آیا۔ حمزہ نے کال اٹھائی تو دوسری طرف سے گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی،
"حمزہ! تم کہاں ہو؟ میں نے ویڈیو دیکھ لی ہے۔ یہ ایڈیٹ کی گئی ہے، میں قسم کھا سکتا ہوں۔ ابھی میرے آفس آ جاؤ، ہم فوراً فرانزک ٹیم سے اس کی جانچ کرواتے ہیں۔"

حمزہ نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا، "دیر ہو گئی، فینگ"

"نہیں! ابھی کچھ دیر نہیں ہوئی۔"

"ہو گئی ہے"

"عنایہ نے مجھے جھوٹا سمجھ لیا۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔

پھر فینگ نے مضبوط لہجے میں کہا، "اگر پوری دنیا تمہیں جھوٹا کہہ دے تب بھی سچ، سچ ہی رہتا ہے۔ میں یہ ویڈیو بنانے والوں کو ڈھونڈ کر رہوں گا، چاہے مجھے اپنی وکالت ہی کیوں نہ کھونی پڑے۔"

حمزہ نے پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ کی، مگر وہ مسکراہٹ بھی درد سے بھری ہوئی تھی۔

تم ہمیشہ میرے لیے لڑتے رہے ہو، فینگ... لیکن اس بار مجھے اپنے لیے نہیں، جمی کے لیے ڈر لگ رہا ہے۔

فینگ چونک گیا۔

"کیوں؟"

حمزہ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا، "میں اُس کی آنکھوں میں کل پچھتاوا دیکھ کر آیا ہوں۔ اگر یہ ویڈیو کسی سازش کا حصہ ہے... تو وہ شاید خود کو کبھی معاف نہ کر سکے۔"

یہ کہہ کر حمزہ نے فون بند کر دیا۔

اُدھر شہر کے ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں جمی ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھی تھی۔ ہر نیوز چینل پر اُس کا اور حمزہ کا نام چل رہا تھا۔ سوشل میڈیا پر لاکھوں لوگ اُسے گالیاں دے رہے تھے، کوئی اُسے کردار سے گرا ہوا کہہ رہا تھا، کوئی حمزہ کو منافق۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس نے اپنا موبائل کھولا تو سینکڑوں نفرت بھرے پیغامات اُس کا انتظار کر رہے تھے۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

وہ بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہی تھی،

"میں نے تو صرف معافی مانگنی چاہی تھی"

"یہ سب... یہ سب کیسے ہو گیا؟"

اُسی لمحے اُس کے موبائل پر ایک نام ابھرا۔

"Unknown Number."

جمی نے کانپتے ہاتھ سے کال اٹھائی۔

دوسری طرف سے ایک سرد، بے رحم ہنسی سنائی دی۔

"دیکھ لیا؟"

"ایک ملاقات نے تم دونوں کی زندگیاں تباہ کر دیں۔"(آواز کسی لڑکی کی لگ رہی تھی۔)

جمی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"تم... تم کون ہو؟"

دوسری طرف سے صرف ایک جملہ سنائی دیا،

"ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے"

اور کال کٹ گئی۔

جمی کے ہاتھ سے موبائل زمین پر گر گیا۔

اُسے پہلی بار احساس ہوا،

وہ صرف ایک ملاقات نہیں تھی۔

وہ کسی بہت بڑی سازش کا پہلا قدم تھی۔

شام ڈھلنے لگی تھی مگر پیرس کے آسمان پر چھائے سیاہ بادلوں کی طرح حمزہ اسفند کی زندگی پر بھی اندھیرا اتر چکا تھا۔ وہ ابھی گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ فانگ کا فون دوبارہ آیا۔ اس بار اُس کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔

"حمزہ... جمی نے خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے... ایمبولینس اُسے لے جا چکی ہے۔"

یہ الفاظ سنتے ہی حمزہ کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر جم گئے۔ چند لمحوں تک وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکا۔ اُس نے فوراً گاڑی کا رخ جمی کے اپارٹمنٹ کی طرف موڑ دیا۔ راستے بھر اُس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی، اِن سب کا قصوروار میں ہوں۔

جب حمزہ جمی کے اپارٹمنٹ کے باہر پہنچا تو پوری عمارت پولیس اور ایمبولینس کی گاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ چند ہمسائے دروازے کے باہر جمع تھے، ہر شخص اپنی اپنی کہانی بنا کر سنا رہا تھا۔ کسی نے اُسے پہچان لیا۔ پھر جیسے ایک لمحے میں کئی مائیک اُس کی طرف اٹھ گئے۔ کیمروں کی روشنیاں اُس کے چہرے پر پڑنے لگیں۔ کوئی چیخ کر کہہ رہا تھا، "وہ آگیا... یہی ہے حمزہ اسفند!" کوئی کہہ رہا تھا، "اسی کی وجہ سے اُس لڑکی نے خودکشی کی!" حمزہ نے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھا، مگر پولیس نے اُسے اندر جانے سے روک دیا۔ اُس کی نظریں صرف ایمبولینس کے کھلے دروازے پر تھیں، جہاں سفید چادر میں لپٹی جمی بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اُس نے نہ چیخ ماری، نہ ماتم کیا، بس ایک قدم پیچھے ہٹا اور اُس کی پلکوں سے خاموشی سے ایک آنسو ٹپک کر زمین پر گر گیا۔

یہ منظر وہاں موجود ایک نیوز رپورٹر نے اپنے کیمرے میں قید کر لیا۔ چند ہی منٹوں میں خبر پورے پیرس میں پھیل گئی۔ ہر نیوز چینل پر ایک ہی سرخی چل رہی تھی:

"ویڈیو اسکینڈل کے بعد جمی کی خودکشی کی کوشش، اداکار حمزہ اسفند موقع پر موجود!"

کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ وہ وہاں کیوں آیا تھا، سب نے اپنے اپنے فیصلے خود ہی سنا دیے۔ سوشل میڈیا پر نفرت کی آگ مزید بھڑک اٹھی۔ لوگ لکھ رہے تھے کہ حمزہ نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کر دی۔ جھوٹ اتنی تیزی سے پھیل رہا تھا کہ سچ کو سانس لینے کی بھی مہلت نہیں مل رہی تھی۔

ہسپتال میں اپنے کمرے میں بیٹھی عنایہ کے موبائل پر بھی یہی خبر نمودار ہوئی۔ اُنہوں نے کانپتے ہاتھوں سے خبر پڑھی۔ پھر جمی کی ایمبولینس والی تصویر دیکھی، اور اُس کے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے حمزہ کی تصویر بھی۔ اُن کے دل میں پہلے سے موجود غصہ اب نفرت میں بدلنے لگا۔ اُنہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل کے کسی کونے سے ایک آواز ابھی بھی کہہ رہی تھی کہ "حمزہ ایسا نہیں ہو سکتا"، مگر زخمی اعتماد نے اُس آواز کو دبا دیا۔ اُنہوں نے دل ہی دل میں کہا، "میں نے جس انسان کو دوسروں سے مختلف سمجھا تھا، وہ تو اُن سب سے بھی بدتر نکلا۔"

رات کافی گزر چکی تھی جب حمزہ لڑکھڑاتے قدموں سے گھر پہنچا۔ دروازہ گرینی نے کھولا۔ ایک ہی نظر میں وہ سب کچھ سمجھ گئیں۔ اُنہوں نے آج پہلی بار اپنے بچے کے چہرے پر وہ شکست دیکھی تھی جو کسی بیماری، کسی غربت یا کسی ناکامی سے نہیں، بلکہ ٹوٹے ہوئے دل سے پیدا ہوتی ہے۔ حمزہ اندر آیا، مگر

ہمیشہ کی طرح "گرینی" کہہ کر مسکرایا نہیں۔ وہ خاموشی سے صوفے کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے اور نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔

گرینی اُس کے قریب بیٹھ گئیں۔ اُنہوں نے کچھ پوچھا نہیں، کیونکہ بعض اوقات سوال زخموں کو اور گہرا کر دیتے ہیں۔ چند لمحوں بعد حمزہ نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا، "گرینی... آج پہلی بار مجھے لگا کہ شاید خاموش رہنا بھی گناہ ہوتا ہے۔ اگر میں عنایہ کو سچ بتا دیتا... اگر میں جمی سے ملنے ہی نہ جاتا... شاید آج یہ سب نہ ہوتا۔ ایک لڑکی مجھ سے نفرت کرنے لگی... دوسری موت اور زندگی کے درمیان لڑ رہی ہے... اور پوری دنیا مجھے مجرم سمجھ رہی ہے۔"

یہ کہتے کہتے اُس کی آواز بھر ّا گئی۔ برسوں سے اپنے جذبات چھپانے والا حمزہ آج خود کو مزید مضبوط نہ رکھ سکا۔ وہ ایک بچے کی طرح گرینی کے گھٹنوں کے پاس بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس کے آنسو گرینی کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ وہ صرف ایک ہی جملہ بار بار دہرا رہا تھا، "میں بے قصور ہوں، گرینی... اللہ گواہ ہے، میں بے قصور ہوں"

گرینی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اُنہوں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور محبت سے کہا، "بیٹا، دنیا کا انصاف ہمیشہ سچا نہیں ہوتا، مگر اللہ کا انصاف کبھی غلط نہیں ہوتا۔ لوگ آنکھوں سے دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں، اللہ دلوں کے حال جانتا ہے۔ اگر تم واقعی بے قصور ہو تو یاد رکھو، تمہاری خاموشی ضائع نہیں جائے گی۔ آزمائش جتنی بڑی ہوتی ہے، اللہ کی مدد بھی اُتنی ہی قریب ہوتی ہے۔"

حمزہ نے سر اٹھایا، مگر اُس کی آنکھوں میں اب بھی ٹوٹے ہوئے خواب صاف دکھائی دے رہے تھے۔ جیب میں رکھی وہ انگوٹھی ابھی بھی اُس کے ساتھ تھی۔ اُس نے اُسے نکالا، چند لمحے خاموشی سے دیکھا، پھر میز پر رکھ دیا۔ وہ انگوٹھی آج کسی محبت کی علامت نہیں لگ رہی تھی، بلکہ ایک ایسے خواب کی قبر معلوم ہو رہی تھی جو حقیقت بننے سے پہلے ہی دفن ہو گیا تھا۔ گھر کے ہر کمرے میں خاموشی تھی، مگر اُس خاموشی کے پیچھے آنے والے طوفان کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

پیرس کی وہ رات شاید حمزہ اسفند کی زندگی کی سب سے طویل رات تھی۔ گھر کے اندر عجیب سی خاموشی تھی۔ میز پر وہی انگوٹھی رکھی تھی جو چند گھنٹے پہلے ایک نئے رشتے کی امید تھی، مگر اب ٹوٹے ہوئے خواب کی نشانی بن چکی تھی۔ گرینی بیٹھی خاموشی سے اللہ سے دعا مانگ رہی تھیں۔ اگرچہ وہ ابھی اسلام کے بارے میں سیکھ ہی رہی تھیں، مگر اتنا ضرور جان چکی تھیں کہ جب تمام دروازے بند ہو جائیں تو بندہ اپنے رب کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

اچانک گھر کے باہر کئی گاڑیوں کے بریک لگنے کی آواز آئی۔ اگلے ہی لمحے دروازہ اس زور سے کھلا کہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ دروازے پر اسفند صاحب کھڑے تھے۔ اُن کے چہرے پر غصہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کئی برس بعد وہ اس گھر میں آئے تھے، مگر ایک باپ کی حیثیت سے نہیں، ایک ایسے شخص کی طرح جسے اپنی عزت اور نام کی فکر تھی۔ اُن کے ہاتھ میں موبائل تھا، جس کی اسکرین پر وہی وائرل ویڈیو چل رہی تھی جس نے چند گھنٹوں میں حمزہ کی پوری زندگی اجاڑ دی تھی۔

حمزہ آہستہ آہستہ اپنے کمرے سے باہر آیا۔ اُس نے اپنے والد کو دیکھا تو دل کے کسی کونے میں ایک معصوم سی امید جاگی کہ شاید آج... شاید اتنے برسوں بعد وہ ایک بار اُس کی بات سن لیں گے، شاید ایک بار پوچھیں گے کہ "بیٹا، حقیقت کیا ہے؟" مگر قسمت کو شاید اُس پر رحم کرنا ابھی منظور نہ تھا۔

وہ اپنے بابا کے پیروں میں گر پڑا "بابا اس نے مجھے ٹھکرا دیا، وہ کہتی ہے اسے میرے سے محبت نہیں صرف ہمدردی تھی، وہ ایسا کیسے کر سکتی ہیں، آخر میں کیوں قابلِ محبت نہیں ہوں، بچپن سے میں محبت کو ترستا آرہا ہوں، آخر کیوں کسی کو مجھ پر ترس نہیں آتا، پہلے مجھے میری سگی ماں نے لاوارثوں کی طرح چھوڑ دیا، بابا آپ پلیز اسے بتائے میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ سوچ رہی ہے۔" اس کی سسکیاں پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔

اسفند صاحب ایک لفظ بھی بولے بغیر پوری قوت سے ایک تھپڑ اُس کے چہرے پر دے مارا۔ حمزہ سنبھل نہ سکا اور زمین پر گر گیا۔ ابھی وہ اُٹھ بھی نہ پایا تھا کہ دوسرا تھپڑ، پھر تیسرا، پھر گھونسے... ہر وار کے ساتھ ایک ہی جملہ اُن کی زبان پر تھا، "میں نے تمہیں اس لیے پیدا کیا تھا؟ تاکہ تم میرا نام مٹی میں ملا دو؟"

گرینی دوڑ کر درمیان میں آئیں اور کانپتی ہوئی آواز میں بولیں، "رک جاؤ... خدا کے لیے پہلے اُس کی بات تو سن لو!"

اسفند صاحب نے غصے سے اُن کی طرف دیکھا۔ "بات؟ اب بھی کوئی بات باقی رہ گئی ہے؟ پوری دنیا دیکھ چکی ہے اِس کا کردار"

حمزہ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے ہونٹ سے خون بہنے لگا تھا، مگر اُس نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش تک نہ کی۔ وہ صرف اپنے والد کو دیکھ رہا تھا۔

وہی باپ... جس کی ایک محبت بھری نظر کا وہ بچپن سے منتظر تھا۔ اُسے یاد آیا کہ بچپن میں وہ ہر سالگرہ پر دروازے کی طرف دیکھتا رہتا تھا کہ شاید بابا آئیں گے۔ ہر عید پر نئے کپڑے پہن کر اُن کا انتظار کرتا تھا۔ ہر کامیابی کے بعد سوچتا تھا کہ شاید آج وہ کہیں گے، "شاباش بیٹا۔" مگر آج، جب وہ کئی برس بعد اُس کے سامنے کھڑے تھے، تو اُن کے ہاتھ میں شفقت نہیں، نفرت تھی۔

اسفند صاحب نے غصے میں اُس کا گریبان پکڑ کر اُسے کھڑا کیا۔ "آج کے بعد تم میرے بیٹے نہیں ہو۔ تم نے میرا سر جھکا دیا۔ میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں؟"

یہ الفاظ سن کر پہلی بار حمزہ کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا،

"بابا... صرف ایک بار... صرف ایک بار میری بات سن لیجیے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ وہ ویڈیو جھوٹی ہے... مجھے ایک موقع دے دیجیے، میں سب ثابت کر دوں گا۔"

اسفند صاحب نے اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اُسے زور سے دھکا دیا۔ حمزہ دوبارہ زمین پر گر گیا۔

"جھوٹ مت بولو"

"تم جیسے لوگ ثبوت نہیں دیتے، بہانے بناتے ہیں"

"میرے لیے تم آج ہی مر چکے ہو۔"

یہ سن کر حمزہ نے اپنا سر جھکا لیا۔ اُس کی سسکیاں اب چھپائے نہیں چھپ رہی تھیں۔ وہ ایک کامیاب اداکار تھا، مگر آج اُس کے آنسو اداکاری نہیں تھے۔

آج ایک ٹوٹا ہوا بیٹا رو رہا تھا... وہ بیٹا جسے اپنے باپ سے کبھی دولت نہیں چاہیے تھی، صرف یقین چاہیے تھا۔

گرینی روتی ہوئی اُس کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

"نہیں... ایسا ظلم مت کرو۔ تم نے برسوں اس بچے کو اکیلا چھوڑ دیا، پھر بھی اس نے تمہارے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ آج بھی یہ تمہیں بابا کہہ رہا ہے، اور تم... تم اس کی بات سننے کو بھی تیار نہیں؟"

مگر غصہ جب تکبر سے مل جائے تو انسان انصاف نہیں کرتا۔

اسفند صاحب نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "آج... ابھی... اسی وقت اس گھر سے نکل جاؤ۔

"حمزہ نے بے یقینی سے اپنے والد کو دیکھا۔ "بابا؟

"میں نے کہا... نکل جاؤ"

چند لمحوں تک گھر میں ایسی خاموشی چھائی رہی کہ صرف گرینی کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ حمزہ آہستہ آہستہ اُٹھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہی گھر اُس کا بچپن تھا۔ یہی دیواریں اُس کی تنہائی کی گواہ

تھیں۔ یہی کمرہ اُس کی ہر کامیابی اور ہر ناکامی کا رازدار تھا۔ آج وہ سب کچھ چھوڑ کر جا رہا تھا، مگر سب سے زیادہ درد اس بات کا تھا کہ اُسے بے گناہ ہونے کے باوجود مجرم بنا کر نکالا جا رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں گیا۔ نہ کپڑے سمیٹے، نہ کوئی سامان۔ صرف میز پر پڑی وہ انگوٹھی اٹھائی، جیب میں رکھی، اپنا پرانا قرآنِ مجید سینے سے لگایا اور خاموشی سے واپس آ گیا۔

دروازے پر پہنچ کر اُس نے ایک آخری بار پلٹ کر گرینی کو دیکھا۔ گرینی دوڑ کر اُس سے لپٹ گئیں اور بچوں کی طرح رونے لگیں۔ "مجھے معاف کر دینا، بیٹا... میں تمہیں روک نہیں سکی... میں بہت بے بس ہوں۔"

حمزہ نے اُن کے آنسو صاف کیے، خود روتے ہوئے بھی اُنہیں تسلی دی۔

"نہیں گرینی... آپ نے ہمیشہ مجھے ماں سے بڑھ کر محبت دی ہے۔ اگر آج میں زندہ ہوں تو صرف آپ کی وجہ سے۔ میرے لیے پریشان نہ ہوں... میرا رب میرے ساتھ ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے گرینی کے ماتھے کو ادب سے چوما، دروازہ کھولا اور رات کے اندھیرے میں تنہا باہر نکل گیا۔

دروازہ اُس کے پیچھے بند ہو گیا۔

اور اُس آواز کے ساتھ صرف ایک گھر کا دروازہ نہیں بند ہوا تھا۔

بلکہ ایک بیٹے کی آخری امید بھی ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی تھی۔

پیرس کی رات مزید گہری ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی اور ٹھنڈی ہوا حمزہ اسفند کے چہرے سے بہتے آنسوؤں کو اپنے ساتھ بہا رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں صرف چھوٹا سا بیگ تھا، جیب میں عنایہ کے لیے خریدی ہوئی انگوٹھی، اور سینے سے لگا ہوا قرآنِ مجید۔ جس انسان کے پاس کبھی شہرت، دولت، عالیشان گھر اور ہزاروں مداح تھے، آج اُس کے پاس صرف اللہ کا کلام رہ گیا تھا۔ وہ خالی سڑکوں پر چلتا رہا، یہاں تک کہ اُس کے قدم بے اختیار فینگ کے گھر کے سامنے جا رکے۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ دل میں ایک ہی امید تھی کہ شاید دنیا نے اُسے چھوڑ دیا ہو، مگر اُس کا دوست نہیں چھوڑے گا۔

دروازہ فینگ نے نہیں، اُس کے والد نے کھولا۔ اُن کے چہرے پر پریشانی اور سختی دونوں نمایاں تھیں۔ حمزہ نے ادب سے سلام کیا اور دھیمی آواز میں صرف اتنا کہا کہ اُسے فانگ سے ملنا ہے۔ فانگ کے والد نے چند لمحے خاموشی سے اُس کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے سر ہلا دیا۔ "فانگ گھر پر نہیں ہے۔ وہ صبح سے تمہاری ویڈیو کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے نکلا ہوا ہے۔" ایک لمحے کے لیے حمزہ کے دل میں امید جاگی، مگر اگلے ہی جملے نے وہ امید بھی توڑ دی۔ "اور تم... تم یہاں سے چلے جاؤ، حمزہ۔"

حمزہ نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔ اُنہوں نے نظریں جھکا لیں اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا، "میرا تم پر یقین ہو یا نہ ہو، اس وقت اس کی اہمیت نہیں۔ میرے گھر میں میری جوان بیٹی ہے۔ تمہارا نام اس وقت ہر نیوز چینل پر چل رہا ہے۔ صحافی کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اگر انہوں نے اس گھر کا رخ کر لیا تو میری بیٹی کی عزت بھی سوالوں کی زد میں آ جائے گی۔ میں ایک باپ ہوں... مجھے اپنی بیٹی کی حفاظت کرنی ہے۔"

یہ الفاظ سن کر حمزہ نے سر جھکا لیا۔ اُس نے کوئی شکوہ نہیں کیا، نہ یہ کہا کہ وہ بے قصور ہے۔ صرف اتنا بولا، "آپ فکر نہ کریں... میں ابھی چلا جاتا ہوں۔ اللہ آپ کے گھر کو ہر آزمائش سے محفوظ رکھے۔"

دروازے کے اندر سیڑھیوں کے قریب اسٹیلا فینگ کی چھوٹی بہن جو ایک نیوز رپورٹر تھی، خاموشی سے کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اُس نے ٹی وی پر جس شخص کو مغرور اور بدکردار دکھایا جا رہا تھا، وہ دروازے کے باہر کھڑا ہر بات تحمل سے سن رہا تھا، کسی پر آواز بلند نہیں کر رہا تھا، کسی سے لڑ نہیں رہا تھا۔ جب حمزہ پلٹا تو ایک لمحے کے لیے اُس کی نظر اسٹیلا پر پڑی۔ اسٹیلا نے محسوس کیا کہ اُس کی آنکھوں میں غرور نہیں، صرف ایک بے حد تھکا ہوا درد تھا۔

حمزہ وہاں سے خاموشی سے چل پڑا۔ اُس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد فینگ گھر واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ دستاویزات اور ایک لیپ ٹاپ تھا۔ وہ خوش تھا، کیونکہ اُسے ابتدائی شواہد مل چکے تھے کہ ویڈیو کے کئی حصے ایڈیٹ کیے گئے ہیں۔ جیسے ہی اُس نے گھر میں قدم رکھا، اُس کی والدہ نے ساری بات بتا دی کہ حمزہ آیا تھا، مگر اُسے واپس بھیج دیا گیا۔ فینگ کے ہاتھ سے لیپ ٹاپ تقریباً گر گیا۔ "آپ لوگوں نے... اُسے واپس بھیج دیا؟ وہ اس حالت میں کہاں جائے گا؟"

جواب کا انتظار کیے بغیر وہ فوراً گاڑی میں بیٹھا اور سیدھا حمزہ کے گھر پہنچ گیا۔

دروازہ گرینی نے کھولا۔

"فینگ نے بے چینی سے پوچھا، "حمزہ کہاں ہے؟"

یہ سوال سنتے ہی گرینی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُنہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں پورا واقعہ سنا دیا۔ اسفند صاحب کا آنا... حمزہ کو مارنا... گھر سے نکال دینا... اور پھر اُس کا خاموشی سے چلے جانا۔

فینگ کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے سینے پر پتھر رکھ دیا ہو۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ "وہ اکیلا ہے... اور میں اُس کے ساتھ بھی نہیں تھا۔"

گرینی نے روتے ہوئے کہا، "وہ جاتے ہوئے صرف ایک بات کہہ رہا تھا... میرا رب میرے ساتھ ہے۔

یہ جملہ سن کر فینگ خاموش ہو گیا۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور پہلی بار اُس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر وہ کون سا رب ہے، جس پر اتنا یقین رکھنے والا انسان ہر چیز کھو دینے کے بعد بھی اُس کا شکوہ نہیں کرتا؟

اُدھر حمزہ پیرس کی سڑکوں پر بے مقصد چلتا رہا۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی، بارش تیز ہو چکی تھی، کپڑے بھیگ چکے تھے، جسم بیماری سے پہلے ہی کمزور تھا، مگر قدم رکے نہیں۔ اچانک دور سے اذانِ عشاء کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ اُس نے آواز کی سمت دیکھا۔ چند گلیاں پار کرنے کے بعد ایک پرانی مگر پُر سکون مسجد نظر آئی، جس کے دروازے ابھی بھی کھلے تھے۔

حمزہ آہستہ آہستہ،

مسجد کے صحن میں داخل ہوا۔ اُس کے جوتوں سے پانی ٹپک رہا تھا، چہرہ آنسوؤں اور بارش سے بھیگا ہوا تھا، مگر جیسے ہی اُس کی نظر مسجد کے محراب پر پڑی، اُس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہونے لگا۔ وہ خاموشی سے وضو خانے کی طرف گیا، وضو کیا اور مسجد کے ایک کونے میں جا کر سجدے میں گر پڑا۔

وہ دیر تک روتا رہا۔

اتنا رویا کہ جائے نماز آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

اُس کی زبان پر صرف ایک دعا تھی۔

"اللہ... آج میرے اپنے بھی مجھے چھوڑ گئے۔ جس باپ کی محبت چاہی، اُس نے گھر سے نکال دیا۔" جس محبت کو حلال بنانا چاہا، اُس نے مجھ پر یقین نہ کیا۔ دنیا نے مجھے مجرم لکھ دیا... مگر تُو تو دلوں کے حال جانتا ہے۔ اگر پوری دنیا میرے خلاف ہو جائے، تب بھی مجھے صرف تیرا ساتھ کافی ہے۔

اسی دوران مسجد کے بزرگ امام خاموشی سے اُس کے قریب آئے۔ اُنہوں نے کچھ نہیں پوچھا، صرف اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور محبت سے کہا، "بیٹا، اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ "جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اُس کے لیے نکلنے کا راستہ پیدا فرما دیتا ہے اور اُسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے وہ گمان بھی نہیں کرتا۔"

حمزہ نے آنسو صاف کیے اور اُن کی طرف دیکھا۔

امام مسکرائے اور بولے، "یاد رکھو... دنیا کے دروازے بند ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ راستے ختم ہو گئے۔ بندے کے لیے جب ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے تو اُس وقت اللہ کا دروازہ پہلے سے زیادہ کھلا ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لوگ پہلے دنیا کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں اور آخر میں اللہ کے، جبکہ ایک مومن جانتا ہے کہ اصل پناہ صرف اُس کے رب کے گھر میں ہے۔"

حمزہ نے خاموشی سے مسجد کے فرش کو دیکھا، پھر اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا قرآنِ مجید سینے سے لگا لیا۔

اُس رات پہلی بار اُس کے پاس سونے کے لیے کوئی بستر نہیں تھا۔

مگر پہلی بار اُسے یہ یقین بھی تھا کہ جس انسان کو اللہ اپنے گھر میں جگہ دے دے، اُسے دنیا سے نکال دینے والے درحقیقت اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

رات اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ مسجد کی دیواروں پر لگی زرد روشنیاں مدھم ہونے لگی تھیں۔ عشاء کی نماز کو کافی وقت گزر چکا تھا۔ نمازی ایک ایک کر کے جا چکے تھے، مگر مسجد کے ایک کونے میں حمزہ اسفند اب بھی خاموشی سے بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے کھلا ہوا قرآنِ مجید تھا، مگر آنکھیں الفاظ پر نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ ہر آیت کے ساتھ اُسے اپنی زندگی یاد آ رہی تھی۔ کبھی فلمی دنیا کی چکاچوند، کبھی عنایہ کی مسکراہٹ، کبھی گرینی کی ممتا، کبھی اپنے باپ کی نفرت... اور اب جمی کی موت۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی پوری زندگی چند دنوں میں بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہو۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دیر تک دعا مانگتا رہا۔

"یااللہ... اگر یہ میری سزا ہے تو میں راضی ہوں، مگر مجھے اتنی ہمت دے کہ میں تیرے فیصلے سے شکوہ نہ کروں۔ لوگ میرے کردار کو جانتے ہیں، تُو میرے دل کو جانتا ہے۔"

فجر کی نماز کے بعد حمزہ حسبِ معمول مسجد کی صفائی میں امام صاحب کا ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ جائے نمازیں درست کرتا، جوتے سیدھے کرتا، وضو خانے کا فرش صاف کرتا اور خاموشی سے ہر کام کر دیتا۔ اُس نے کبھی کسی کو اپنی پہچان نہیں بتائی۔ اُس کے لیے اب سب سے بڑی پہچان یہ تھی کہ وہ اللہ کے گھر میں چند لمحوں کا سکون پا لیتا تھا۔ مگر اسی دوران دو تین نمازیوں نے اُسے غور سے دیکھا۔ اُن میں سے ایک نے فوراً اپنا موبائل نکالا، اُس کی تصویر ٹی وی پر چلنے والی خبر سے ملائی اور بے اختیار بول اٹھا،

""یہ... یہی ہے نا وہ اداکار؟

چند ہی لمحوں میں مسجد کے صحن میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ کوئی اُسے حقارت سے دیکھ رہا تھا، کوئی آہستہ آہستہ اُس کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ایک شخص غصے سے بولا، "یہ وہی آدمی ہے جس کی ویڈیو

پورے انٹرنیٹ پر پھیلی ہوئی ہے۔ ایسے لوگ مسجد میں رہیں گے تو لوگ کیا کہیں گے؟" دوسرے نے بات آگے بڑھائی، "پہلے گناہ کرو، پھر مسجد میں آکر نیک بننے کی کوشش کرو... یہ نہیں چلے گا۔"

امام صاحب فوراً آگے بڑھے۔ اُن کے چہرے پر دکھ صاف نظر آرہا تھا۔ اُنہوں نے نہایت نرم لہجے میں کہا، "بھائیو، کسی انسان پر الزام ثابت ہونے سے پہلے اُس کے بارے میں فیصلہ دینا درست نہیں۔ اگر وہ توبہ کی نیت سے بھی آیا ہو تو اللہ کا گھر اُس کے لیے بند نہیں ہو سکتا۔"

مگر ہجوم میں جب جذبات عقل پر غالب آجائیں تو انصاف کی آواز دب جاتی ہے۔ چند بااثر افراد مسجد کی انتظامیہ کو بھی بلا لائے۔ بحث کافی دیر تک چلتی رہی۔ آخرکار امام صاحب بے بس ہو کر حمزہ کے قریب آئے۔ اُن کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ چند لمحے بول ہی نہ سکے۔ پھر کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگے، "بیٹا... مجھے معاف کر دینا۔ میں جانتا ہوں شاید حقیقت وہ نہیں جو لوگ سمجھ رہے ہیں... مگر میں اس وقت بے بس ہوں۔ اگر تم یہاں رہے تو یہ لوگ مسجد میں فساد کھڑا کر دیں گے۔"

حمزہ نے اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ہلکی سی مسکراہٹ کی، مگر وہ مسکراہٹ ٹوٹے ہوئے انسان کی تھی۔ اُس نے امام صاحب کے ہاتھ دونوں ہاتھوں سے پکڑے، ادب سے چومے اور آہستہ سے کہا، "آپ معافی کیوں مانگ رہے ہیں؟ اللہ کا گھر آپ کا نہیں، اللہ کا ہے۔ اگر اُس نے میرے لیے یہاں چند راتوں کی پناہ لکھ دی تھی تو وہ بھی اُس کا احسان تھا۔ شاید اب اُس نے میرے لیے کوئی اور راستہ لکھ دیا ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھایا، قرآنِ مجید سینے سے لگایا اور مسجد کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ پیچھے کھڑے امام صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُنہوں نے دل ہی دل میں دعا کی، "یا اللہ! اگر یہ نوجوان بے قصور ہے تو اُس کی مدد فرما، کیونکہ آج زمین والوں نے اُس کے لیے جگہ تنگ کر دی ہے۔"

مسجد سے نکلتے ہی بارش شروع ہو گئی۔ آسمان جیسے اُس کے ساتھ رو رہا تھا۔ حمزہ کئی گھنٹوں تک پیرس کی گلیوں میں بغیر کسی منزل کے چلتا رہا۔ بھوک سے اُس کا جسم کمزور ہو رہا تھا،

کمر میں درد بڑھتا جا رہا تھا، مگر اُس سے زیادہ درد اُس کے دل میں تھا۔ ایک پارک کی لکڑی کی بینچ پر بیٹھ کر اُس نے جیب سے عنایہ کی انگوٹھی نکالی۔ کافی دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا، "ڈان... میں نے تو صرف تمہیں حلال طریقے سے مانگنا چاہا تھا۔ شاید میری قسمت میں تمہیں کھونا ہی لکھا تھا۔"

اُسی وقت شہر کے دوسرے کونے میں فینگ پاگلوں کی طرح حمزہ کو تلاش کر رہا تھا۔ اُس نے پولیس اسٹیشن، ہسپتال، فلم اسٹوڈیو، پرانے فلیٹ، حتیٰ کہ اُن تمام جگہوں پر جا کر دیکھا جہاں حمزہ کبھی جایا کرتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں فرانزک رپورٹ تھی، جس پر واضح لکھا تھا کہ ویڈیو میں ردوبدل کیا گیا ہے۔ وہ ہر جگہ ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا، "بس ایک بار مل جاؤ، حمزہ... صرف ایک بار۔ میں ثابت کر دوں گا کہ تم بے قصور ہو۔"

ادھر کئی گھنٹے بھٹکنے کے بعد حمزہ کے قدم ایک بار پھر اپنے گھر کے سامنے جا رکے۔ اُس نے دور سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ پردے کے پیچھے گرینی کا دھندلا سا عکس نظر آ رہا تھا۔ اُس کا دل چاہا کہ صرف ایک بار اُنہیں دیکھ لے، اُن کے ہاتھ چوم لے، پھر ہمیشہ کے لیے چلا جائے۔ وہ ہمت کر کے دروازے تک پہنچا اور آہستہ سے دستک دی۔

چند لمحوں بعد دروازہ کھلا۔

سامنے اسفند صاحب کھڑے تھے۔

دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں۔

حمزہ کی آنکھوں میں آنسو تھے، مگر لب خاموش تھے۔

اسفند صاحب کے چہرے پر سختی پہلے سے بھی زیادہ تھی۔

انہوں نے نفرت بھری نگاہ سے حمزہ کو دیکھا اور سرد لہجے میں کہا، "میں نے تم سے کہا تھا نا... میرے لیے تم مر چکے ہو۔"

حمزہ نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا، "بابا... میں گرینی کو ایک بار دیکھنا چاہتا تھا۔"

اسفند صاحب نے غصے سے دروازہ مزید بند کرتے ہوئے جواب دیا،

"جس دن تم نے میرا نام بدنام کیا، اُس دن تم نے اس گھر پر اپنا حق بھی کھو دیا۔ دوبارہ یہاں آنے کی کوشش مت کرنا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔

دروازے کے بند ہونے کی آواز شاید حمزہ کے دل کے آخری سہارے کو بھی توڑ گئی۔

اندر گرینی دروازے تک دوڑیں، مگر اسفند صاحب نے اُنہیں روک لیا۔ وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں اور بچوں کی طرح رونے لگیں۔ دوسری طرف حمزہ نے بند دروازے پر ایک لمحے کے لیے اپنا ہاتھ رکھا، جیسے وہ اُس گھر سے نہیں، اپنی پوری زندگی سے آخری بار رخصت لے رہا ہو۔

پھر اُس نے آسمان کی طرف دیکھا، آنسو صاف کیے اور دھیمی آواز میں کہا،

"حسبنا اللہ و نعم الوکیل"

اور تنہا، زخمی اور ٹوٹا ہوا انسان ایک بار پھر پیرس کی بے رحم گلیوں میں گم ہو گیا، جبکہ اُسے ڈھونڈنے والا اُس کا واحد دوست فینگ ابھی بھی اُس شہر کی ہر سڑک پر اُمید لیے پھر رہا تھا۔

حمزہ لڑکھڑاتے قدموں سے سنسان سڑک پر چلتا رہا۔ بارش اب تھم چکی تھی، مگر اُس کے کپڑے اب بھی بھیگے ہوئے تھے۔ کئی دنوں کی بھوک، بیماری اور مسلسل ذہنی اذیت نے اُس کے جسم سے جیسے ساری طاقت چھین لی تھی۔ اچانک اُس کے قدم جواب دے گئے اور وہ سڑک کے کنارے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ برسوں سے لوگوں کو ہنسانے والا اداکار آج خود اپنے آنسوؤں کے سامنے بے بس تھا۔

کافی دیر تک وہ خاموش روتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اُس نے اپنا سر اٹھایا اور تاریک آسمان کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے صرف اتنے الفاظ نکلے،

"یا اللہ... یہ کیسی آزمائش ہے؟ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میں بے قصور ہوں، مگر تیرے بندے مجھے مجرم سمجھ بیٹھے ہیں۔ جس سے محبت کی، اُس نے مجھ پر یقین نہ کیا۔ جس باپ کی محبت کا برسوں انتظار کیا، اُس نے مجھے اپنا بیٹا ماننے سے انکار کر دیا۔ جن لوگوں کے لیے میں کبھی ہیرو تھا، آج وہی مجھے پتھر مارنے کو تیار ہیں۔ یا رب! اگر یہ سب میرے گناہوں کا کفارہ ہے تو میں تیرے فیصلے پر راضی ہوں، مگر میرے دل میں اپنے دین سے بدگمانی پیدا نہ ہونے دینا۔"

وہ سسکتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اُس نے اپنے آنسو صاف کیے اور پھر دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے۔

"یا اللہ... میں لوگوں سے نہیں ہارا... میں اپنے نفس سے بھی نہیں ہارنا چاہتا۔ اگر پوری دنیا میرے خلاف ہو جائے تو بھی مجھے اپنے در سے دور مت کرنا۔ دنیا کے دروازے بند ہو جائیں تو کوئی بات نہیں، بس تیرا دروازہ میرے لیے کبھی بند نہ ہو۔ مجھے اس آزمائش سے نکالنے سے پہلے اتنا مضبوط ضرور بنا دینا کہ کل قیامت کے دن میں یہ نہ کہوں کہ میں تیرے فیصلے پر صبر نہ کر سکا۔"

"فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا، اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا"

"بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے، بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔"

حمزہ نے اپنے سینے سے لگے قرآنِ مجید کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اُس کے پاس نہ گھر بچا تھا، نہ شہرت، نہ محبت، نہ خاندان... مگر اُس لمحے بھی اُس کے دل میں ایک یقین زندہ تھا کہ اگر اللہ کسی بندے کو آزماتا ہے تو اُسے تنہا نہیں چھوڑتا۔ رات بہت لمبی ضرور ہو سکتی ہے، لیکن فجر کو طلوع ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

رات اپنے اختتام پر تھی۔ پیرس کی ٹھنڈی ہوا سڑکوں پر بکھرے سوکھے پتوں کو اِدھر اُدھر اڑا رہی تھی۔ شہر کی روشنیاں اپنی جگہ قائم تھیں، مگر حمزہ اسفند کی زندگی میں ہر روشنی بجھ چکی تھی۔ وہ ایک پرانے پل کے نیچے، دریا کے کنارے بنی پتھریلی سیڑھیوں پر خاموش بیٹھا تھا۔ دونوں کہنیوں کو

گھٹنوں پر ٹکائے، ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے، جیسے وہ دنیا سے نہیں بلکہ خود سے نظریں چرانا چاہتا ہو۔ اُس کے برابر رکھا چھوٹا سا بیگ، اور جیب میں رکھی ایک انگوٹھی... یہی اُس کی پوری دنیا رہ گئی تھی۔

دوسری طرف فینگ کئی گھنٹوں سے پاگلوں کی طرح پورے پیرس کی سڑکیں ناپ رہا تھا۔ اُس نے ہر اُس جگہ جا کر دیکھا جہاں حمزہ کبھی جایا کرتا تھا۔ ہر ناکامی کے بعد اُس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر کار جب اُس کی گاڑی دریا کے قریب سے گزری تو اُس کی نظر دور بیٹھے ایک مانوس وجود پر پڑی۔ اُس نے اچانک بریک لگائی۔ چند لمحے وہ گاڑی کے اندر ہی بیٹھا رہا۔

سامنے بیٹھا شخص وہی تھا... مگر حقیقت میں وہ حمزہ اسفند نہیں لگ رہا تھا۔ وہ شخص جس کے ایک مسکرانے پر ہزاروں لوگ دیوانے ہو جاتے تھے، آج خود اپنی زندگی سے ہارا ہوا نظر آ رہا تھا۔

فینگ آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھا۔ اُس نے قریب آ کر بھی فوراً آواز نہیں دی۔ بس خاموشی سے اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ دونوں دوست کئی منٹ تک ایک لفظ بولے بغیر دریا کے بہتے پانی کو دیکھتے رہے۔ اُس خاموشی میں بھی برسوں کی دوستی بول رہی تھی۔

کافی دیر بعد فانگ نے دھیمی آواز میں کہا، "میں پورا شہر چھان آیا ہوں"

حمزہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"گرینی رو رہی ہیں"

حمزہ خاموش رہا۔

"اور میں بھی"

یہ سن کر حمزہ نے آہستہ سے اپنا سر اٹھایا۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں، چہرہ زرد پڑ چکا تھا، ہونٹ پھٹے ہوئے تھے اور تھکن اتنی گہری تھی کہ جیسے کئی برسوں سے سویا نہ ہو۔

فینگ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم اکیلے نہیں ہو، حمزہ۔"

یہ جملہ سنتے ہی حمزہ کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو بہنے لگے، مگر اُس نے فوراً اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ شاید وہ اپنے واحد دوست کے سامنے بھی کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

فینگ نے اپنی جیب سے وہ فرانزک رپورٹ نکالی اور اُس کے سامنے رکھ دی۔ "دیکھو... میں پاگلوں کی طرح بھاگتا رہا، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ تم بے قصور ہو۔ رپورٹ آگئی ہے۔ ویڈیو جعلی ہے، اس میں ردوبدل کیا گیا ہے۔ تم سچ کہہ رہے تھے، حمزہ... تم واقعی بے قصور ہو۔"

حمزہ نے رپورٹ کی طرف ایک نظر بھی نہ ڈالی۔

وہ صرف خاموشی سے دریا کو دیکھتا رہا۔

کچھ لمحوں بعد اُس نے بہت دھیمی آواز میں کہا، "یہ رپورٹ... میرے بابا کے دل تک پہنچ سکتی ہے؟"

فانگ خاموش ہو گیا۔

"یہ رپورٹ... جمی کو زندہ کر سکتی ہے؟"

خاموشی مزید گہری ہو گئی۔

"یہ رپورٹ... عنایہ کے ہاتھ کا وہ تھپڑ مٹا سکتی ہے؟"

فینگ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

حمزہ کی آواز ٹوٹنے لگی۔

"یہ رپورٹ... وہ چند منٹ واپس لاسکتی ہے جب مجھے صرف ایک بار سنا جانا چاہیے تھا؟"

فینگ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

زندگی میں بعض سوال ایسے ہوتے ہیں جن کے جواب قانون، ثبوت اور منطق بھی نہیں دے سکتے۔

فینگ نے گہری سانس لی، پھر مضبوط لہجے میں کہا، "چلو... گھر چلتے ہیں۔ میں خود تمہارے بابا سے بات کروں گا۔ انہیں سب سچ بتاؤں گا۔ اب کسی کو تمہیں غلط سمجھنے نہیں دوں گا۔"

حمزہ نے آہستہ آہستہ اپنی نظریں اُس کی طرف اٹھائیں۔ اُس کی آنکھوں میں امید نہیں تھی... صرف شدید تھکن تھی، جیسے مسلسل لڑتے لڑتے ایک سپاہی کے اندر لڑنے کی طاقت ہی ختم ہو گئی ہو۔

وہ چند لمحے خاموشی سے اپنے دوست کو دیکھتا رہا۔

پھر اُس نے لب کھولے،

"ماں باپ تو اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں نا؟ باپ تو ایسے ہی ہوتے ہیں، لیکن یار میرا باپ نہ ایسا نہیں ہے، ساری زندگی مجھے ایک انویسمنٹ گھڑی سمجھ کر پالا ہے انہوں نے جو نہیں کامیاب ہوئی تو نکال کر باہر پھینک دیا، یار جن سڑکوں پر مجھے پھرنے کی اجازت نہیں تھی آج انہیں سڑکوں پر میں رل رہا ہوں، وہ حمزہ جو عیش و عشرت کی زندگی گزارتا تھا، آج وہی حمزہ فقیروں والی زندگی گزار رہا ہے، یار ساری زندگی اپنی مرضی مجھ پر تھوپتے آئے ہیں حمزہ یہ کرلو حمزہ وہ کرلو، کبھی مجھ سے پوچھا میں کیا چاہتا ہوں، یار نہیں ہوں میں اِن کا بیٹا"

وہ بے اختیار رو پڑا،

"یہ کہتے ہیں میری ماں کا کریکٹر ٹھیک نہیں تھا، یار یہ ہوتے کون ہیں انہیں جج کرنے والے؟ اب جب میں ان سے ملنے جاؤں گا تو کیا منہ دِکھاؤں گا؟"

اس کی آنکھیں مسلسل بھیگ رہی تھی۔

فینگ نے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھا اور دونوں دوست رو پڑے۔

کچھ رشتے خون سے نہیں، اخلاص سے بنتے ہیں۔ دوستی بھی اُنہی نعمتوں میں سے ایک ہے جو ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ سچا دوست وہ نہیں ہوتا جو صرف خوشیوں میں ساتھ کھڑا ہو، بلکہ وہ ہوتا ہے جو پوری دنیا کے چھوڑ دینے کے بعد بھی تمہارا ہاتھ تھامے رکھے۔ جب لوگ تمہاری خاموشی کو جرم سمجھنے لگیں، جب اپنے بھی اجنبی بن جائیں، جب ہر دروازہ بند ہو جائے، تب اگر کوئی ایک شخص یہ کہے کہ "مجھے تم پر یقین ہے" تو سمجھ لو اللہ نے تمہیں دنیا کی سب سے قیمتی دولت عطا کر دی ہے۔

حمزہ اور فانگ کی دوستی بھی ایسی ہی تھی۔ نہ زبان کا فرق، نہ مذہب کا فرق، نہ حالات کی سختی... کوئی چیز اس رشتے کو کمزور نہ کر سکی۔ پوری دنیا حمزہ کے خلاف کھڑی تھی، مگر فانگ اُس کے ساتھ کھڑا تھا، کیونکہ سچے دوست کانوں سے سنی ہوئی باتوں پر نہیں، برسوں میں پہچانے ہوئے کردار پر یقین کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر اللہ تم سے کوئی نعمت واپس لے لے، مگر ایک مخلص دوست تمہارے پاس چھوڑ دے، تو سمجھو تم ابھی بھی خالی ہاتھ نہیں ہوئے۔

فینگ نے آخر کار زبردستی حمزہ کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اپنی گاڑی تک لے آیا۔ پورے راستے دونوں میں ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔ کبھی یہی دونوں دوست گاڑی میں بیٹھ کر قہقہے لگاتے تھے، موسیقی سنتے تھے

اور مستقبل کے خواب بُنا کرتے تھے، مگر آج خاموشی ہی اُن کی گفتگو تھی۔ فینگ بار بار چوری چھپے حمزہ کی طرف دیکھتا، مگر ہر بار اُسے وہی خالی نظریں دکھائی دیتیں۔ جیسے اُس کے اندر سے جذبات ہی مر چکے ہوں۔ گاڑی آخرکار فینگ کے گھر کے سامنے رکی۔ اس بار دروازہ اسٹیلا نے کھولا۔ اُس نے خاموشی سے حمزہ کی حالت دیکھی، پھر اپنے والد کی طرف دیکھا۔ شاید اُنہیں بھی اپنی سختی پر ندامت تھی۔ کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ صرف دروازہ کھول دیا گیا۔ بعض اوقات خاموش لفظوں سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔

فینگ حمزہ کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ کمرے کی ایک دیوار پر دونوں کی پرانی تصویریں لگی تھیں۔ کہیں دونوں کالج میں ہنس رہے تھے، کہیں پہاڑوں پر، کہیں بارش میں بھیگتے ہوئے، اور ایک تصویر میں حمزہ پہلی فلم سائن کرنے کے بعد فینگ کو گلے لگائے کھڑا تھا۔ حمزہ کافی دیر تک اُن تصویروں کو دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا، "کتنا عجیب ہے نا... تصویروں میں موجود لوگ کتنے خوش ہوتے ہیں، مگر وقت اُنہیں پہچاننے کے قابل بھی نہیں چھوڑتا۔"

دوسری طرف عنایہ کے دل کی حالت بھی کسی طوفان سے کم نہ تھی۔ وہ جب بھی ہسپتال کی راہداری سے گزرتیں، بے اختیار اُن کی نظریں اُس کونے کی طرف اٹھ جاتیں جہاں ایک وقت وہ جھاڑو ہاتھ میں لیے عجیب عجیب حرکتیں کرنے والا کھڑا ہوتا تھا۔ کینٹین میں جاتے ہوئے اُنہیں اُس کی آواز سنائی دیتی، "باجی، آج چائے میری طرف سے۔"

اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے یوں لگتا جیسے کوئی دروازہ کھٹکھٹا کر پھر چینی مانگنے والا ہے۔ مگر ہر جگہ صرف خاموشی تھی۔ پہلی بار اُنہیں احساس ہوا کہ بعض لوگوں کی موجودگی کا اندازہ اُن کے چلے جانے کے بعد ہوتا ہے۔

اُدھر حمزہ آہستہ آہستہ خود سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ وہی حمزہ جو چند دن پہلے قرآن سینے سے لگا کر آزمائش میں صبر مانگ رہا تھا، اب اپنے کمرے کے پردے بند کر کے گھنٹوں خاموش بیٹھا رہتا۔ نمازیں چھوٹنے لگیں۔ تلاوت رک گئی۔ دعا کے لیے اٹھنے والے ہاتھ اب گھٹنوں پر بے جان پڑے رہتے۔ شیطان انسان پر اُس وقت سب سے زیادہ حملہ کرتا ہے جب وہ غم میں اپنے رب سے دور ہونے لگتا ہے۔
آزمائش خود انسان کو نہیں توڑتی، بلکہ آزمائش میں اللہ سے تعلق کمزور ہو جائے تو انسان اندر سے بکھرنے لگتا ہے۔

کئی کئی راتیں ایسی گزرتیں جب حمزہ کو نیند نہ آتی۔ آنکھ لگتی بھی تو اچانک وہ چونک کر اٹھ بیٹھتا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے کمرے کے دروازے کے پاس جمی خاموش کھڑی ہے۔ وہی نم آنکھیں... وہی افسوس بھرا چہرہ۔ ایک رات اُس نے صاف سنا، "حمزہ... تم نے اچھا نہیں کیا..." وہ گھبرا کر اُٹھا، لائٹ جلائی، مگر کمرہ خالی تھا۔ اُس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ "نہیں... یہ حقیقت نہیں ہو سکتی..." مگر اگلی رات وہی آواز پھر سنائی دی، پھر ایک سایہ، پھر وہی چہرہ۔ حقیقت اور وہم کی حدیں آہستہ آہستہ دھندلی ہونے لگیں۔

فینگ نے جب یہ سب دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔ اگلی ہی صبح وہ حمزہ کو ایک ماہرِ نفسیات کے پاس لے گیا۔ کئی گھنٹوں کے تفصیلی معائنے، سوالات اور مشاہدے کے بعد ڈاکٹر نے گہری سانس لی اور نہایت سنجیدگی سے کہا، "شدید ذہنی صدمہ، مسلسل تناؤ، نیند کی شدید کمی اور نفسیاتی دباؤ نے ان کی ذہنی

کیفیت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ انہیں فوری علاج اور مسلسل نگرانی کی ضرورت ہے۔ ان میں نفسیاتی علامات پیدا ہو چکی ہیں، اور اگر بروقت علاج نہ کیا گیا تو یہ شیز و فرینیا کی واضح شکل اختیار کر سکتی ہیں۔"

فینگ کے ہاتھ سے رپورٹ تقریباً گر گئی۔

حمزہ خاموش بیٹھا رہا۔

اُسے جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔

وہ صرف کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

شاید اُسے اب بھی یقین تھا کہ اگلے ہی لمحے جمی آکر اُس سے کہے گی،

" حمزہ... میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گی!"

وقت گزرتا رہا، مگر حمزہ کی زندگی جیسے وہیں رک گئی تھی۔ جسم پہلے ہی بیماری سے لڑ رہا تھا، اب روح بھی تھکنے لگی تھی۔ وہ جو کبھی ہر آزمائش کے بعد قرآن کھول کر بیٹھ جاتا تھا، اب کئی کئی دن قرآن کو صرف دور سے دیکھتا رہتا۔ جائے نماز کمرے کے ایک کونے میں ویسے ہی پڑی رہتی، مگر اُس پر سجدہ کرنے والا انسان اندر سے ٹوٹ چکا تھا۔

وہ اکثر راتوں کو جاگ کر ایک ہی سوال سوچتا رہتا، "اگر میں عنایہ سے ملا ہی نہ ہوتا تو کیا میری زندگی ایسی ہوتی؟" مگر اگلے ہی لمحے دل کے کسی کونے سے جواب آتا، "قصور محبت کا نہیں... قصور اس دل کا ہے جو اپنے رب سے مضبوط تعلق قائم نہ رکھ سکا۔"

انسان جب کسی مخلوق سے اپنی امیدیں اس حد تک وابستہ کر لیتا ہے کہ اُس کے ٹوٹنے سے اللہ سے تعلق بھی کمزور ہونے لگے، تو وہ محبت آزمائش بن جاتی ہے۔ دنیا کی ہر محبت فانی ہے، مگر اللہ کی محبت وہ واحد سہارا ہے جو انسان کو ٹوٹنے نہیں دیتی۔

حقیقت یہی ہے کہ اس دنیا میں سب سے مشکل جنگ کسی دشمن سے نہیں، اپنے ایمان کی حفاظت کی جنگ ہے۔ مال کھو دینا آسان ہے، صحت کھو دینا آسان ہے، شہرت کھو دینا بھی آسان ہے، مگر مصیبتوں کے طوفان میں اللہ پر یقین قائم رکھنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ شیطان کبھی صرف گناہ کی دعوت نہیں دیتا، وہ پہلے انسان کو مایوس کرتا ہے، پھر اُسے اللہ سے دور کرتا ہے، یہاں تک کہ بندہ اپنے ہی اندھیروں میں گم ہو جاتا ہے۔ حمزہ بھی اسی خطرناک موڑ پر کھڑا تھا۔

راتیں اب اُس کے لیے عذاب بن چکی تھیں۔ کئی کئی دن جاگنے کے بعد جب اُسے نیند آتی تو وہ چونک کر اُٹھ بیٹھتا۔ کبھی اُسے جمی دروازے کے پاس کھڑی نظر آتی، کبھی اُسے محسوس ہوتا کہ کوئی اُس کا نام لے کر پکار رہا ہے، کبھی وہ خالی کمرے میں کسی سے بات کرنے لگتا۔ ایک دن اسٹیلا نے دیکھا کہ حمزہ بالکونی میں کھڑا کسی ایسے شخص سے معافی مانگ رہا تھا جو وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف نہیں تھا... بلکہ ایسا دکھ تھا جسے الفاظ بیان نہیں کر سکتے تھے۔

فینگ یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر ٹوٹنے لگا۔ وہ دن میں عدالتوں، فرانزک ماہرین اور پرائیویٹ انویسٹیگیٹرز کے چکر لگاتا، اور رات کو اپنے دوست کے بکھرتے ہوئے ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کرتا۔ بالآخر اُس نے حمزہ کو ایک معروف ماہرِ نفسیات کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ کئی سیشنز، طبی معائنوں اور مسلسل مشاہدے کے بعد ڈاکٹر نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا، "شدید نفسیاتی صدموں، مسلسل ذہنی دباؤ، نیند کی شدید کمی اور موجودہ علامات کی بنیاد پر یہ واضح ہے کہ حمزہ اب شیزوفرینیا کا

شکار ہو چکا ہے۔ اسے فوری علاج، ادویات، مسلسل نفسیاتی نگرانی اور سب سے بڑھ کر محفوظ اور محبت بھرے ماحول کی ضرورت ہے۔

یاد رہے،

ڈپریشن کسی ایک شخص کے چلے جانے سے نہیں ہوتا بلکہ اس امید کے ٹوٹ جانے سے ہوتا ہے۔

جس کے سہارے انسان جی رہا ہوتا ہے۔

یہ الفاظ سن کر فینگ کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ اُس نے پہلی بار خود کو بے بس محسوس کیا۔ وہ قانون کی جنگ لڑ سکتا تھا، مجرموں کو عدالت تک لا سکتا تھا، مگر اپنے دوست کے ٹوٹے ہوئے ذہن کو واپس پہلے جیسا نہیں بنا سکتا تھا۔

اُدھر اسٹیلا نے بھی خاموش رہنے سے انکار کر دیا۔ ایک صحافی ہونے کے ناطے اُس نے اپنی تمام تر توانائیاں اس کیس کی حقیقت سامنے لانے پر لگا دیں۔ وہ جمی کی موت، وائرل ویڈیو، ڈیجیٹل شواہد اور اس سازش کے پیچھے موجود لوگوں کے بارے میں ایک ایک ثبوت جمع کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر سچ جلد سامنے نہ آیا تو شاید قانون حمزہ کو بے گناہ ثابت کر دے، مگر اُس کا ٹوٹا ہوا ذہن اور بکھرا ہوا ایمان کبھی پہلے جیسا نہ ہو سکے۔

پیرس کی ایک سرد صبح ہمیشہ کی طرح ہسپتال کے دروازے مریضوں کے لیے کھل چکے تھے، مگر ڈاکٹر عنایہ کے لیے ہر دن اب پہلے سے زیادہ بوجھل ہو گیا تھا۔ وہ وارڈ سے او پی ڈی، او پی ڈی سے آپریشن تھیٹر اور پھر اپنے کمرے تک چلتی ضرور تھیں، لیکن اُن کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ کئی دن گزر چکے تھے، مگر نہ وہ ہیلمٹ والا مریض دوبارہ نظر آیا، نہ وہ خڑوس پڑوسی جسے وہ دل ہی دل میں "خڑوس"

کہہ کر چھیڑا کرتی تھیں، نہ وہ سوپیر جو جھاڑو ہاتھ میں لے کر اُنہیں ہنسا دیتا تھا۔ پورا ہسپتال ویسا ہی تھا، مگر نجانے کیوں ہر چیز ادھوری لگنے لگی تھی۔

ایک دن عنایہ حسبِ معمول کینٹین میں داخل ہوئیں۔ بے اختیار اُن کی نظریں اُس کونے کی طرف اٹھیں جہاں حمزہ ہمیشہ کھڑا ہو کر کہتا تھا، "باجی، آج کافی میری طرف سے۔" مگر آج وہاں کوئی نہیں تھا۔ کینٹین کے بزرگ ملازم نے اُنہیں خاموش کھڑے دیکھا تو مسکرا کر بولا، "ڈاکٹر صاحبہ... آج بھی اُس لڑکے کو ڈھونڈ رہی ہیں؟"

عنایہ چونک گئیں۔

"ک... کون لڑکا؟"

بزرگ ملازم ہلکا سا مسکرایا۔

وہی... ہیلمٹ والا مریض... پھر سوپیر بننے والا۔ عجیب لڑکا تھا۔ سب کا کام بھی کر دیتا تھا اور کسی کو اپنی تکلیف کا احساس بھی نہیں ہونے دیتا تھا۔

عنایہ نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

"وہ... اب نہیں آتا؟"

بوڑھے شخص نے افسوس سے سر ہلایا۔

"ویڈیو کے بعد ایک دن بھی نہیں آیا۔ سنا ہے سب کچھ چھوڑ کر چلا گیا۔"

یہ سنتے ہی عنایہ کے دل میں عجیب سی کسک اٹھی۔

وہ خاموشی سے کینٹین سے باہر نکل آئیں۔

پہلی بار اُنہوں نے محسوس کیا کہ انسان کی عادت بھی محبت کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔ جب کوئی روزانہ زندگی کا حصہ بن جائے تو اُس کی غیر موجودگی شور مچانے لگتی ہے۔

اسی شام وہ اپارٹمنٹ واپس لوٹیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بے اختیار اُن کی نظریں اُس دروازے پر جا ٹھہریں جہاں سے کبھی ایک لمبا سا شخص ماسک، چشمہ اور لمبا کوٹ پہن کر چینی مانگنے آجاتا تھا۔ کئی لمحے وہ بند دروازے کو دیکھتی رہیں۔ آخر کار ہمت کر کے آہستہ سے دستک دی۔

کوئی جواب نہ آیا۔

انہوں نے دوبارہ دستک دی۔

خاموشی،

اتنے میں عمارت کا مالک وہاں آ گیا۔

عنایہ نے دھیمی آواز میں پوچھا، "یہاں رہنے والا شخص... کہاں گیا؟"

بوڑھے مالک نے گہری سانس لی۔

"وہ؟"

"بیٹا... وہ تو کئی دن پہلے یہ فلیٹ خالی کر گیا۔"

"سامان بھی زیادہ نہیں تھا۔ بس ایک چھوٹا سا بیگ اٹھایا اور خاموشی سے چلا گیا۔"

"جاتے وقت صرف ایک بات کہہ رہا تھا"

عنایہ کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"کیا؟"

بوڑھے شخص نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"دعا کیجیے... اللہ مجھے خود سے بھی بچا لے۔"

یہ جملہ عنایہ کے دل میں تیر کی طرح لگا۔

وہ کافی دیر تک بند دروازے کو دیکھتی رہیں۔

پہلی بار اُن کے دل نے اُن سے سوال کیا۔

"اگر وہ واقعی مجرم تھا... تو اُس کی آنکھوں میں اتنا درد کیوں تھا؟"

"اور اگر وہ بے گناہ تھا"

"تو میں نے کس انسان کو اپنے ہاتھوں سے توڑ دیا؟"

اُسی لمحے شہر کے دوسرے کونے میں فینگ اپنی گاڑی میں بیٹھا ایک پرانی سی سی ٹی وی فوٹیج بار بار دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر واضح نظر آ رہا تھا کہ جمی اور حمزہ کی ملاقات ویڈیو میں دکھائی گئی حقیقت سے بالکل مختلف تھی۔ حمزہ چند منٹ بعد وہاں سے چلا گیا تھا، جبکہ وائرل ویڈیو میں اُن منٹوں کو جوڑ کر ایک جھوٹا منظر بنایا گیا تھا۔

فانگ کی آنکھوں میں امید کی ایک کرن جاگی۔

وہ آہستہ سے بولا،

"بس... ایک ثبوت اور"

"صرف ایک ثبوت"

"پھر پوری دنیا کو بتاؤں گا کہ حمزہ اسفند گناہگار نہیں... مظلوم تھا۔"

مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جس دوست کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے وہ دن رات ایک کر رہا تھا،

وہ دوست ہر گزرتے دن کے ساتھ حقیقت کی دنیا سے مزید دور ہو تا جا رہا تھا۔

رات کے تقریباً تین بج رہے تھے۔ پورا گھر گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ فینگ اور اسٹیلا اپنے اپنے کمروں میں تھے، مگر اُن کی نیند بھی کئی راتوں سے حمزہ کی وجہ سے ادھوری رہنے لگی تھی۔ کمرے کی ایک مدھم روشنی جل رہی تھی۔ حمزہ بستر پر لیٹا ضرور تھا، لیکن اُس کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ اچانک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے بہت آہستہ سے اُس کا نام پکارا ہو۔

"حمزہ"

وہ فوراً اُٹھ بیٹھا۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

چند لمحوں بعد وہی آواز دوبارہ آئی۔

"حمزہ... میری طرف دیکھو..."

اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ بستر سے اُٹھا اور آواز کے تعاقب میں چلنے لگا۔ کمرے کے ایک کونے میں لگا قد آدم آئینہ اُس کے سامنے تھا۔ وہ اُس کے قریب جا کر رک گیا۔

پہلے تو آئینے میں اُسے اپنا ہی عکس نظر آیا... کمزور، زرد چہرہ، بڑھی ہوئی داڑھی، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور ایک ایسا انسان جو چند ہی ہفتوں میں برسوں بوڑھا لگنے لگا تھا۔

پھر اچانک،

اُسے آئینے میں اپنا عکس بدلتا ہوا محسوس ہوا۔

وہاں جمی کھڑی تھی۔

ہاتھ میں لمبا سا چاقو لیے،

آنکھوں میں آنسو،

چہرے پر خوف،

اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔

حمزہ کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"ج... جمی...؟"

جمی نے دھیرے سے کہا،

"میں نے کہا تھا نا... میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گی!"

حمزہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"نہیں... نہیں... مجھے مت مارو!... اگر اُس دن میں تم سے ملنے نہ آتا... اگر میں تمہیں اکیلا نہ چھوڑتا... تو شاید آج تم زندہ ہوتیں"

جمی نے صرف مسکرا کر سر جھکا لیا۔

اگلے ہی لمحے آئینے کا منظر پھر بدل گیا۔

اب وہاں ایک دوسرا حمزہ کھڑا تھا۔

وہی مشہور اداکار،

صاف ستھرا سوٹ،

اعتماد سے بھری مسکراہٹ،

ہزاروں مداحوں کا ہیرو،

وہ آئینے کے اندر والا حمزہ باہر کھڑے ٹوٹے ہوئے حمزہ کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا،

"دیکھ لیا؟"

"جس شہرت پر تمہیں ناز تھا"

"وہ ایک ویڈیو سے ختم ہو گئی۔"

"جس محبت پر تمہیں یقین تھا"

"وہ ایک تھپڑ میں بکھر گئی۔"

"جس باپ کی محبت کے لیے تم بچپن سے ترستے رہے"

"اُس نے ایک لمحے میں تمہیں اپنا بیٹا ماننے سے انکار کر دیا۔"

حمزہ نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔

"خاموش ہو جاؤ"

"خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ"

مگر آوازیں رکنے کے بجائے بڑھتی چلی گئیں۔

کبھی جمی،

کبھی عنایہ،

کبھی اسفند صاحب،

کبھی سوشل میڈیا پر چیختے ہوئے لوگ،

ہر آواز اُس کے دماغ میں ایک ساتھ گونجنے لگی۔

"مجرم"

"دھوکے باز"

"منافق"

"قاتل"

حمزہ زور سے چیخ اٹھا۔

" بس کرو... خدا کے لیے بس کرو... میں نے کچھ نہیں کیا... میں بے قصور ہوں"

اُس نے بے اختیار سامنے رکھا گلدان اٹھایا اور پوری طاقت سے آئینے پر دے مارا۔

دھڑام!

آئینہ سینکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گیا۔

شیشے کے ٹکڑے پورے کمرے میں پھیل گئے۔

ایک نوکیلا ٹکڑا احمزہ کے ہاتھ میں پیوست ہو گیا۔

خون فرش پر ٹپکنے لگا۔

مگر اُسے درد کا احساس بھی نہ ہوا۔

وہ ٹوٹے ہوئے آئینے کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

ہر شیشے کے ٹکڑے میں اُسے الگ الگ چہرے نظر آ رہے تھے۔

کسی ٹکڑے میں جمی،

کسی میں عنایہ،

کسی میں گرینی،

کسی میں اُس کا باپ،

اور ایک ٹکڑے میں وہ خود،

اُس نے خون آلود ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھوا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔

شور سن کر فانگ اور اسٹیلا دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

سامنے کا منظر دیکھ کر دونوں کے قدم وہیں رک گئے۔

پورا کمرہ شیشوں سے بھرا ہوا تھا۔

حمزہ کے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔

اور وہ ٹوٹے ہوئے آئینے کے سامنے بیٹھا کسی ایسے شخص سے باتیں کر رہا تھا،

جو وہاں موجود ہی نہیں تھا۔

فانگ فوراً اُس کے پاس بھاگا، اُس کے کندھوں کو پکڑ کر ہلایا۔

"حمزہ... میری طرف دیکھو... میں ہوں... فینگ"

مگر حمزہ خالی نظروں سے ایک کونے کو دیکھ رہا تھا۔

وہ آہستہ سے بولا،

"فینگ"

"جمی ابھی یہیں کھڑی تھی"

"اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا چاقو جس سے وہ مجھے مار ڈالے گی۔"

یہ سنتے ہی فینگ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اسٹیلا نے فوراً ایمبولینس کو فون کیا۔

کچھ دیر بعد ماہرِ نفسیات اور میڈیکل ٹیم پہنچ گئی۔

کافی دیر کے معائنے، سوالات اور گزشتہ کئی ہفتوں کی علامات سننے کے بعد ڈاکٹر نے گہری سانس لی۔

وہ نہایت سنجیدگی سے بولا،

شدید ذہنی صدمے، مسلسل نفسیاتی دباؤ، نیند کی شدید کمی اور حقیقت سے کٹتی ہوئی باتوں کی وجہ سے یہ شیزوفرینیا کا واضح کیس بن چکا ہے۔ علاج ممکن ہے... مگر ایک شرط ہے۔

فینگ نے فوراً پوچھا،

"کیا شرط؟"

ڈاکٹر نے حمزہ کی طرف دیکھا، جو اب بھی خاموشی سے ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔

پھر آہستہ سے کہا،

"دوائیں صرف دماغ کا علاج کرتی ہیں"

"مگر اس انسان کا دل"

"وہ تو بہت پہلے ٹوٹ چکا ہے"

"اور ٹوٹے ہوئے دل کا علاج کسی میڈیکل اسٹور میں نہیں ملتا۔"

یہ سن کر فینگ بے اختیار حمزہ کے گلے لگ گیا۔

وہ پہلی بار بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

"مجھے معاف کر دینا، میرے دوست"

"میں قانون کی لڑائی تو لڑتا رہا"

"مگر تمہارے دل کی جنگ ہار گیا"

کمرے میں صرف ایک آواز باقی رہ گئی تھی۔

فیننگ کی سسکیاں،

اور ٹوٹے ہوئے شیشوں پر ٹپکتے ہوئے حمزہ کے خون کے قطرے۔

AFTER FEW WEEKS

پیرس کی صبح ابھی پوری طرح روشن بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہر نیوز چینل پر ایک ہی خبر چلنے لگی۔

"مشہور اداکار حمزہ اسفند بے قصور ثابت... وائرل ویڈیو مصنوعی ذہانت اور ڈیجیٹل ایڈیٹنگ کے ذریعے تیار کی گئی تھی۔ اصل ملزمان گرفتار۔"

اسٹیلا کی آواز نیوز روم میں غیر معمولی طور پر بھاری تھی۔ وہ ایک صحافی نہیں، ایک ایسے انسان کی گواہ بن کر خبر پڑھ رہی تھی جس کی زندگی چند منٹ کی جھوٹی ویڈیو نے برباد کر دی تھی۔

عدالتی تحقیقات، فرانزک رپورٹ، سی سی ٹی وی ریکارڈنگ اور جمی کے آخری بیان نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حمزہ اسفند پر لگایا گیا ہر الزام بے بنیاد تھا۔ وہ ابتدا سے بے گناہ تھا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ انصاف وقت پر نہ مل سکا، اور ایک بے قصور انسان اپنی عزت، اپنی محبت، اپنا گھر، اپنی ذہنی صحت اور اپنی زندگی کا سکون کھو بیٹھا۔

یہ خبر لمحوں میں پورے پیرس میں پھیل گئی۔

وہی لوگ جو کل تک حمزہ کو مجرم کہتے تھے، آج شرمندگی سے نظریں جھکا رہے تھے۔ سوشل میڈیا پر معافی کے پیغامات کی بھرمار تھی، مگر کچھ معافیاں ہمیشہ دیر سے آتی ہیں۔

اسی لمحے اسفند ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں ٹی وی چل رہا تھا۔ گرینی خاموشی سے تسبیح پڑھ رہی تھیں کہ اچانک نیوز اینکر کے الفاظ اُن کے کانوں میں پڑے۔ تسبیح اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر بکھر گئی۔

اسفند صاحب بھی وہیں بیٹھے تھے۔

جیسے ہی انہوں نے سکرین پر حمزہ کا نام سنا، اُن کے ہاتھ کانپنے لگے۔

وہ کرسی سے اٹھے، ٹی وی کے قریب گئے، اور کپکپاتی آواز میں بولے،

"ن... نہیں"

"یہ... یہ جھوٹ ہے"

مگر اگلے ہی لمحے سی سی ٹی وی فوٹیج چلنے لگی۔

پھر فرانزک ماہر کی رپورٹ۔

پھر عدالت کا فیصلہ۔

اور آخر میں جمی کا ریکارڈ شدہ پیغام۔

حمزہ بے قصور تھا... اگر کبھی یہ پیغام لوگوں تک پہنچے تو انہیں بتا دیجیے گا کہ اُس نے کبھی میری عزت کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔

یہ الفاظ سنتے ہی اسفند صاحب کے قدم لڑکھڑا گئے۔

اُنہیں ایک ایک منظر یاد آنے لگا۔

وہ دن،

جب معصوم حمزہ پہلی بار "بابا" کہہ کر اُن کی طرف بھاگا تھا اور انہوں نے اُسے گود میں اٹھانے کے بجائے ملازم کے حوالے کر دیا تھا۔

پھر وہ رات،

جب حمزہ نے روتے ہوئے کہا تھا، "بابا... میری بات سن لیجیے۔"

اور انہوں نے اُس کے چہرے پر تھپڑ مار دیا تھا۔

پھر وہ لمحہ،

جب دروازہ بند کرتے ہوئے کہا تھا،

"میرے لیے تم مر چکے ہو۔"

یہ جملہ اب اُن کے اپنے کانوں میں ہتھوڑے کی طرح گونج رہا تھا۔

اسفند صاحب نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے۔

وہ بچوں کی طرح رونے لگے۔

"میں نے"

"میں نے اپنے ہی بیٹے کو مار دیا"

وہ زندہ تھا"

"لیکن میں نے اُسے اپنے ہاتھوں سے بے سہارا کر دیا"

گرینی بھی آنسو نہ روک سکیں۔

وہ آگے بڑھیں، مگر اسفند صاحب اُن کے قدموں میں بیٹھ گئے۔

"مجھے معاف کر دو"

"میں باپ کہلانے کے قابل نہیں رہا"

اچانک اُنہوں نے اپنے سینے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

سانس تیز ہونے لگی۔

چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔

وہ گرینی کا ہاتھ پکڑ کر بڑی مشکل سے بولے،

"اگر"

"اگر حمزہ واپس آئے"

"تو اُسے بتا دینا"

"میں نے بہت دیر سے سہی"

"مگر اُسے اپنا بیٹا مان لیا تھا"

وہ کچھ لمحے رکے۔

پھر کپکپاتی آواز میں بولے،

"اسے اُس کی ماں کا پتہ دے دینا"

"اور"

"یہ بھی بتا دینا"

"کہ"

"اس دنیا میں"

"اُس کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے"

گرینی حیرت سے اُنہیں دیکھتی رہ گئیں۔

"کون...؟"

اسفند صاحب نے آنکھیں بند کرتے ہوئے صرف اتنا کہا،

"وقت آنے پر"

"وہ خود جان جائے گا"

اُن کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑنے لگی۔

لبوں پر آخری بار ایک ہی نام آیا

"حمزہ"

اور اگلے ہی لمحے کمرے میں مکمل خاموشی چھاگئی۔

گرینی نے لرزتے ہاتھوں سے اُن کی نبض ٹٹولی،

پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

اسفند صاحب چلے گئے تھے۔

مگر اپنے ساتھ ایک ایسا پچھتاوا لے کر،

جس کا بوجھ شاید اُن کی قبر تک بھی اُن کا پیچھا نہ چھوڑتا۔

اسفند صاحب کی وفات کی خبر پورے پیرس میں پھیل چکی تھی۔ جنازے کی تیاری خاموشی سے جاری تھی۔ گھر، جہاں کبھی شان و شوکت کا راج تھا، آج عجیب سی ویرانی اوڑھے کھڑا تھا۔ ہر کمرے میں خاموشی بول رہی تھی۔ گرینی کی آنکھیں مسلسل رو رو کر سوجھ چکی تھیں۔ وہ کبھی کفن کو دیکھتیں، کبھی اس دروازے کو جہاں سے وہ امید کر رہی تھیں کہ شاید اگلے ہی لمحے حمزہ اندر داخل ہو جائے۔ مگر وہ جانتی تھیں کہ حمزہ اس قدر ٹوٹ چکا ہے کہ شاید اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس کے باپ کی زندگی کی آخری خواہش صرف ایک تھی... ایک بار اپنے بیٹے کو دیکھ لینا۔

فینگ نے بہت مشکل سے حمزہ کو جنازے میں آنے پر آمادہ کیا۔ سفید کُرتا پہنے، کمزور جسم، زرد چہرہ اور بجھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ قبرستان پہنچا۔ چند ماہ پہلے تک جس کے ایک دیدار کے لیے لوگ بے تاب رہتے تھے، آج وہ سینکڑوں لوگوں کے درمیان بھی تنہا کھڑا تھا۔ اُس کی نظریں صرف اپنے باپ کے کفن پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ شخص جس سے محبت بھی تھی، شکایت بھی تھی، نفرت بھی تھی اور زندگی بھر ایک شفقت بھرے لفظ کی خواہش بھی... آج خاموش سفید کپڑے میں لپٹا اُس کے سامنے پڑا تھا۔

نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ "اللہ اکبر" کی صدائیں فضا میں گونجتی رہیں، مگر حمزہ کے کانوں میں صرف اپنے باپ کی آخری آواز گونج رہی تھی، حالانکہ اُس نے وہ سنی ہی نہیں تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ میت کو قبر کی طرف لے گئے۔ ہر کوئی مٹی ڈال کر واپس ہٹتا گیا۔ آخر میں حمزہ آگے بڑھا۔ اُس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے مٹی کی ایک مٹھی اٹھائی۔ کافی دیر تک وہ مٹی کو دیکھتا رہا، پھر آہستہ سے قبر میں ڈال دی۔ اُس لمحے ایسا محسوس ہوا جیسے صرف مٹی نہیں، اُس کے دل کا آخری سہارا بھی قبر میں اتر گیا ہو۔

لوگ آہستہ آہستہ واپس جانے لگے، مگر حمزہ وہیں بیٹھا رہا۔ اُس نے قبر کی مٹی پر ہاتھ رکھا اور پہلی بار اپنے باپ کو "بابا" کہہ کر پکارا۔ اُس کی آواز اس قدر ٹوٹی ہوئی تھی کہ سننے والوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

بابا... آپ کو معلوم ہے... میں نے بچپن سے صرف ایک چیز مانگی تھی... آپ کی محبت۔ میں نے کبھی آپ کی دولت نہیں مانگی، کبھی آپ کا نام نہیں مانگا، کبھی آپ کی شہرت نہیں مانگی... صرف ایک بار یہ سننا چاہتا تھا کہ آپ کہیں، 'حمزہ، میں تم پر یقین کرتا ہوں۔' مگر اب جب آپ کو یقین آیا... تب آپ ...چلے گئے۔ بابا... آپ بہت دیر کر گئے۔

یہ کہتے کہتے اُس کا گلا بند ہو گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے قبر کو تھام لیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس کی سسکیاں قبرستان کی خاموشی کو چیر رہی تھیں۔ فینگ نے آگے بڑھ کر اُسے سنبھالنے کی کوشش کی، مگر حمزہ نے پہلی بار اُس کا ہاتھ بھی جھٹک دیا۔

"سب چلے گئے، فینگ"

وہ ٹوٹتی ہوئی آواز میں بولا۔

"پہلے امی"

"پھر بابا"

"جمی بھی چلی گئی"

"میری عزت بھی"

"میرا سکون بھی"

"میرا ایمان بھی کمزور ہو گیا"

"اور اب"

وہ خاموش ہو گیا۔ آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

"اب میرے پاس بچا ہی کون ہے...؟"

یہ کہتے ہوئے اُس نے آسمان کی طرف دیکھا، مگر اس بار اُس کی آنکھوں میں کوئی شکوہ نہیں تھا، صرف بے حد تھکن تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دنیا سے نہیں، اپنی قسمت سے ہار چکا ہو۔ فینگ اُس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اُس نے حمزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا، مگر کوئی لفظ نہ بول سکا۔ بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں الفاظ نہیں، صرف خاموشی سمجھ سکتی ہے۔

قبرستان سے واپسی کے وقت حمزہ نے ایک بار مڑ کر اپنے باپ کی قبر کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک اور قطرہ گرا اور وہ دل ہی دل میں بولا،

"بابا... اگر جنت میں ملاقات ہوئی... تو اس بار میں صرف ایک بار آپ کو گلے لگاؤں گا... اور پھر کبھی کوئی شکایت نہیں کروں گا۔"

ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا قبرستان سے گزرا۔ سورج ڈھلنے لگا تھا۔ ایک باپ اپنی قبر میں جا چکا تھا، اور ایک بیٹا زندہ ہوتے ہوئے بھی اندر سے دفن ہو چکا تھا۔

تدفین کے بعد گھر پہلے سے بھی زیادہ سنسان ہو چکا تھا۔ ہر دیوار جیسے اسفند صاحب کی غیر موجودگی پر ماتم کر رہی تھی۔ گرینی تسبیح پڑھ رہی تھیں، مگر اُن کی انگلیاں بار بار رک جاتی تھیں۔ سامنے صوفے پر حمزہ خاموش بیٹھا تھا۔ اُس کی نظریں فرش پر جمی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس دنیا میں موجود ہی نہ ہو۔

کافی دیر تک دونوں کے درمیان مکمل خاموشی رہی۔ پھر گرینی آہستہ آہستہ اٹھیں، اپنی الماری کی طرف گئیں اور ایک پرانا لکڑی کا ڈبہ لے آئیں۔ اُس ڈبے پر برسوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ ڈبہ حمزہ کے سامنے رکھا۔ حمزہ نے سوالیہ نظروں سے گرینی کو دیکھا تو اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

یہ... تمہارے بابا نے اپنی آخری سانسوں سے پہلے مجھے دیا تھا۔ کہا تھا... اگر میرا بیٹا کبھی واپس آئے... تو یہ امانت اُسے دے دینا۔

حمزہ کے ہاتھ بے اختیار کانپ گئے۔ اُس نے دھیرے سے ڈبہ کھولا۔ سب سے اوپر ایک لفافہ رکھا تھا جس پر صرف دو لفظ لکھے تھے۔

"میرے بیٹے کے لیے"

یہ دو لفظ پڑھتے ہی حمزہ کی سانس جیسے رک گئی۔

"میرے... بیٹے"

وہ انہی دو لفظوں کو بار بار دیکھتا رہا۔

پھر اچانک اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

وہ ہنس بھی رہا تھا،

اور رو بھی رہا تھا۔

"گرینی"

اُس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"ساری زندگی"

"صرف یہی دو لفظ سننے کی خواہش تھی"

"اور جب لکھے گئے"

"تو لکھنے والا اس دنیا میں نہیں رہا"

وہ لفافہ اپنے سینے سے لگا کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

گرینی بھی اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کو نہ سنبھال سکیں۔

حمزہ نے لرزتے ہاتھوں سے خط کھولا۔

خط میں اسفند صاحب کی تحریر تھی۔

"حمزہ... اگر تم یہ خط پڑھ رہے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ میں اس دنیا میں نہیں ہوں۔ بیٹا، میں نے زندگی میں بہت فیصلے کیے، مگر سب سے بڑی غلطی تمہیں سمجھے بغیر تمہیں سزا دینا تھی۔ تم سچ کہتے

رہے اور میں اپنے غرور میں اندھا بنا رہا۔ میں نے تم سے باپ ہونے کا حق چھین لیا، لیکن مرنے سے پہلے ایک بار ضرور کہنا چاہتا ہوں... مجھے تم پر فخر ہے۔"

یہ جملہ پڑھتے ہی حمزہ نے خط اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

وہ زور زور سے رونے لگا۔

"بابا"

"ایک بار یہ بات میرے سامنے کہہ دیتے"

"صرف ایک بار"

"میں ساری زندگی کی تکلیف بھول جاتا"

کمرے میں صرف اُس کی سسکیاں باقی رہ گئی تھیں۔

کافی دیر بعد اُس نے خط دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔

"میں نے اپنی تمام جائیداد، کاروبار اور ہر چیز تمہارے نام کر دی ہے، کیونکہ یہ سب تمہارا حق تھا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ تمہیں کبھی میری دولت نہیں چاہیے تھی... تمہیں صرف میرا یقین چاہیے تھا، جو میں بہت دیر سے دے سکا۔"

حمزہ نے خط وہیں بند کر دیا۔

اُس نے گرینی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا،

"گرینی"

"مجھے ان کی جائیداد نہیں چاہیے"

"کاش وہ سب کچھ اپنے پاس رکھتے"

"اور بدلے میں مجھے صرف ایک بار گلے لگا لیتے"

"میں دنیا کا امیر ترین انسان بن جاتا"

گرینی کی ہچکی بندھ گئی۔

وہ آگے بڑھیں اور حمزہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

کچھ دیر بعد اُنہوں نے لرزتی آواز میں کہا،

"بیٹا... خط ابھی ختم نہیں ہوا"

حمزہ نے دوبارہ خط کھولا۔

اسفند صاحب نے لکھا تھا،

"ایک اور سچ ہے جو تمہیں جاننا چاہیے۔ تم اس دنیا میں اکیلے نہیں ہو۔ تمہارا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے۔ میں نے حالات کے باعث یہ راز تم سے چھپایا۔ میں ابھی اُس کا نام نہیں لکھ رہا... کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ جب تم اپنی ماں سے ملو تو وہ خود تمہیں یہ سچ بتائے۔ اس خط کے ساتھ میں نے اُس کا پتہ بھی رکھ دیا ہے۔"

حمزہ کچھ لمحوں تک خاموش بیٹھا رہا۔

پھر اُس نے لفافے سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا۔

اس پر صرف ایک پتہ درج تھا،

پاکستان،

لاہور،(مسلم ٹاؤن بی بلاک ہاؤس نمبر 43)

اُس نے کافی دیر تک اُس پتے کو دیکھا۔

پھر آہستہ سے سر جھکا کر بولا،

"شاید"

"اللہ نے میرا سب کچھ نہیں لیا"

"شاید ابھی میرے لیے ایک دروازہ باقی ہے"

گرینی نے اُس کی طرف دیکھا۔

مہینوں بعد پہلی بار اُنہیں حمزہ کی آنکھوں میں مایوسی کے بجائے ایک ہلکی سی امید دکھائی دی۔

اور شاید یہی امید،

اُس کی بکھری ہوئی زندگی کو دوبارہ جوڑنے کا پہلا قدم تھی۔

اسفند صاحب کی وفات کو تقریباً دو ہفتے گزر چکے تھے۔ گھر میں اگرچہ لوگوں کی آمدورفت ختم ہو چکی تھی، مگر غم ابھی تک دیواروں سے لپٹا ہوا تھا۔ حمزہ زیادہ تر اپنے کمرے میں خاموش رہتا، دوائیں وقت پر کھاتا اور گھنٹوں کھڑکی کے باہر آسمان کو دیکھتا رہتا۔ شیزوفرینیا کی ادویات نے اُس کے وہم کسی حد

تک کم ضرور کر دیے تھے، مگر اُس کے چہرے سے مسکراہٹ بھی جیسے ہمیشہ کے لیے چھین لی تھی۔ کبھی کبھی وہ اچانک چونک کر کسی خالی کونے کی طرف دیکھنے لگتا، پھر چند لمحوں بعد نظریں جھکا لیتا۔ ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت دی تھی کہ اُسے ذہنی سکون، مسلسل نگرانی اور مثبت ماحول کی ضرورت ہے، کیونکہ اُس کا جسم صرف

CKD

سے نہیں بلکہ مسلسل ذہنی صدموں سے بھی لڑ رہا تھا۔

اسی دوران ایک دوپہر دروازے کی گھنٹی بجی۔ گرینی نے دروازہ کھولا تو باہر پیرس انٹرنیشنل فلم اکیڈمی کا نمائندہ کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سنہری رنگ کا ایک خوبصورت لفافہ تھا۔ اُس نے نہایت ادب سے وہ لفافہ گرینی کے حوالے کیا اور کہا، "یہ مسٹر حمزہ اسفند کے لیے ہے۔ پوری فلم انڈسٹری اُن کی منتظر ہے۔" گرینی نے لفافہ خاموشی سے لے لیا۔ نمائندہ چلا گیا، مگر وہ لفافہ اُن کے ہاتھوں میں کئی لمحے تک لرزتا رہا۔ شاید اُنہیں بھی احساس تھا کہ اس کاغذ کے اندر صرف ایک دعوت نہیں، بلکہ حمزہ کی زندگی کا نیا موڑ چھپا ہوا ہے۔

شام کے وقت گرینی نے وہ لفافہ حمزہ کے سامنے رکھا۔ حمزہ نے بے دلی سے لفافہ کھولا۔ اندر خوبصورت الفاظ میں لکھا تھا کہ "پیرس انٹرنیشنل فلم ایوارڈز" کی انتظامیہ نے اُنہیں خصوصی اعزاز کے لیے مدعو کیا ہے۔ خط میں لکھا تھا کہ حالیہ تحقیقات کے بعد اُن کی بے گناہی ثابت ہو چکی ہے، اور فلمی دنیا اُن سے نہ صرف معذرت کرنا چاہتی ہے بلکہ اُن کی خدمات کو بھی خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتی ہے۔

حمزہ نے خط مکمل پڑھا، پھر خاموشی سے میز پر رکھ دیا۔ چند لمحوں بعد اُس نے وہ دعوت نامہ ہاتھ میں لیا، دو ٹکڑے کیے، پھر چار، پھر آٹھ... اور خاموشی سے کچرے کے ڈبے میں پھینک دیا۔

گرینی نے حیرت سے پوچھا، بیٹا... یہ کیا کیا تم نے؟

حمزہ نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا، "جس دنیا نے ایک جھوٹی ویڈیو دیکھ کر میرا کردار لکھ دیا تھا، آج اُس کے ایوارڈ میرے کسی کام کے نہیں۔ جب مجھے لوگوں کے یقین کی ضرورت تھی، اُس وقت سب خاموش تھے۔ اب اُن کی تالیاں میرے زخم نہیں بھر سکتیں۔"

گرینی چند لمحے خاموش رہیں۔ پھر آہستہ سے اُن کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔ اُنہوں نے حمزہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور نہایت نرمی سے بولیں، "بیٹا... اگر تم وہاں صرف شہرت لینے جا رہے ہوتے تو میں خود تمہیں روک دیتی۔ مگر تمہیں وہاں شہرت لینے نہیں جانا... تمہیں وہاں ایک مسلمان کی حیثیت سے جانا ہے۔"

حمزہ نے پہلی بار سر اٹھا کر گرینی کی طرف دیکھا۔

گرینی نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا، "قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ سچ چھپانا نہیں، بیان کرنا چاہیے۔ اللہ نے تمہیں بے گناہ ثابت کیا ہے، اب اگر تم خاموش رہو گے تو لوگ صرف تمہاری کہانی سنیں گے، تمہارا کردار نہیں۔ بیٹا، اسٹیج پر جا کر لوگوں کو یہ ضرور بتانا کہ کسی انسان پر الزام لگانے سے پہلے اُس کی بات سن لینا چاہیے۔ ایک مسلمان کا اخلاق اُس وقت پہچانا جاتا ہے جب اُس کے پاس بدلہ لینے کی طاقت ہو، مگر وہ معاف کرنے کا راستہ اختیار کرے۔"

یہ الفاظ حمزہ کے دل میں اترتے چلے گئے۔ اُس نے نظریں جھکا لیں۔ کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اُس نے گہری سانس لی اور دھیرے سے بولا، "گرینی... میں ایوارڈ لینے نہیں جاؤں گا... میں صرف ایک بات کہنے جاؤں گا۔ اگر میری بات سے ایک بھی انسان کسی بے گناہ پر الزام لگانے سے پہلے سوچنے لگے، تو شاید میری آزمائش رائیگاں نہیں جائے گی۔"

اسی وقت شہر کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر عنایہ اپنے دفتر میں بیٹھی مریضوں کی فائلیں دیکھ رہی تھیں کہ اُن کے سامنے بھی ایک سرکاری لفافہ رکھا گیا۔ ہسپتال کی انتظامیہ نے اُنہیں بتایا کہ اُنہیں انسانی خدمت اور مشکل آپریشنز میں غیر معمولی کارکردگی پر ایک بین الاقوامی اعزاز کے لیے نامزد کیا گیا ہے، اور تقریب وہی تھی جہاں پورے یورپ کی نمایاں شخصیات شریک ہونے والی تھیں۔ عنایہ نے خاموشی سے دعوت نامہ بند کیا۔ اُنہیں بالکل معلوم نہیں تھا کہ اسی تقریب میں ایک ایسا شخص بھی آنے والا ہے جس سے معافی مانگنے کے لیے اُن کے پاس شاید صرف ایک ہی موقع باقی رہ گیا تھا۔

پیرس کی سرد ہوا کھڑکیوں سے ٹکرا رہی تھی۔ تقدیر خاموشی سے اپنے تمام کرداروں کو ایک ہی جگہ جمع کرنے کی تیاری کر رہی تھی... مگر کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ تقریب صرف ایک ایوارڈ شو نہیں، بلکہ کئی زندگیوں کا فیصلہ کرنے والی رات ثابت ہونے والی ہے۔

رات کا آخری پہر تھا۔ پورا پیرس خاموشی کی چادر اوڑھے سو رہا تھا، مگر ڈاکٹر عنایہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھی بارش کے قطروں کو شیشے سے ٹکراتا دیکھ رہی تھیں۔ اُن کے سامنے حمزہ کی میڈیکل فائل کھلی پڑی تھی، مگر اُن کی نظریں الفاظ پر نہیں، یادوں پر جمی ہوئی تھیں۔ کبھی ہیلمٹ والا مریض یاد آتا، کبھی وہ سوپر جو جھاڑو ہاتھ میں لے کر ہنسا دیتا تھا، کبھی وہ خاموش پڑوسی جو چینی مانگنے آیا تھا، اور کبھی وہ شخص جس نے بارش میں اپنا کوٹ اُن کے کندھوں پر رکھ کر خود اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔ آج اُنہیں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سب الگ الگ لوگ نہیں تھے... یہ سب ایک ہی انسان تھا... حمزہ۔

اُنھوں نے بے اختیار آئینے میں خود کو دیکھا اور آہستہ سے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ دل کی دھڑکن معمول سے زیادہ تیز تھی۔ وہ دھیرے سے خود سے بولیں، "یہ کیا ہو رہا ہے، عنایہ؟ کیا تم... ایک

نامحرم کے بارے میں اتنا سوچنے لگی ہو؟" یہ سوال اُن کے اپنے وجود پر بجلی بن کر گرا۔ اُنہوں نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ وہ ایک دیندار لڑکی تھیں، جانتی تھیں کہ دلوں کا حال اللہ کے اختیار میں ہے، مگر یہ بھی جانتی تھیں کہ انسان اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ اُنہیں پہلی بار احساس ہوا کہ حمزہ کے لیے اُن کے دل میں پیدا ہونے والا جذبہ محض ہمدردی سے آگے بڑھ چکا ہے، اور یہی احساس اُنہیں ڈرا رہا تھا۔

عنایہ فوراً وضو کرنے اٹھیں۔ جائے نماز بچھائی اور تہجد میں کھڑی ہو گئیں۔ سجدے میں جاتے ہی اُن کے آنسو رک نہ سکے۔ وہ دیر تک روتی رہیں۔ "یا اللہ! تُو دلوں کے حال جانتا ہے۔ اگر میرے دل میں کوئی ایسا جذبہ پیدا ہو گیا ہے جو تیری رضا کے خلاف ہے تو میرے دل کو پاک فرما۔ اور اگر اس انسان کے لیے میرے دل میں خیر رکھی ہے تو اسے صرف اسی راستے تک پہنچانا جو تیری شریعت کے مطابق ہو۔ میں اپنی خواہشات کی نہیں، تیرے حکم کی محتاج ہوں۔"

نماز کے بعد اُنہوں نے قرآنِ مجید کھولا۔ پہلی ہی نظر ایک ایسی آیت کے مفہوم پر پڑی جس میں صبر، اللہ کی رحمت اور مایوسی سے بچنے کی تلقین تھی۔ اُنہوں نے قرآن کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُنہیں احساس ہوا کہ محبت اگر انسان کو اللہ سے قریب کر دے تو نعمت بن جاتی ہے، اور اگر انسان حدودِ الٰہی بھلا دے تو وہی محبت آزمائش بن جاتی ہے۔ اُنہوں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ وہ اپنے جذبات کو اللہ کی رضا سے آگے نہیں بڑھنے دیں گی۔

کافی دیر خاموش بیٹھنے کے بعد اُنہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں کہا، "یا اللہ! اگر حمزہ میری قسمت میں نہیں تو میرے دل سے اس کی محبت نکال دے۔ اور اگر کبھی وہ میرے نصیب میں لکھا گیا ہے تو اُسے صرف حلال راستے سے میری زندگی میں لانا۔ میں کسی ایسے رشتے کی خواہش نہیں رکھتی جس سے تُو ناراض ہو جائے۔"

اُسی لمحے اُنہوں نے ایک اور فیصلہ بھی کر لیا۔ اگر ایوارڈ شو میں حمزہ ملا، تو وہ سب سے پہلے اُس سے معافی مانگیں گی۔ محبت کا اظہار نہیں... صرف اپنے ظلم کی معافی۔ باقی فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں گی، کیونکہ اُنہیں یقین ہو چکا تھا کہ انسان منصوبے بناتا ہے، مگر بہترین فیصلہ ہمیشہ اللہ ہی کرتا ہے۔

پیرس انٹرنیشنل فلم ایوارڈز کی عمارت آج روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ دنیا بھر کے مشہور اداکار، ہدایت کار، صحافی اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات ایک ہی چھت تلے جمع تھیں۔ سرخ قالین پر کیمروں کی چمکتی فلیشیں مسلسل فضا کو روشن کر رہی تھیں۔ ہر طرف لوگوں کی نظریں ایک ہی شخص کو ڈھونڈ رہی تھیں... وہ اداکار جو چند ماہ پہلے دنیا کی نظروں میں مجرم تھا، مگر آج عدالت کی نظر میں بے قصور اور صبر کی ایک مثال بن چکا تھا۔

اچانک مرکزی دروازے کے سامنے ایک سیاہ رنگ کی گاڑی آ کر رکی۔ سیکیورٹی اہلکار آگے بڑھے اور دروازہ کھولا۔ پہلے فینگ باہر اترا، پھر گرینی نے آہستہ سے گاڑی سے قدم رکھا۔ آخر میں حمزہ باہر آیا۔ سیاہ سوٹ، سفید شرٹ، سادہ ٹائی، چہرے پر ہلکی سی زردی، آنکھوں میں برسوں کی تھکن اور لبوں پر مکمل خاموشی۔ یہ وہ حمزہ نہیں تھا جس کی ایک مسکراہٹ پر ہزاروں لڑکیاں دیوانی ہو جاتی تھیں۔ آج اُس کی شخصیت میں شہرت کی چمک نہیں، آزمائش کا وقار تھا۔

جیسے ہی میڈیا نے اُسے دیکھا، چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ "مسٹر حمزہ... ایک تصویر پلیز!" "حمزہ، اِدھر دیکھیے!" "سر، آپ کی بے گناہی ثابت ہونے کے بعد آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"

"کیا آپ فلم انڈسٹری میں واپسی کر رہے ہیں؟" فلیش لائٹس مسلسل چمک رہی تھیں، مگر حمزہ نے کسی سوال کا جواب نہ دیا۔ وہ چند لمحوں کے لیے رکا، پھر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دل ہی دل میں دعا کی، "یا اللہ! آج میری زبان سے وہی بات نکلے جو تجھے پسند ہو۔ میرے نفس کو اس اسٹیج پر جگہ نہ دینا۔" پھر اُس نے نظریں جھکا لیں اور خاموشی سے ہال کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد ایک دوسری گاڑی آ کر رکی۔ ڈاکٹر عنایہ باہر اتریں۔ سادہ مگر باوقار لباس، چہرہ نقاب سے ڈھکا ہوا، سر پر دوپٹہ، چہرے پر سکون سے زیادہ ندامت۔ اُن کے ہاتھ میں ایوارڈ شو کا دعوت نامہ تھا، مگر دل میں صرف ایک خواہش... "یا اللہ! اگر آج حمزہ مل جائے تو مجھے اتنی ہمت دینا کہ میں اُس سے اپنی غلطی کا اعتراف کر سکوں۔" جیسے ہی وہ ہال کے اندر داخل ہوئیں، اُن کی نظریں بے اختیار مہمانوں کے درمیان اُسے تلاش کرنے لگیں، مگر ابھی تک اُنہیں حمزہ دکھائی نہیں دیا۔

ہال کے اندر تقریب کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ مختلف شعبوں کے ایوارڈز دیے جا رہے تھے، لوگ تالیاں بجا رہے تھے، مسکرا رہے تھے، تصاویر بنوا رہے تھے، مگر حمزہ ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے رکھا پانی کا گلاس بھی ویسا ہی پڑا تھا۔ فینگ نے آہستہ سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا، "پریشان مت ہو... آج لوگ تمہیں دیکھنے نہیں، تم سے سیکھنے آئے ہیں۔" حمزہ نے ہلکی سی مسکراہٹ دی، مگر کچھ بولا نہیں۔

دوسری جانب عنایہ کی نظریں اچانک ہال کے ایک کونے میں جا کر ٹھہر گئیں۔ وہاں بیٹھا ہوا وہ شخص، جس کا چہرہ مہینوں پہلے اُن کی یادوں میں بس گیا تھا، آج حقیقت میں اُن کے سامنے موجود تھا۔ وہی پرسکون آنکھیں، مگر اُن میں اب بے شمار راتوں کی بے خوابی اور بے انتہا دکھ چھپا ہوا تھا۔ عنایہ کا دل ایک لمحے کو رک سا گیا۔ اُنہوں نے بے اختیار ایک قدم آگے بڑھایا، مگر پھر وہیں رک گئیں۔ اُنہیں

محسوس ہوا کہ شاید ابھی یہ وقت نہیں۔ اُنہوں نے صرف دور سے اُسے دیکھا، اور اُن کی آنکھوں سے خاموشی سے ایک آنسو پلکوں پر آ کر ٹھہر گیا۔

اسی لمحے اسٹیج پر موجود میزبان نے مسکراتے ہوئے اعلان کیا، "خواتین و حضرات! اب وہ لمحہ آ پہنچا ہے جس کا ہم سب کو انتظار تھا۔ آج ہم اُس شخصیت کو خصوصی اعزاز پیش کرنے جا رہے ہیں جس نے صرف اداکاری میں ہی نہیں، بلکہ اپنی زندگی کی آزمائشوں میں بھی غیر معمولی صبر کا مظاہرہ کیا۔

براہِ کرم زوردار تالیوں کے ساتھ خوش آمدید کہیے...

"مسٹر حمزہ اسفند"

پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

حمزہ نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند کیں، دل ہی دل میں "بسم اللہ" پڑھی، پھر آہستہ آہستہ اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ چند منٹ بعد وہ اس اسٹیج سے اپنی زندگی کی سب سے یادگار تقریر بھی کرے گا... اور اسی اسٹیج پر اُس کی زندگی ایک بار پھر بدلنے والی ہے۔

پورا ہال مسلسل تالیوں سے گونج رہا تھا۔ حمزہ آہستہ آہستہ اسٹیج کی طرف بڑھا۔ ہر قدم کے ساتھ اُسے اپنی زندگی کے گزشتہ چند ماہ یاد آ رہے تھے۔ جھوٹے الزامات، جمی کی موت، باپ کی جدائی، ذہنی بیماری، ہسپتال کے کمرے، اور وہ راتیں جب اُسے لگتا تھا کہ شاید زندگی اب کبھی پہلے جیسی نہیں ہو گی۔ اُس نے ایوارڈ وصول کیا، چند لمحے خاموش کھڑا رہا، پھر مائیک کے سامنے آ کر گہری سانس لی۔

ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

حمزہ نے دھیرے لہجے میں کہا، "میں آج یہاں ایک اداکار کے طور پر نہیں، ایک ایسے انسان کے طور پر کھڑا ہوں جسے لوگوں نے سنے بغیر مجرم قرار دے دیا تھا۔ میری زندگی نے مجھے ایک سبق دیا ہے...

اگر کبھی کسی کے بارے میں کوئی خبر سنو تو فیصلہ کرنے سے پہلے اُس کی بات ضرور سن لینا، کیونکہ بعض اوقات ایک جھوٹ پوری زندگی تباہ کر دیتا ہے، مگر ایک سچ بہت دیر سے سامنے آتا ہے۔"

ہال میں بیٹھے کئی لوگوں کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ عنایہ بھی خاموشی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں وہ تمام لمحے ایک ایک کر کے لوٹ رہے تھے جب اُس نے غصے میں حمزہ کو ڈانٹا، اُس پر بدگمانی کی اور اُس کے چہرے پر تھپڑ مارا تھا۔ آج اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ سامنے کھڑا انسان اُن سب سے کہیں زیادہ بڑا تھا جتنا وہ کبھی سمجھ سکی تھی۔

سامنے والی قطار میں معروف اداکارہ بیلا لارک خاموشی سے بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے اپنا فون اٹھایا، اسکرین پر نظریں جمائیں، مختصر سا پیغام بھیجا اور پھر بہت آہستگی سے نظریں ہال کے پچھلے حصے کی طرف اٹھائیں۔ وہاں موجود ایک شخص سے اُس کی نظریں ملیں۔ اُس نے نہایت معمولی انداز میں سر ہلایا۔ یہ منظر اتنا مختصر تھا کہ ہال میں موجود کسی شخص نے اُس پر توجہ نہ دی۔

ادھر حمزہ اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

آزمائش نے مجھ سے بہت کچھ چھین لیا... لیکن ایک چیز واپس دے دی... اپنے رب پر یقین۔ میں نے جان لیا کہ لوگوں کی عدالت میں دیر ہو سکتی ہے، مگر اللہ کی عدالت میں اندھیرا ہمیشہ نہیں رہتا۔ اگر میرا رب میرے ساتھ ہے تو دنیا کی ناراضی بھی مجھے توڑ نہیں سکتی۔

یہ کہتے ہوئے اُس کی نگاہ چند لمحوں کے لیے عنایہ سے ملی۔

عنایہ کا سر بے اختیار جھک گیا۔

اُس کی پلکوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر گال پر بہہ نکلا۔

وہ دل ہی دل میں صرف ایک دعا مانگ رہی تھی۔

"یااللہ... ایک بار... صرف ایک بار مجھے اس انسان سے معافی مانگنے کا موقع دے دے۔"

اسی لمحے ہال کی خاموش فضا کو ایک اچانک، خوفناک آواز نے چیر دیا۔

اچانک فائرنگ کی آواز گونجی، حمزہ فائرنگ کی زد میں۔

چند لمحے پہلے جو لوگ تالیاں بجا رہے تھے، اُن کی چیخیں پورے ہال میں گونج اٹھیں۔

حمزہ کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔

کمر خون سے لت پت،

اُس کا جسم لڑکھڑایا۔

ایوارڈ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اسٹیج پر گر گیا۔

اور وہ خود بھی آہستہ آہستہ زمین کی طرف گرنے لگا۔

"حمزہ"

عنایہ کی دل دہلا دینے والی چیخ پورے ہال میں گونج اٹھی۔

فینگ اپنی نشست سے بجلی کی رفتار سے اٹھا اور اسٹیج کی طرف دوڑا۔ گرینی فرش پر گر گئی۔ پورا ہال افراتفری میں بدل چکا تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، مگر عنایہ کو نہ شور سنائی دے رہا تھا، نہ لوگوں کی آوازیں۔

اُسے صرف ایک ہی چیز دکھائی دے رہی تھی،

اسٹیج پر گرتا ہوا حمزہ۔

اور اُس کے دل میں پہلی بار یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں معافی مانگنے سے پہلے ہی وہ ہمیشہ کے لیے اُس سے جدا نہ ہو جائے۔

کچھ دیر بعد ایمبولینس کی آواز پورے ہسپتال میں گونج رہی تھی۔ جیسے ہی اسٹریچر ایمرجنسی کے دروازے سے اندر داخل ہوا، پورا عملہ حرکت میں آ گیا۔ حمزہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا، اُس کی سانسیں بے ترتیب تھیں اور چہرے کی زردی صاف بتا رہی تھی کہ اُس کی حالت انتہائی نازک ہے۔ عنایہ خود اسٹریچر کے ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے، مگر ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھیں۔ اُنہیں فوراً یاد آیا کہ حمزہ کا دایاں گردہ پہلے ہی شدید متاثر تھا، اور اب گولی بھی جسم کے اسی حصے کے قریب لگی تھی۔ اُنہوں نے آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں دعا کی، یا اللہ! آج میری مہارت نہیں، تیری رحمت درکار ہے۔

ابتدائی معائنے کے بعد ہسپتال کی سرجیکل کمیٹی فوری طور پر جمع ہو گئی۔ کمرے میں غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ ایک سینئر سرجن نے تمام رپورٹس میز پر رکھتے ہوئے گہری سانس لی اور کہا، "مریض پہلے ہی گردے کی بیماری میں مبتلا ہے۔ حالت انتہائی نازک ہے۔ اس وقت سرجری کا خطرہ بہت زیادہ ہے، اور اگر پیچیدگی پیدا ہوئی تو نتائج سنگین ہو سکتے ہیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کمیٹی کے سربراہ نے فیصلہ سنایا، موجودہ صورتحال میں ہم اس آپریشن کی منظوری نہیں دے سکتے۔

یہ الفاظ سنتے ہی عنایہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُن کے قدموں تلے زمین کھینچ لی ہو۔ اُنہوں نے بے یقینی سے کمیٹی کی طرف دیکھا۔ "سر... اگر ہم کچھ نہ کریں تو؟" اُن کی آواز لرز رہی تھی۔ جواب آیا، "ہم خطرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

عنایہ کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے، مگر وہ خود کو سنبھال کر کھڑی رہیں۔ چند لمحوں بعد اُنہوں نے مضبوط لہجے میں کہا، "میں آپ سب کی رائے کا احترام کرتی ہوں، لیکن ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کسی مریض کو صرف اس لیے بے سہارا نہیں چھوڑا جا سکتا کہ اُس کی حالت مشکل ہے۔ آسان مریضوں کا علاج ہر کوئی کر لیتا ہے، اصل امتحان اُس وقت ہوتا ہے جب امید کم رہ جائے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

عنایہ نے ایک نظر شیشے کے اُس پار بے ہوش پڑے حمزہ کو دیکھا، پھر آہستہ سے بولیں، "یہ وہی انسان ہے جس کے ساتھ دنیا نے انصاف کرنے میں دیر کر دی۔ میں کم از کم اپنے پیشے کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکتی۔ زندگی دینا اللہ کے اختیار میں ہے، مگر جان بچانے کی پوری کوشش کرنا میرے فرض کا حصہ ہے۔ اگر میں آج خوف کی وجہ سے پیچھے ہٹ گئی تو شاید زندگی بھر خود کو معاف نہ کر سکوں۔"

کمیٹی کے چند ارکان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مگر فیصلہ تبدیل نہ ہوا۔

عنایہ نے خاموشی سے اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کیے، اور سرجیکل کیپ ہاتھ میں لے لی۔ اُن کے چہرے پر اب خوف نہیں، عزم تھا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ صرف اتنا بولیں، "میں نتیجے کی مالک نہیں ہوں... لیکن اپنے فرض سے پیچھے ہٹنے کا اختیار بھی میرے پاس نہیں۔"

شیشے کے دوسری طرف گرینی ہاتھ اٹھائے مسلسل دعا مانگ رہی تھیں تھا۔ ہونٹوں پر ایک ہی فریاد تھی، "یا اللہ! تُو ہی شفا دینے والا ہے، ہمارے اس بچے پر اپنا کرم فرما۔" فینگ بے چینی سے آپریشن تھیٹر کے باہر چہل قدمی کر رہا تھا، مگر عنایہ کے قدم اب رکنے والے نہیں تھے۔ وہ آپریشن تھیٹر کے دروازے کے سامنے پہنچیں، ایک لمحے کے لیے آسمان کی طرف دیکھا، "بسم اللہ" پڑھی، اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ باہر انتظار، دعائیں اور آنسو تھے... اور اندر ایک ایسی جنگ شروع ہونے والی تھی جس میں ہر لمحہ قیمتی تھا۔

آپریشن تھیٹر کی سرخ بتی جلتے ہی پورے فلور پر عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ شیشے کے اُس پار ہر شخص کی نظریں صرف ایک دروازے پر تھیں۔ گرینی مسلسل استغفار کر رہی تھیں۔ اُن کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے، مگر دعا کا سلسلہ ٹوٹ نہیں رہا تھا۔ فینگ بار بار دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھتا، پھر بے چینی سے راہداری میں چکر لگانے لگتا۔ اسی دوران ہسپتال کی انتظامیہ اور سرجیکل کمیٹی کے چند ارکان تیزی سے آپریشن تھیٹر کے باہر پہنچے۔ کمیٹی کے سربراہ نے سخت لہجے میں کہا، "ڈاکٹر عنایہ کو فوراً باہر بلائیں۔ ہم نے اس آپریشن کی اجازت نہیں دی۔" ایک نرس نے دھیمی آواز میں جواب دیا، "سر... سرجری شروع ہو چکی ہے۔ اب انہیں روکنا مریض کی جان کو مزید خطرے میں ڈال سکتا ہے۔" یہ سنتے ہی کمیٹی کے ارکان کے چہروں پر سختی اور غصہ نمایاں ہو گیا۔

ادھر آپریشن تھیٹر کے اندر عنایہ مکمل توجہ کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اُن کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے، مگر اُن کے ہاتھ غیر معمولی حد تک پُرسکون تھے۔ اُنہیں معلوم تھا کہ باہر شاید اُن کی ملازمت کا فیصلہ ہو رہا ہے، مگر اندر ایک انسان کی زندگی اُن کے فیصلوں کی منتظر تھی۔ اُنہوں نے دل ہی دل میں "حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ" پڑھا اور اپنی پوری توجہ حمزہ کی جان بچانے پر مرکوز کر دی۔

وقت جیسے رُک گیا تھا۔ ہر گزرتا لمحہ ایک نئی آزمائش بن کر سامنے آرہا تھا، مگر عنایہ کی نگاہوں میں خوف کے بجائے صرف ذمہ داری تھی۔

باہر اچانک ایک اور ہلچل مچ گئی۔ نیوز چینلز کی گاڑیاں ہسپتال کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ چند ہی منٹوں میں خبر پورے پیرس میں پھیل چکی تھی کہ معروف اداکار حمزہ اسفند پر حملہ ہوا ہے اور اس وقت اُن کی حالت تشویش ناک ہے۔ رپورٹرز مسلسل لائیو نشریات کر رہے تھے۔ اسی ہجوم میں فینگ کی بہن اسٹیلا بھی مائیک ہاتھ میں لیے کھڑی تھی، مگر اُس کی نظریں بار بار ہسپتال کے دروازے پر جا کر رک جاتی تھیں۔ اُسے صرف خبر نہیں دینی تھی، اُسے اپنے بھائی کے دوست کی زندگی کی بھی فکر تھی۔

اُسی لمحے ایک ایسا شخص ہسپتال کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا جسے دیکھ کر فینگ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ پیرس پولیس کے سائبر کرائم یونٹ کا سربراہ تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک مہر بند فائل تھی۔ اُس نے سیدھا فانگ کے پاس آکر کہا،

"مسٹر فینگ... ہمیں جمی کی ویڈیو کیس اور آج کے حملے کے درمیان کچھ ایسے شواہد ملے ہیں جنہوں نے پوری تفتیش کا رخ بدل دیا ہے۔"

فینگ کا دل زور سے دھڑکا۔

"کیا مطلب؟"

افسر نے آہستہ سے جواب دیا، "یہ حملہ اتفاق نہیں لگتا... کسی نے پہلے حمزہ کی ساکھ ختم کرنے کی کوشش کی، اور اب جب وہ بے گناہ ثابت ہو کر دوبارہ لوگوں کے سامنے آیا، تو اُسے خاموش کرانے کی کوشش کی گئی۔"

فینگ نے بے اختیار مٹھیاں بھینچ لیں۔

"کون...؟"

افسر نے فائل کھولی، مگر اُس سے پہلے ہی ایک کانسٹیبل دوڑتا ہوا آیا

"سر... ہمیں ایک اہم گواہ مل گیا ہے۔"

افسر نے فائل فوراً بند کر دی۔

"پہلے اُس کا بیان ریکارڈ کرتے ہیں۔"

فینگ بے بسی سے اُنہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ سچ اُس کے اتنا قریب آکر بھی اُس سے دور ہو گیا تھا۔

اسی دوران آپریشن تھیٹر کا دروازہ چند لمحوں کے لیے کھلا۔ ایک نرس تیزی سے باہر آئی۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"ہمیں خون کی مزید ضرورت ہے۔"

گرینی کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اُنہوں نے دیوار کا سہارا لیا اور لرزتی آواز میں پوچھا، "میرا بچہ... کیسا ہے؟"

نرس نے صرف اتنا کہا، "ڈاکٹر عنایہ پوری کوشش کر رہی ہیں... آپ دعا کریں۔"

یہ الفاظ سن کر گرینی نے وہیں راہداری کے فرش پر بیٹھ گئی۔ اُنہوں نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں کہا، "یا اللہ! اگر میرے حصے کی کوئی خوشی باقی ہے تو وہ بھی

میرے بچے کی زندگی کے بدلے قبول کر لے۔ اُس نے بہت آزمائشیں دیکھ لی ہیں، اب اُس پر رحم فرما۔"

راہداری میں کھڑے ہر شخص کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔

اور اُسی لمحے،

آپریشن تھیٹر کے اندر موجود مانیٹر سے ایک غیر معمولی الارم کی آواز بلند ہوئی۔

عنایہ نے فوراً سر اٹھایا۔

پورا عملہ ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔

ایک نرس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا،

"ڈاکٹر!"

عنایہ نے بغیر گھبرائے گہری سانس لی، اللہ کا نام لیا اور مضبوط لہجے میں کہا،

"کوئی پیچھے نہیں ہٹے گا... جب تک سانس باقی ہے، امید بھی باقی ہے۔"

اور دروازے کے باہر کھڑے لوگوں کو صرف وہ مسلسل بجتی ہوئی الارم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جس نے ہر دل کی دھڑکن روک دی تھی۔

آپریشن تھیٹر کی فضا میں غیر معمولی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وقت جیسے اپنی رفتار بھول چکا تھا۔ دیوار پر لگی گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں، مگر وہاں موجود ہر شخص کے لیے ہر منٹ ایک صدی بن

چکا تھا۔ عنایہ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے مسلسل بہہ رہے تھے، مگر اُن کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے کام سے نہ ہٹیں۔ اُنہوں نے دل ہی دل میں بار بار "بِسمِ اللہِ، تَوَکَّلتُ عَلَی اللہِ" پڑھا۔ اُنہیں معلوم تھا کہ ایک ڈاکٹر اپنی پوری کوشش کر سکتا ہے، مگر شفا صرف اللہ کے حکم سے ملتی ہے۔ اُن کے ہاتھ اپنا فرض ادا کر رہے تھے، جبکہ دل ہر لمحہ اپنے رب سے رحمت مانگ رہا تھا۔ ہر گزرتا لمحہ اُنہیں یہ احساس دلا رہا تھا کہ آج وہ صرف ایک مریض کی جان نہیں بچا رہیں، بلکہ اپنے ضمیر کا بھی امتحان دے رہی ہیں۔

باہر راہداری میں گرینی کی کیفیت دیکھنے والی تھی۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے، آنسو مسلسل اُن کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ اُن کی زبان پر صرف ایک دعا تھی۔ "یا اللہ... میرے بچے نے زندگی بھر لوگوں کے فیصلے برداشت کیے ہیں، اب اُس پر اپنا فیصلہ رحمت والا فرما۔ اگر آزمائش لکھنی ہی ہے تو میری عمر میں لکھ دے، اُس کے حصے میں آسانی لکھ دے۔" اُن کی سسکیاں سن کر وہاں کھڑی نرسوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ ہسپتال کے شور میں بھی ایک بوڑھی عورت کی دعا کا درد الگ ہی محسوس ہو رہا تھا۔

فینگ دوسری طرف خاموش کھڑا تھا، مگر اُس کے اندر طوفان برپا تھا۔ مگر اُس نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک حمزہ آنکھیں نہیں کھولتا، وہ اُسے کسی نئے صدمے سے نہیں گزارے گا۔ اُسی لمحے اُس کا فون بجا۔ دوسری طرف سائبر کرائم یونٹ کا افسر تھا۔ اُس نے صرف اتنا کہا، "ہم بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ جس شخص نے جمی کی ویڈیو تیار کی تھی، اُس تک رسائی مل گئی ہے، مگر ابھی یہ خبر کسی کو مت

دیجیے۔" فینگ نے فون بند کیا، آنکھیں موند کر آسمان کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا، "یا اللہ... بس ایک بار میرے دوست کو زندگی عطا کر دے، باقی سچ دنیا کے سامنے لانا میرا کام ہے۔"

چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہسپتال کے باہر میڈیا کی بھیڑ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی۔ ہر نیوز چینل صرف ایک ہی خبر نشر کر رہا تھا۔ پوری دنیا ایک اداکار کی زندگی اور موت کے درمیان معلق تھی، مگر کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آپریشن تھیٹر کے اندر صرف ایک جسم نہیں، کئی ٹوٹے ہوئے خواب بھی زندگی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ راہداری میں مکمل خاموشی تھی۔ کبھی گرینی کی دعاؤں کی آواز سنائی دیتی، کبھی فانگ کی بے چین آہ، اور کبھی آپریشن تھیٹر کے دروازے کے پیچھے سے آتی مدھم سی آوازیں۔

بالآخر تقریباً چار گھنٹے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ عنایہ باہر آئیں۔ اُن کے چہرے پر شدید تھکن نمایاں تھی، ماسک ابھی بھی اُن کے چہرے پر تھا، آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور ہاتھ مسلسل کانپ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ باہر نکلیں، گرینی لڑکھڑاتے قدموں سے اُن کی طرف بڑھیں۔ اُن کی آواز کانپ رہی تھی۔ "بیٹا... میرا حمزہ... کیسا ہے؟"

عنایہ نے چند لمحے خاموش رہ کر گہری سانس لی۔ پھر دھیرے سے بولیں، "الحمدللہ... آپریشن مکمل ہو گیا ہے۔ وہ اس وقت زندہ ہے، مگر خطرہ ابھی مکمل طور پر ٹلا نہیں۔ اگلے چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔ اگر اللہ نے کرم فرمایا تو وہ اس آزمائش سے بھی نکل آئے گا۔"

یہ سنتے ہی گرینی وہیں فرش پر سجدۂ شکر میں گر پڑیں۔ اُن کے آنسو اب صرف غم کے نہیں تھے، اُن میں امید بھی شامل ہو چکی تھی۔ فینگ نے بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اُس کی آنکھوں سے

بھی آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ بعض جنگیں طاقت سے نہیں، صرف دعا سے جیتی جاتی ہیں۔

لیکن یہ سکون چند لمحوں کا مہمان ثابت ہوا۔

سرجیکل کمیٹی کے سربراہ چند ارکان کے ساتھ راہداری میں آئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک سرکاری لفافہ تھا۔ اُنہوں نے سخت لہجے میں کہا، "ڈاکٹر عنایہ... آپ نے ہسپتال کی سرجیکل کمیٹی کے واضح فیصلے کی خلاف ورزی کی ہے۔ آپ کو فوری طور پر تمام طبی ذمہ داریوں سے معطل کیا جاتا ہے۔ نیز آپ کو کل صبح کی پہلی فلائیٹ سے پاکستان واپس بھیجا جاتا ہے۔"

پورا راہداری ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔

عنایہ نے خاموشی سے لفافہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُنہوں نے اُسے کھولا بھی نہیں۔ اُن کی نظریں صرف آئی سی یو کے شیشے پر جمی تھیں، جہاں حمزہ بے ہوش پڑا تھا۔ چند لمحوں بعد اُن کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اُنہوں نے دل ہی دل میں کہا، "اگر ایک بے گناہ انسان کی جان بچانے کی قیمت میری نوکری تھی... تو مجھے یہ سودا قبول ہے۔"

اُسی لمحے آئی سی یو کے اندر مانیٹر پر حمزہ کی دھڑکن پہلے سے زیادہ متوازن ہونے لگی۔ عنایہ کی آنکھوں سے ایک خاموش آنسو بہہ نکلا۔ اُنہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور آہستہ سے سرگوشی کی، "یا اللہ... اب اسے صرف اپنی رحمت میں رکھنا۔"

مگر اُن سب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہسپتال کی پارکنگ میں کھڑی ایک سیاہ گاڑی کے اندر بیٹھی ایک نامعلوم عورت ، جس کے ہاتھ میں ایک پرانی تصویر تھی... تصویر میں حمزہ، جمی اور بیلا لارک تھی، وہ

اسے پھاڑ رہی تھی، اس کے لب سے یہ الفاظ نکل رہے تھے، "میں بدلہ نہیں لیتی، میں جان لیتی ہوں۔"

اصل حقیقت ابھی سامنے آنا باقی تھی۔

رات بھر جاگنے، کئی گھنٹوں کی مسلسل سرجری اور پھر ملازمت سے معطلی کا حکم سننے کے بعد ڈاکٹر عنایہ ہسپتال کی اُس راہداری میں خاموش کھڑی تھیں جہاں کبھی پہلی بار "ہیلمٹ والا مریض" اُن کی زندگی میں آیا تھا۔ آج وہی راہداری اجنبی لگ رہی تھی۔ اُن کے ہاتھ میں صرف ایک چھوٹا سا بیگ تھا، جبکہ دل میں ایسی تھکن تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ اُنہوں نے آئی سی یو کے شیشے کے پار ایک آخری بار دیکھا۔ حمزہ اب بھی بے ہوش پڑا تھا۔ مشینوں کی مدھم آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ ابھی زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے۔

عنایہ آہستہ آہستہ اُس کے بستر کے قریب پہنچیں۔ چند لمحے خاموش کھڑی رہیں۔ اُن کے ہاتھ میں وہی لمبا کوٹ تھا جو ایک بار بارش والی رات ایک اجنبی نے اُن کے کندھوں پر رکھ دیا تھا، اور بعد میں اُنہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ اجنبی حمزہ ہی تھا۔ اُنہوں نے بڑی احتیاط سے وہ کوٹ بستر کے پاس رکھی کرسی پر رکھ دیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کی سلوٹیں درست کیں، جیسے کسی امانت کو اُس کے اصل مالک کے حوالے کر رہی ہوں۔

عنایہ نے حمزہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ آنکھیں بند تھیں، چہرہ زرد تھا، مگر اُس خاموش چہرے پر بھی ایک عجیب سا سکون تھا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

حمزہ... اُنہوں نے بمشکل سرگوشی کی، "شاید اللہ نے ہماری ملاقات کا وقت یہی تک لکھا تھا۔ میں نے تمہیں ہمیشہ غلط سمجھا، تم پر بدگمانی کی، تمہیں تکلیف دی... اور جب حقیقت معلوم ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ آج میں تم سے معافی بھی نہیں مانگ سکتی، کیونکہ تم میری آواز بھی نہیں سن سکتے۔"

وہ چند لمحے خاموش رہیں، پھر آسمان کی طرف دیکھ کر دھیرے سے بولیں، "یا اللہ! اگر یہ انسان میری قسمت میں نہیں، تو اس کی زندگی ضرور لکھ دے۔ میری ہر خوشی لے لے، مگر اس کی سانسیں سلامت رکھ۔"

عنایہ نے بے اختیار اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، مگر حمزہ کے ہاتھ کو چھونے سے پہلے ہی روک لیا۔ اُنہوں نے فوراً اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا اور دھیمی آواز میں کہا، "یہ رشتہ ابھی حلال نہیں... اور میں نہیں چاہتی کہ میری کوئی خواہش تیرے حکم سے آگے نکل جائے، اے اللہ۔" اُنہوں نے صرف دور سے اُسے دیکھا، دل ہی دل میں سلام کہا اور خاموشی سے پلٹ گئیں۔

ہسپتال کے مرکزی دروازے سے باہر نکلتے وقت سورج طلوع ہو رہا تھا۔ پیرس کی ٹھنڈی ہوا اُن کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ ایک ٹیکسی اُن کے سامنے آکر رکی۔ اُنہوں نے ایک بار مڑ کر ہسپتال کی بلند عمارت کو دیکھا۔ اُنہیں محسوس ہوا جیسے اُن کی زندگی کا ایک باب اسی عمارت میں رہ گیا ہو۔ اگلے چند گھنٹوں بعد وہ پاکستان روانہ ہو گئیں۔ اُن کے پاس اب نہ نوکری تھی، نہ کوئی اعزاز... صرف ایک دعا تھی جو ہر سانس کے ساتھ حمزہ کے نام ہو چکی تھی۔

دوسری طرف پیرس پولیس کی تفتیش تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ تحقیقات کے دوران نئے شواہد سامنے آنے پر اداکارہ "بیلا لارک" کو باقاعدہ حراست میں لے لیا گیا۔ اُس سے حمزہ پر حملے اور جمی کی ویڈیو سے متعلق پوچھ گچھ شروع کی گئی۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے یورپ میں پھیل گئی۔ میڈیا مختلف قیاس آرائیاں کر رہا تھا، مگر تفتیش ابھی جاری تھی اور حتمی فیصلہ عدالت کے ہاتھ میں تھا۔

فینگ خاموشی سے تفتیشی دفتر کے باہر کھڑا تھا۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا، "حسد... شاید یہی وہ آگ ہے جو پہلے انسان کے دل میں لگی تھی اور آج بھی کتنے گھر جلا رہی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ انسان اکثر دوسرے کی کامیابی سے اس لیے جلنے لگتا ہے کیونکہ وہ اپنی نعمتوں پر نظر ڈالنے کے بجائے دوسروں کی نعمتیں گننے لگتا ہے۔ حسد آہستہ آہستہ دل کا سکون چھین لیتا ہے۔ پہلے انسان دوسرے کی خوشی برداشت نہیں کر پاتا، پھر اُس کی کامیابی، پھر اُس کی عزت... اور اگر اس آگ کو نہ روکا جائے تو وہ انسان سے ایسے فیصلے بھی کروا دیتی ہے جن پر پوری زندگی پچھتانا پڑتا ہے۔
اسی لیے اسلام نے حسد سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے، کیونکہ یہ صرف دوسرے کو نقصان نہیں پہنچاتا، سب سے پہلے حسد کرنے والے کے اپنے دل کو جلاتا ہے۔

اسی وقت آئی سی یو کے کمرے میں بے ہوش پڑے حمزہ کی انگلی ہلکی سی حرکت کرنی لگی۔

نرس فوراً مانیٹر کی طرف دیکھا۔

اس کی دھڑکن پہلے سے زیادہ مستحکم ہو رہی تھی۔

مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا،

کہ جس انسان کا وہ کئی ماہ سے خاموشی سے انتظار کرتا رہا،

وہ چند گھنٹے پہلے ہمیشہ کے لیے پیرس چھوڑ کر جا چکی تھی۔

مانیٹر پر دل کی دھڑکن کی رفتار میں معمولی تبدیلی آئی تو ڈیوٹی پر موجود نرس فوراً اُس کے قریب پہنچی۔ چند لمحوں بعد حمزہ کی پلکیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ روشنی اُس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ اُس نے اردگرد دیکھا، مگر سب کچھ دھندلا تھا۔

کافی دیر بعد اُس کی نظر کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی گرینی پر پڑی۔ اُن کے ہاتھ میں تسبیح تھی، مگر جیسے ہی اُنہوں نے حمزہ کو آنکھیں کھولتے دیکھا، اُن کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ وہ جلدی سے اُس کے قریب آئیں، اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بار بار اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں۔ اُن کی زبان سے صرف ایک ہی جملہ نکل رہا تھا، "الحمدللہ... الحمدللہ... میرا بچہ واپس آ گیا۔"

حمزہ نے لب ہلانے کی کوشش کی، مگر آواز جیسے کہیں گم ہو گئی تھی۔ چند لمحوں بعد اُس نے بمشکل سرگوشی کی، "گرینی"

گرینی نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"کچھ مت بولو، بیٹا... اللہ نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔"

دروازہ آہستہ سے کھلا اور فینگ اندر داخل ہوا۔ کئی دنوں کی بے خوابی اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ جیسے ہی اُس کی نظر حمزہ پر پڑی، اُس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی، مگر اُس نے حسبِ عادت مسکرانے کی کوشش کی۔

"آخر کار جناب کو ہوش آ ہی گیا"

حمزہ نے ہلکی سی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی، مگر درد نے اُسے روک لیا۔

کمرے میں چند لمحوں تک خاموشی رہی۔

پھر اچانک حمزہ کی نظریں اِدھر اُدھر کسی کو تلاش کرنے لگیں۔

اُس نے دروازے کی طرف دیکھا،

پھر کھڑکی کی طرف،

پھر دوبارہ فینگ کی طرف۔

اُس کی آواز ابھی بھی کمزور تھی۔

"وہ... کہاں ہے؟"

فینگ خاموش رہا۔

حمزہ نے دوبارہ پوچھا۔

"ڈان"

اس بار فینگ نے نظریں جھکالیں۔

کمرے میں ایک ایسی خاموشی اتر آئی جس کی آواز کسی بھی جواب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

حمزہ کی بے چینی بڑھنے لگی۔

"فینگ... بتاؤنا... وہ کہاں ہے؟"

فینگ نے گہری سانس لی۔ اُس کے لیے شاید یہ زندگی کا سب سے مشکل جملہ تھا۔

وہ آہستہ آہستہ حمزہ کے بستر کے قریب آیا، کرسی کھینچ کر اُس کے سامنے بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا،

"حمزہ... اُس نے تمہاری جان بچانے کے لیے اپنی نوکری داؤ پر لگا دی تھی۔ کمیٹی نے اُسے معطل کر دیا... پھر ملازمت ختم کر دی گئی۔"

حمزہ خاموشی سے سنتا رہا۔

فینگ کی آواز مزید بھاری ہو گئی۔

"اور... وہ چلی گئی۔"

حمزہ کی پلکیں بے اختیار جھپکیں۔

"کہاں...؟"

"پاکستان"

یہ ایک لفظ نہیں تھا،

جیسے کسی نے حمزہ کے سینے پر ایک اور زخم رکھ دیا ہو۔

وہ کئی لمحوں تک چھت کو دیکھتا رہا۔

نہ اُس نے کچھ کہا،

نہ کوئی سوال کیا،

صرف اُس کی آنکھوں کے کنارے سے ایک آنسو خاموشی سے تکیے پر گر گیا۔

فینگ نے لرزتی آواز میں کہا،

"جاتے ہوئے وہ تمہارا کوٹ واپس رکھ گئی تھی... "

گرینی نے خاموشی سے کرسی پر رکھا وہ کوٹ اٹھایا اور حمزہ کی طرف بڑھا دیا۔

حمزہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوٹ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کپڑے میں کسی کی خاموش دعائیں اب بھی محفوظ ہوں۔

فینگ آہستہ سے بولا،

"وہ تمہیں جگانا نہیں چاہتی تھی... بس ایک بار تمہیں دیکھ کر خاموشی سے چلی گئی۔"

حمزہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔

صرف مانیٹر کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔

اور ایک ایسا دل دھڑک رہا تھا،

جسے زندگی تو دوبارہ مل گئی تھی،

مگر جس کی سب سے بڑی خوشی اُس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی اُس سے بہت دور جا چکی تھی۔

شاید کسی روز میری کمی محسوس ہو تجھے،

جب ہر طرف لوگ ہوں، پھر بھی تنہائی ملے تجھے،

میں تو خاموشیوں مین اپنا سفر پورا کر گیا،

تو ہر موڑ میر انشان ڈھونڈ ھتا رہ گیا،

وقت بہت کچھ بدل دیتا ہے، یہ سچ ہے مگر،

کچھ درد عمر بھر دل کے کسی کونے میں رہتے ہیں،

کچھ لوگ مل بھی جائے تو داغ کہاں مٹتے ہیں،

کچھ لوگ بچھڑ کر بھی روح میں بس جاتے ہیں،

اگر کبھی میری یاد تیری آنکھیں بھگو دیں،

تو سمجھ لینا عشق سچ تھا، بس مقدر اپنا نہ تھا۔

لاہور کی فضا پیرس سے بالکل مختلف تھی۔ صبح کی ہلکی ٹھنڈی ہوا، اذان کی آواز اور پرندوں کی چہچہاہٹ ایک عجیب سا سکون دے رہی تھی، مگر ڈاکٹر عنایہ کے دل میں کوئی سکون نہیں تھا۔ کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد جب وہ لاہور ایئرپورٹ سے باہر نکلیں تو اُن کے قدموں میں تھکن سے زیادہ اُن کے ہاتھ میں صرف ایک چھوٹا سا بیگ تھا، لیکن دل میں وہ بوجھ تھا جسے شاید پوری اداسی تھی۔ زندگی بھی ہلکا نہ کر سکتی۔ عنایہ کے والد وہاں موجود تھے، عنایہ آنے سے پہلے سب کو بتا چکی تھی۔

جب وہ اپنی خالہ کے گھر پہنچیں تو دروازہ کھلتے ہی اُن کی والدہ نے اُنہیں سینے سے لگالیا۔ خالہ نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا پوچھا، "سفر کیسا رہا، بیٹا؟" عنایہ نے بھی مسکرانے کی کوشش کی، مگر وہ مسکراہٹ آنکھوں تک نہ پہنچ سکی۔ ریان آفس جبکہ حذیفہ پی ایم اے، کاکول تھا۔ اُنہوں نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنی مرضی سے واپس نہیں آئیں، بلکہ اپنی ملازمت کھو کر لوٹی ہیں۔ نہ اُنہوں نے حمزہ کا ذکر کیا، نہ آپریشن کا، نہ اُن آنسوؤں کا جو پیرس کے ہسپتال میں اُن کی آنکھوں سے بہتے رہے تھے۔ اُنہوں نے صرف اتنا کہا، "بس... کچھ دن آپ لوگوں کے ساتھ رہنے کا دل چاہا تھا۔

اکثر انسان اپنے والدین سے جھوٹ نہیں بولتا، مگر ہر سچ بھی نہیں بتا پاتا۔ اس کی وجہ بے اعتمادی نہیں ہوتی، بلکہ محبت ہوتی ہے۔ اولاد جانتی ہے کہ اُس کا ایک دکھ اُس کے ماں باپ کی کئی راتوں کی نیند چھین سکتا ہے، اس لیے وہ اپنے آنسو خود پی جاتی ہے تاکہ والدین کی آنکھیں نم نہ ہوں۔ لیکن بعض اوقات یہی خاموشیاں دل پر اتنا بوجھ ڈال دیتی ہیں کہ انسان باہر سے مسکراتا رہتا ہے اور اندر سے آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگتا ہے۔

دوسری طرف پیرس کے اُس ہسپتال میں حمزہ ابھی تک بستر پر لیٹا چھت کو دیکھ تا رہتا تھا۔ جسم کی تکلیف پہلے سے کم تھی، مگر دل کا درد ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اُس کرسی کی طرف دیکھتا کہ شاید عنایہ آجائے۔ اُس نے کئی مرتبہ فون اٹھایا، پھر خاموشی سے واپس رکھ دیا۔ نہ اُس کے پاس عنایہ کا نمبر تھا، نہ کوئی ایسا راستہ جس سے وہ اُس تک پہنچ سکتا۔ اُس نے دل ہی دل میں صرف ایک دعا کی، "یا اللہ! اگر وہ جہاں بھی ہے، خیریت سے ہو، تو میرے لیے یہی کافی ہے۔"

فینگ روز کی طرح اُس سے ملنے آیا، مگر آج اُس کے چہرے پر کئی دنوں بعد اطمینان کی ایک جھلک تھی۔ اُس نے خاموشی سے ایک فائل حمزہ کے سامنے رکھی اور کہا، "تفتیش مکمل ہو گئی ہے۔ عدالت نے دستیاب شواہد کی بنیاد پر بیلا لارک کے خلاف الزامات کو ثابت قرار دیا ہے، اور جمی کی ویڈیو کے معاملے میں بھی اُس کے کردار کی تصدیق ہو گئی ہے۔"

حمزہ نے فائل کو دیکھا، مگر کھولی نہیں۔

"فینگ نے حیرانی سے پوچھا، "تم جاننا نہیں چاہتے کہ اُس نے ایسا کیوں کیا؟

حمزہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"وجہ جان کر جمی واپس نہیں آئے گی... اور نہ ہی میرا گزرا ہوا وقت واپس آئے گا۔"

فینگ خاموش ہو گیا۔

اُدھر لاہور میں ریان کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ عنایہ واپس آگئی ہیں، وہ فوراً اُن سے ملنے گھر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا تو دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے رہے۔ ریان نے صرف ایک نظر عنایہ کے چہرے پر ڈالی اور سمجھ گیا کہ یہ وہ عنایہ نہیں جو چند ماہ پہلے پیرس گئی تھی۔ اُس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ بعض رشتے لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے، آنسو ہی اُن کی زبان بن جاتے ہیں۔

اسی شام پی ایم اے کاکول میں چھ ماہ کی سخت تربیت مکمل کرنے کے بعد حذیفہ بھی لاہور پہنچ گیا۔ یونیفارم میں ملبوس وہ پہلے سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور مضبوط دکھائی دے رہا تھا۔ گھر آتے ہی اُس نے سب سے پہلے اپنی بہن کو ڈھونڈا۔ عنایہ کو دیکھ کر وہ خوش تو ہوا، مگر بہن کی آنکھوں کی ویرانی اُس سے چھپی نہ رہ سکی۔ اُس نے مسکرا کر پوچھا، "آپ ٹھیک ہیں نا؟ آپی"

عنایہ نے ہمیشہ کی طرح جواب دیا، "ہاں... میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

مگر حذیفہ فوجی تربیت سے ایک بات ضرور سیکھ چکا تھا،

کبھی کبھی سب سے بڑا جھوٹ وہ ہوتا ہے جو انسان مسکراتے ہوئے کہتا ہے کہ "میں ٹھیک ہوں۔"

رات گہری ہونے لگی۔

مگر ہر ایک اپنے خیالوں میں گم تھا۔

دوسری طرف پیرس کے ایک ہسپتال کے کمرے میں حمزہ کھڑکی سے چاند کو دیکھ رہا تھا۔

دونوں شہروں کے درمیان ہزاروں میلوں کا فاصلہ تھا۔

لیکن دونوں کے سجدوں میں مانگی جانے والی دعا ایک ہی تھی۔

ایک دعا جس کا فیصلہ اب صرف اللہ کی حکمت کے ہاتھ میں تھا۔

لاہور کی ایک پُر سکون صبح تھی۔ نور منہاج اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی کتاب کھولے ضرور بیٹھی تھیں، مگر اُن کی نظریں کسی لفظ پر نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ دل بار بار ایک ہی نام پر جا کر رک جاتا تھا... "ریان"۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھیں کہ یہ احساس کب اُن کے دل میں جگہ بنا گیا۔ شاید اُس دن جب ریان نے پہلی بار بغیر کسی بناوٹ کے اُن کی بات سنی تھی، یا شاید اُس دن جب اُس نے ایک اجنبی کی طرح نہیں، ایک محافظ کی طرح اُن کی عزت کا خیال رکھا تھا۔ مگر نور اچھی طرح جانتی تھیں کہ محبت کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اللہ کی حدود کو بھول جائے۔ اسی لیے اُنہوں نے کبھی ریان سے اپنے

جذبات کا اظہار نہیں کیا، نہ ہی اُس سے تنہائی میں بات کرنے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے اپنے دل کو صرف صبر کا سبق دیا تھا۔

نور کی زندگی میں والدین یا بہن بھائیوں کا سہارا نہیں تھا۔ اُن کے دل کی ہر بات صرف ایک ہی انسان جانتا تھا... اُن کی بچپن کی دوست عائشہ۔ نور نے فون اٹھایا اور عائشہ کو اپنے گھر بلا لیا۔ کچھ دیر بعد عائشہ آ گئی۔ دونوں کمرے میں اکیلی بیٹھیں تو نور کی آنکھوں میں برسوں سے چھپا ہوا راز آنسو بن کر اُتر آیا۔

"عائشہ..." نور نے دھیمی آواز میں کہا، "مجھے لگتا ہے... میں ریان کو پسند کرنے لگی ہوں۔"

عائشہ چند لمحے خاموش رہی، پھر مسکرا کر بولی، "پھر بتا کیوں نہیں دیتیں؟"

نور نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں... اگر میرے نصیب میں وہ لکھا ہو گا تو اللہ خود راستہ بنا دے گا۔ میں کسی نامحرم سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتی۔ محبت اگر حلال راستے تک نہ پہنچے تو انسان کے دل کو بے چین کر دیتی ہے، اور میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے اللہ مجھ سے ناراض ہو۔"

عائشہ نے نور کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم فکر نہ کرو... میں کسی سے تمہارا راز نہیں کہوں گی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا، اللہ کے فیصلے انسان کی سوچ سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔"

نور نے خاموشی سے "الحمدللہ" کہا اور اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کر لیے۔

ایک دن ریان، حذیفہ کے ساتھ بازار سے واپس آ رہا تھا۔ دونوں حسبِ معمول راستے بھر ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے رہے۔ گھر کے قریب پہنچے تو عائشہ باہر نکل رہی تھی۔ حذیفہ کو کسی جاننے والے نے آواز دی، وہ چند لمحوں کے لیے دوسری طرف چلا گیا۔ عائشہ کی نظر ریان پر پڑی تو وہ چند لمحے رکی، پھر مسکراتے ہوئے بولی،

"ریان... ایک بات کہوں؟"

"جی، کہیے۔"

عائشہ نے چند لمحے سوچا، پھر کہا،

"صرف اتنا جان لیجیے... دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو آپ کی عزت کرتا ہے، آپ کی دعاؤں میں خیر مانگتا ہے... مگر اللہ کی رضا کی خاطر اپنے جذبات کو اپنے دل میں چھپائے بیٹھا ہے۔"

ریان حیران رہ گیا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

عائشہ نے مسکرا کر جواب دیا،

"ہر بات کا جواب وقت دیتا ہے... میں نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی۔

ریان کافی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ اُس کے ذہن میں عائشہ کے الفاظ مسلسل گونج رہے تھے۔ شام کو وہ بے اختیار نور کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُسے یاد آیا کہ نور نے کبھی اُس سے غیر ضروری بات نہیں

کی، کبھی بے تکلفی اختیار نہیں کی، ہمیشہ نظریں جھکا کر بات کی اور ہر ملاقات میں وقار اور حیا کا دامن تھامے رکھا۔

اچانک اُس کے دل میں ایک خیال آیا۔

"کیا... وہ؟"

یہ سوچتے ہی اُس کے چہرے پر ایک بے اختیار مسکراہٹ آگئی، مگر اگلے ہی لمحے اُس نے خود کو سنبھال لیا۔

اُس رات ریان نے پہلی بار محسوس کیا کہ شاید اُس کے دل میں بھی نور کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا، مگر اُس نے فیصلہ کیا کہ اُس احساس کو الفاظ نہیں، صبر اور دعا کا سہارا دے گا۔

گھر کے اندر کسی کو بھی خبر نہیں تھی۔

کہ دو دل خاموشی سے ایک دوسرے کے لیے دھڑکنے لگے تھے۔

اور دونوں نے اپنے جذبات کو اللہ کی رضا کے سپرد کر دیا تھا۔

پیرس سے واپسی کے چند ہفتوں بعد زندگی آہستہ آہستہ اپنی معمول کی رفتار کی طرف لوٹنے لگی، مگر عنایہ کے دل میں اب بھی ایک ایسا خلا تھا جسے وہ کسی سے بیان نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ماضی کو بدلنا ممکن نہیں، لیکن حال سے بھاگنا بھی حل نہیں۔ کئی انٹرویوز کے بعد آخرکار اُنھوں نے شیخ زید ہسپتال، لاہور میں بطور نیفرولوجی سرجن اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ یہ ہسپتال اُن کی خالہ کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے آنا جانا بھی آسان تھا۔ ہسپتال کے پہلے ہی دن جب اُنھوں نے

سفید کوٹ پہنا تو ایک لمحے کے لیے اُن کی نظریں خالی ہو گئیں۔ اُنہیں پیرس کا وہ آپریشن تھیٹر یاد آیا، وہ لمبی رات، وہ سرخ بتی، اور آئی سی یو میں بے ہوش پڑا حمزہ۔ اُنہوں نے فوراً استغفار کیا اور دل ہی دل میں کہا، "یا اللہ! میرے دل کو اپنے ذکر سے زندہ رکھ، کسی مخلوق کی یاد مجھے تجھ سے غافل نہ کر دے۔"

دوسری طرف ریان کو اب تک صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ اتوار کے دن ایک "اہم جگہ" جانا ہے۔ روبینہ بیگم اور اُن کے شوہر بار بار مسکرا رہے تھے، مگر کوئی بھی اصل بات زبان پر نہیں لا رہا تھا۔ ریان نے کئی مرتبہ پوچھا، "آخر جا کہاں رہے ہیں؟" مگر ہر بار جواب یہی ملتا، "پہنچ کر پتہ چل جائے گا۔" حذیفہ، جسے پوری حقیقت معلوم تھی، جان بوجھ کر ریان کو چھیڑنے میں لگا ہوا تھا۔ کبھی کہتا، "کہیں رشتہ دیکھنے تو نہیں جا رہے۔ یار، اگر سامنے والی لڑکی نے تمہیں دیکھتے ہی انکار کر دیا تو؟" کبھی ہنستے ہوئے بولتا، "پہلے ہی بتا دو، بھاگنے کا ارادہ تو نہیں؟"

ریان نے مصنوعی غصے سے کہا، "بھائی! کم از کم یہ تو بتا دیں کس کے گھر جا رہے ہیں؟"

حذیفہ نے قہقہہ لگایا۔

"اتنا صبر نہیں کر سکتے؟ ابھی سے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ہے، آگے کیا کرو گے؟"

گھر میں سب لوگ ریان کی گھبراہٹ دیکھ کر ہنس رہے تھے، جبکہ ریان خود حیران تھا کہ آخر ایسی کون سی بات ہے جو سب اُس سے چھپا رہے ہیں۔

ادھر نور منہاج کے گھر میں بھی ایک الگ ہی منظر تھا۔ نور کو عائشہ نے صرف اتنا بتایا تھا کہ آج کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ عائشہ صبح ہی اُس کے پاس پہنچ گئی تھی تاکہ تیاریوں میں ہاتھ بٹا سکے۔ نور بار بار اُس سے ایک ہی سوال پوچھ رہی تھیں، "بتا کون آرہا ہے؟" عائشہ ہر بار مسکرا کر جواب دیتی،

"سرپرائز"

نور کے دل کی دھڑکن معمول سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ وہ خود بھی اس بے چینی کی وجہ نہیں سمجھ پا رہی تھیں۔ شاید دل کو کبھی کبھی آنے والے فیصلوں کی آہٹ پہلے ہی محسوس ہو جاتی ہے۔

دوپہر کو شاہینہ، روبینہ بیگم، اُن کے شوہر، عنایہ، حذیفہ اور ریان نور کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا تو عائشہ نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ رسمی گفتگو شروع ہوئی۔ چائے پیش کی گئی، حال احوال پوچھا گیا، مگر ریان عائشہ کو دیکھ کر حیران تھا کہ آخر اصل بات کیا ہے۔

چند لمحوں بعد نور ٹرے میں چائے لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ اُن کی نظریں حسبِ عادت جھکی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی اُنہوں نے سامنے بیٹھے مہمانوں کی طرف دیکھا، اُن کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے لرز گئے۔

سامنے،

ریان بیٹھا تھا۔

نور کی سانس جیسے رک گئی۔

اُدھر ریان بھی چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گیا۔

اُسے یقین ہی نہیں آیا کہ جس گھر میں وہ آیا ہے... وہ نور منہاج کا گھر ہے۔

عائشہ ایک کونے میں خاموش کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔اُس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔اُس نے دل ہی دل میں کہا، "الحمدللہ... شاید اللہ نے دونوں کی خاموش دعائیں سن لی ہیں۔"

ریان ابھی تک حیرت سے نور کو دیکھ رہا تھا۔اُس کے ذہن میں عائشہ کے وہ الفاظ گونجنے لگے،

"دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے... جو آپ کے لیے دعا کرتا ہے"

اب اُسے سب سمجھ آ چکا تھا۔

یہی وہ لڑکی تھی۔

جو اُس کے لیے خاموشی سے دعا کرتی رہی۔

اور یہی وہ لڑکی تھی،

جسے وہ خود بھی دل ہی دل میں پسند کرنے لگا تھا، مگر کبھی اس احساس کو زبان نہ دے سکا۔

اسی دوران شاہینہ بیگم نے مسکراتے ہوئے خاموشی توڑی۔

"بیٹی اگر تم مناسب سمجھوں تو میں اپنے بیٹے ریان کے لیے تمھارا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔"

یہ الفاظ سنتے ہی نور کی آنکھیں نم ہو گئیں۔اُنہوں نے فوراً نظریں جھکا لیں تاکہ کوئی اُن کے آنسو نہ دیکھ سکے۔

ریان نے بھی بے اختیار دل میں "الحمدللہ" کہا۔

اُسے محسوس ہوا،

کبھی کبھی اللہ انسان کی وہ دعائیں بھی قبول کر لیتا ہے،

جو اُس نے مانگی بھی نہیں ہوتیں، صرف دل میں محسوس کی ہوتی ہیں۔

حذیفہ ریان کو دیکھ کر مسکرا کر بولا: "سم تھنگ، سم تھنگ!"

عنایہ نے جب یہ منظر دیکھا تو بااختیار حمزہ کا چہرہ اس کے ذہن میں نمودار ہوا۔

نورہر ریان کا نکاح ٹھیک اگلے اتوار ہونا طے پایا۔

پیرس کی سرد شام آہستہ آہستہ رات میں بدل رہی تھی۔ کئی ہفتوں بعد حمزہ کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ جسم کے زخم آہستہ آہستہ بھر رہے تھے، مگر دل کے زخم پہلے سے زیادہ گہرے ہو چکے تھے۔ فینگ اور گرینی اُسے خاموشی سے گھر لے آئے۔ وہی عظیم الشان اپارٹمنٹ، جہاں کبھی چہل پہل ہوا کرتی تھی، آج قبرستان جیسی خاموشی اوڑھے کھڑا تھا۔ ہر دیوار پر اُسے اپنے بابا کی آواز سنائی دیتی، ہر کمرے میں اُن کی یاد بسی ہوئی تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ انسان کے جانے کے بعد اُس کی جائیداد نہیں، اُس کی یادیں گھر کی دیواروں میں زندہ رہتی ہیں۔

حمزہ آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ دروازہ کھولتے ہی اُس کی نظریں سیدھی اُس میز پر جا کر ٹھہر گئیں جہاں اُس کا سیاہ ہیلمٹ رکھا تھا۔ وہی ہیلمٹ جسے پہن کر وہ روز ہسپتال جاتا تھا، صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے۔ اُس کے برابر وہ لمبا کوٹ بھی رکھا تھا جو عنایہ واپس کر گئی تھیں۔ حمزہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوٹ اٹھایا، اُسے چند لمحے خاموشی سے دیکھا، پھر سینے سے لگا لیا۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اُسے وہ بارش والی رات یاد آ گئی، وہ چائے، وہ جھاڑو، وہ بے وقوفیاں، وہ خاموش دعائیں... اور پھر وہ لمحہ جب عنایہ بغیر کچھ کہے ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھیں۔

اُس نے فوراً کوٹ واپس رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ کئی مہینوں سے دل میں جمع ہونے والا درد آج آنسو بن کر بہنے لگا۔ نہ وہاں کوئی کیمرہ تھا، نہ کوئی مداح، نہ کوئی اداکار۔ آج صرف ایک ٹوٹا ہوا انسان تھا جو اپنے رب کے سامنے اپنی بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا، وضو کیا، جائے نماز بچھائی اور دو رکعت نفل ادا کیے۔ سلام پھیرنے کے بعد اُس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

یا اللہ... میں نے اپنی زندگی میں بہت غلطیاں کیں۔ میں نے لوگوں کی محبت کو تیری رضا پر ترجیح دی، اسی لیے بار بار ٹوٹتا رہا۔ آج میں تیرے سامنے خالی ہاتھ کھڑا ہوں۔ اگر عنایہ میرے نصیب میں ہے تو اُسے حلال طریقے سے میری زندگی میں واپس لے آ، اور اگر نہیں... تو میرے دل کو اتنا مضبوط بنا دے کہ میں تیرے فیصلے پر راضی رہ سکوں۔ اے اللہ! مجھے میرے نفس کے حوالے کبھی مت کرنا۔"

دعا ختم ہوئی تو حمزہ کافی دیر تک سجدے میں روتا رہا۔ گرینی دروازے کے باہر خاموش کھڑی تھیں۔ اُنہوں نے پہلی بار اس کو اس طرح اپنے رب کے سامنے ٹوٹتے دیکھا تھا۔ اُن کے لبوں پر بے اختیار "آمین" نکل گیا۔

کچھ دیر بعد فینگ بھی کمرے میں آ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ حمزہ کھڑکی کے پاس کھڑا پیرس کی روشن سڑکوں کو خاموشی سے دیکھ رہا ہے۔ یہی شہر کبھی اُس کی شہرت کی پہچان تھا، مگر آج اُسے یہاں ہر چیز اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" فینگ نے آہستہ سے پوچھا۔

حمزہ نے کافی دیر تک کوئی جواب نہ دیا۔ پھر دھیرے سے بولا،

فینگ... "بعض شہر انسان کو اس لیے نہیں تھکاتے کہ وہ بڑے ہوتے ہیں... بلکہ اس لیے کہ اُن میں بہت زیادہ یادیں رہ جاتی ہیں۔"

فینگ خاموش رہا۔

حمزہ نے گہری سانس لی۔

بابا نہیں رہے... فلمی دنیا میرے لیے ختم ہو چکی... عنایہ یہاں نہیں... اور اب اس شہر میں میرا انتظار کرنے والا بھی کوئی نہیں۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اُس نے اپنی جیب سے ایک پرانا، تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ یہ وہی کاغذ تھا جو مرنے سے پہلے اسفند صاحب نے گرینی کے حوالے کیا تھا۔

حمزہ نے اُسے آہستہ سے کھولا۔

اُس پر ایک پتہ درج تھا

اس کی ماں کے گھر کا ایک پتہ۔

وہ ماں... جس سے وہ بچپن کے بعد کبھی نہ مل سکا۔

اور اُس چھوٹے بھائی کا وجود،

جس کے بارے میں اُسے صرف چند دن پہلے معلوم ہوا تھا۔

حمزہ کافی دیر تک اُس پتے کو دیکھتا رہا۔

پھر اُس نے آہستہ سے کاغذ تہہ کیا، فینگ کی طرف دیکھا اور ایک ایسا فیصلہ سنایا جو اُس کی پوری زندگی بدلنے والا تھا۔

"میں پیرس چھوڑ رہا ہوں۔"

فینگ چونک گیا۔

"کہاں جاؤ گے؟"

حمزہ کی آنکھوں میں پہلی بار امید کی ہلکی سی روشنی دکھائی دی۔

"پاکستان"

وہ چند لمحے رکا، پھر مسکرا کر بولا،

"میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں... اور اُس بھائی سے بھی... جس نے شاید کبھی مجھے دیکھا بھی نہیں۔"

گرینی کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ نکلے۔

فینگ نے آگے بڑھ کر حمزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اور یوں،

برسوں پہلے بچھڑنے والی ایک کہانی،

اب اپنے اصل وطن کی طرف واپس سفر شروع کرنے والی تھی۔

12 August,

پیرس کی شام معمول سے کہیں زیادہ خاموش تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش شہر کی سڑکوں کو بھگو رہی تھی۔ حمزہ نے کئی دن بعد پہلی بار اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہوئی تو اُس نے ایک گہری سانس لی۔ یہی شہر کبھی اُس کی پہچان تھا، یہی سڑکیں اُس کی کامیابی کی گواہ تھیں، یہی عمارتیں اُس کے نام سے جگمگاتی تھیں۔ مگر آج اُس کے دل میں نہ شہرت کی خواہش تھی، نہ دولت کا غرور اور نہ ہی تالیوں کی طلب۔ آزمائشوں نے اُسے وہ سبق سکھا دیا تھا جو شاید کامیابیاں پوری زندگی نہ سکھا سکتیں۔ انسان جب اللہ سے دور ہو جاتا ہے تو پوری دنیا بھی اُس کے دل کا خلا نہیں بھر سکتی، اور جب اللہ کی طرف لوٹ آتا ہے تو ٹوٹے ہوئے دل میں بھی سکون اُترنے لگتا ہے۔

اُسی شام حمزہ خاموشی سے اپنے والد اسفند صاحب کی قبر پر پہنچا۔ قبر کے سامنے کھڑا وہ کافی دیر تک کچھ نہ بول سکا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک منظر گھومنے لگا۔ بچپن کی جدائیاں، جوانی کی غلطیاں، والد کی سختیاں، پھر اُن کا آخری وقت، اور وہ لمحہ جب اُنہوں نے مرتے ہوئے پہلی بار باپ ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے اُسے اُس کی ماں کا پتہ دیا تھا۔ حمزہ آہستہ سے قبر کے قریب بیٹھ گیا۔ اُس نے قرآنِ مجید کی چند آیات کی تلاوت کی اور خاموشی سے دعا کرنے لگا۔ آنسو مسلسل اُس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

بابا... اُس نے مدھم آواز میں کہا، "میں نہیں جانتا کہ آپ نے مجھے کبھی دل سے معاف کیا یا نہیں... مگر میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ شاید انسان زندگی میں سب سے زیادہ اپنے اُن لوگوں سے لڑتا

ہے جن سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اگر آپ آج زندہ ہوتے تو میں پہلی بار آپ کو گلے لگا کر کہتا کہ میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔"

وہ کافی دیر تک قبر کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے کھڑا ہوا اور آخری بار اُس مٹی کی طرف دیکھا جس کے نیچے اُس کا باپ ہمیشہ کے لیے سو چکا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں سورۂ عصر کی آیات دہرائیں۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اللہ اُسے یاد دلا رہا ہو کہ اصل کامیابی شہرت میں نہیں، ایمان اور نیک اعمال میں ہے۔

قبرستان سے نکل کر وہ سیدھا اپنے پروڈکشن ہاؤس پہنچا۔ وہاں پہلے سے ہی چند قریبی ساتھی، وکلاء اور فلم انڈسٹری کے کچھ لوگ موجود تھے۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ حمزہ علاج مکمل ہونے کے بعد دوبارہ فلمی دنیا میں واپسی کا اعلان کرے گا۔ مگر حمزہ نے مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر چند لمحے خاموشی اختیار کی، پھر پُرسکون لہجے میں کہا،

"انسان اپنی زندگی میں بہت سے خواب دیکھتا ہے، لیکن ہر خواب اُس کے لیے بہتر نہیں ہوتا۔ میں نے شہرت دیکھی، دولت دیکھی، عزت دیکھی... مگر میں نے یہ بھی دیکھا کہ اگر انسان اپنے رب سے دور ہو جائے تو یہ سب چیزیں ایک دن اُس کے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل جاتی ہیں۔ آج میں اپنی مرضی سے فلمی دنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا اعلان کرتا ہوں۔"

ہال میں مکمل خاموشی چھاگئی۔

حمزہ نے بات جاری رکھی۔

میری آزمائش نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ انسان کا اصل مقام وہ نہیں جہاں لوگ اُس کا نام لیتے ہیں، بلکہ وہ ہے جہاں اللہ اُس سے راضی ہو۔ اگر میری کسی فلم، کسی کردار یا کسی عمل سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو میں اللہ سے بھی معافی مانگتا ہوں اور آپ سب سے بھی۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی کمپنی کے قانونی کاغذات وکیل کے حوالے کر دیے۔

"میری جائیداد کا ایک بڑا حصہ اُن اداروں کے نام کیا جائے جو یتیم بچوں، گردوں کے مریضوں اور بے سہارا لوگوں کی خدمت کرتے ہیں۔ باقی معاملات قانون کے مطابق مکمل کر دیجیے۔"

ہال میں موجود ہر شخص حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ چند لوگوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ شاید پہلی بار اُنہوں نے ایک مشہور اداکار نہیں، بلکہ ایک بدلتا ہوا انسان دیکھا تھا۔

رات گئے حمزہ واپس گھر پہنچا۔ اُس نے اپنی الماری کھولی۔ اندر وہی سیاہ ہیلمٹ رکھا تھا، وہی لمبا کوٹ، وہ چشمہ، وہ ماسک... وہ تمام چیزیں جن کے سہارے وہ روز عنایہ کے قریب رہتا تھا، مگر اپنی شناخت چھپا لیتا تھا۔ اُس نے ایک بڑا بیگ نکالا اور ایک ایک چیز بڑے سکون سے اُس میں رکھتا گیا۔ ہر چیز کے ساتھ ایک یاد بند ہوتی جا رہی تھی۔ آخر میں اُس نے کوٹ کو ہاتھ میں لیا، چند لمحے اُسے دیکھا، پھر آہستگی سے بیگ میں رکھ کر بند کر دیا۔

"بعض یادوں کو بھلایا نہیں جاتا..." اُس نے آہستہ سے کہا، "... صرف اللہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔

گرینی اندر آئیں۔

"سب تیار ہے، بیٹا۔ کل صبح کی فلائٹ ہے۔"

حمزہ نے پورے کمرے پر ایک آخری نظر ڈالی۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں اُس نے کامیابیوں کا جشن بھی منایا تھا اور تنہائی میں آنسو بھی بہائے تھے۔ اُس نے لائٹ بند کی، دروازہ آہستہ سے بند کیا اور چابی میز پر رکھ دی۔

گرینی نے پوچھا، "کوئی چیز تو نہیں رہ گئی؟"

حمزہ ہلکا سا مسکرایا۔

"سامان کچھ نہیں رہ گیا، گرینی"

چند لمحے خاموش رہ کر اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

"بس ایک دل ہے... جو اب بھی پاکستان میں کسی انجان منزل کی طرف جا رہا ہے۔..."

کھڑکی کے باہر بارش تھم چکی تھی۔

بادل آہستہ آہستہ چھٹ رہے تھے۔

اور کئی مہینوں بعد پہلی بار،

افق پر طلوع ہونے والے سورج کی ہلکی سی روشنی میں کچھ بہتر دکھائی دینے لگا تھی۔

13 August,

صبح کی اذان ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ پیرس ایئرپورٹ کی وسیع عمارت مسافروں کی چہل پہل سے بھرنے لگی۔ حمزہ سادہ سفید شرٹ، گہرے رنگ کی پینٹ اور جیکٹ پہنے خاموشی سے گرینی اور فیننگ کے ساتھ ایئرپورٹ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نہ اُس کے ساتھ کوئی باڈی گارڈ تھا، نہ میڈیا کی بھیڑ اور نہ ہی مداحوں کا ہجوم۔ ایک وقت تھا جب اُس کے ایک قدم پر درجنوں کیمرے اُس کا تعاقب کرتے تھے، مگر آج وہ ایک عام مسافر کی طرح اپنا سامان خود اٹھائے چل رہا تھا۔ شاید اللہ کبھی کبھی انسان سے اُس کی ظاہری شان اس لیے لے لیتا ہے تاکہ اُسے اصل عزت کا راستہ دکھا سکے۔

چیک اِن مکمل ہونے کے بعد تینوں ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ گرینی بار بار حمزہ کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں، جیسے برسوں کی جدائی دوبارہ اُن کے سامنے کھڑی ہو۔ اُنہوں نے آہستہ سے حمزہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا، "بیٹا... اللہ نے تمہیں دوسری زندگی دی ہے، اسے صرف اُس کی رضا میں گزارنا۔ دنیا کے پیچھے بھاگنے والا آخر میں تھک جاتا ہے، مگر اللہ کی طرف چلنے والا کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔"

حمزہ نے خاموشی سے گرینی کا ہاتھ چوم لیا۔

"آپ نے ہمیشہ ماں بن کر میرا ساتھ دیا ہے۔ اگر آپ نہ ہوتیں تو شاید میں بہت پہلے ٹوٹ چکا ہوتا۔"

گرینی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اُنہوں نے فوراً اپنا رخ دوسری طرف کر لیا تاکہ حمزہ اُن کی کمزوری نہ دیکھ سکے۔

فیننگ حسبِ معمول ماحول ہلکا کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر آج اُس کی آواز بھی بوجھل تھی۔ اُس نے جیب سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر حمزہ کے ہاتھ میں رکھا۔

"یہ کیا ہے؟" حمزہ نے حیرانی سے پوچھا۔

فانگ ہلکا سا مسکرایا۔

"کھولنا پاکستان پہنچ کر۔"

"ابھی کیوں نہیں؟"

"کیونکہ کچھ چیزوں کا صحیح وقت ہوتا ہے۔"

حمزہ نے مزید سوال نہیں کیا۔ اُس نے لفافہ اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

بورڈنگ کا اعلان ہوا تو تینوں خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گرینی نے حمزہ کو سینے سے لگالیا۔ کئی لمحوں تک دونوں کچھ نہ بول سکے۔ پھر گرینی نے اُس کے کان میں صرف اتنا کہا،

"بیٹا... انسان جب سب کچھ ہار جائے، تب بھی اگر اُس کا رب اُس کے ساتھ ہو تو وہ حقیقت میں ہارا ہوا نہیں ہوتا۔"

حمزہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ان شاء اللہ، گرینی۔"

فینگ آگے بڑھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے گلے لگالیا۔

یہ صرف دو دوستوں کی جدائی نہیں تھی،

یہ اُن دو لوگوں کی جدائی تھی جنہوں نے ایک دوسرے کو ٹوٹتے، سنبھلتے، روتے اور دوبارہ جیتے دیکھا تھا۔

فینگ نے ہنستے ہوئے کہا،

"واپس آنا تو ایک کامیاب انسان بن کر"

حمزہ نے مسکرا کر جواب دیا،

"کامیاب اداکار نہیں"

وہ چند لمحے رکا۔

"کامیاب مسلمان بن کر۔..."

فانگ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"اللہ تمہیں ثابت قدم رکھے۔"

حمزہ نے آخری بار مڑ کر پیرس کی طرف دیکھا۔ اُس شہر نے اُسے شہرت بھی دی تھی، آزمائش بھی، محبت بھی، تنہائی بھی اور اپنے رب کی طرف لوٹنے کا راستہ بھی۔

وہ خاموشی سے جہاز میں داخل ہو گیا۔

جہاز نے رَن وے پر رفتار پکڑی۔

چند لمحوں بعد وہ زمین سے بلند ہو گیا۔

کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے حمزہ نے پیرس کو آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔ اُس نے دل ہی دل میں سورۂ شرح کی آیات دہرائیں۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ہر گزرتا لمحہ اُس کے ماضی کو پیچھے چھوڑ رہا ہو۔

اُسی وقت ہزاروں میل دور لاہور میں شیخ زید ہسپتال کی ایمرجنسی میں عنایہ اپنی ڈیوٹی شروع کر رہی تھیں۔ اُنہوں نے سفید کوٹ پہنا، مریضوں کی فائلیں ہاتھ میں لیں اور ایک لمحے کے لیے کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھا۔

اُنہیں معلوم نہیں تھا،

کہ اُسی آسمان کے نیچے،

ایک جہاز اُن کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اور اُس جہاز میں بیٹھا ایک مسافر،

اپنی ماں، اپنے بھائی،

اور اپنی تقدیر سے ملنے جا رہا تھا۔

لاہور کی فضاؤں میں داخل ہوتے ہی جہاز کی کھڑکی سے نیچے پھیلے ہوئے شہر پر حمزہ کی نظریں جم گئیں۔ سورج آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا اور اُس کی سنہری کرنیں لاہور کی عمارتوں پر بکھر رہی تھیں۔ حمزہ نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ وہی سرزمین تھی جہاں اُس نے جنم لیا تھا، مگر قسمت اُسے بچپن ہی میں اس سے دور لے گئی تھی۔ آج برسوں بعد وہ ایک اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن لوٹ رہا

تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں "الحمدللہ" کہا اور خاموشی سے دعا کی، "یا اللہ! اگر میری اس واپسی میں خیر ہے تو میرے لیے آسانیاں پیدا فرما، اور اگر اس میں کوئی آزمائش ہے تو مجھے صبر عطا فرما۔"

جہاز جیسے ہی لاہور ایئرپورٹ پر اترا، حمزہ نے سب سے آخر میں باہر قدم رکھا۔ ایئرپورٹ کی عمارت سے نکلنے سے پہلے اُس نے چند لمحوں کے لیے رُک کر زمین کی طرف دیکھا۔ اُس کے دل میں عجیب سی کیفیت تھی۔ اُس نے خاموشی سے سجدۂ شکر ادا کیا۔ نہ کسی نے اُس کی تصویر لی، نہ کسی نے اُس کا نام پکارا۔ ایک زمانہ تھا جب اُس کی آمد پر ہجوم جمع ہو جاتا تھا، مگر آج اُسے یہ گمنامی اپنی پرانی شہرت سے کہیں زیادہ خوبصورت محسوس ہو رہی تھی۔

ایئرپورٹ سے باہر آ کر اُس نے فینگ کا دیا ہوا لفافہ نکالا، جو وہ پورے سفر میں نہیں کھول سکا تھا۔ اُس نے ایک بینچ پر بیٹھ کر آہستہ سے لفافہ کھولا۔ اندر ایک خط، ایک تصویر اور ایک پتے کی پرچی رکھی تھی۔

حمزہ نے پہلے تصویر اٹھائی۔

تصویر میں ایک باوقار خاتون ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اُن کے بالوں میں اب سفیدی نمایاں ہو چکی تھی، مگر اُن کی آنکھوں میں ماں کی وہی شفقت موجود تھی۔

شاہینہ،

حمزہ کی ماں۔

تصویر اُس کے ہاتھوں میں کانپنے لگی۔

اُس نے برسوں بعد پہلی بار اپنی ماں کا چہرہ دیکھا تھا۔

اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

وہ تصویر پر ہاتھ پھیر کر روتا رہا،

پھر اُس نے فینگ کا خط کھولا۔

میرے دوست،

جب تم یہ خط پڑھ رہے ہو گے تو شاید تم اپنی زندگی کے سب سے مشکل سفر پر ہو۔ تم نے لوگوں کو معاف کرنا سیکھ لیا ہے، اب خود کو بھی معاف کر دینا۔ تمہاری ماں نے تمہیں کبھی بھلایا نہیں۔ اُن کی ہر دعا میں تم شامل رہے ہو، چاہے تمہیں اس کا علم نہ تھا۔

ایک بات یاد رکھنا، اگر وہ تمہیں پہچان نہ سکیں تو ناراض مت ہونا، کیونکہ وقت چہرے بدل دیتا ہے، مگر ماں کا دل نہیں بدلتا۔

تمہارا بھائی بھی وہیں ہے، لیکن بہتر یہی ہو گا کہ پہلے اپنی ماں سے ملو، باقی حقیقت وقت پر سامنے آ جائے گی۔

...اور ہاں

اس بار اپنی زندگی محبت کے پیچھے نہیں، اللہ کی رضا کے پیچھے گزارنا۔

تمہارا دوست،

"فانگ۔"

حمزہ نے خط بند کیا، آنکھیں صاف کیں اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

"اس پتے پر چلیں۔"

ڈرائیور نے سر ہلایا اور گاڑی لاہور کی مصروف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

راستے بھر حمزہ خاموش رہا۔

ہر سڑک، ہر درخت، ہر مسجد، ہر اذان اُس کے دل کو عجیب سا سکون دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد گاڑی ایک پُر سکون گلی میں رُک گئی۔

"صاحب... پتہ آگیا۔"

حمزہ نے کرایہ ادا کیا اور گاڑی سے باہر آگیا۔

سامنے ایک سادہ سا گھر تھا۔

نہ کوئی محل،

نہ کوئی شان و شوکت،

مگر اُس گھر کے اندر وہ رشتہ رہتا تھا جس کی کمی نے اُسے پوری زندگی ادھورا رکھا تھا۔

اُس کے قدم آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔

ہاتھ کانپ رہے تھے۔

سانسیں بے ترتیب ہو چکی تھیں۔

وہ کئی منٹ تک صرف دروازے کو دیکھتا رہا۔

دل بار بار کہہ رہا تھا۔

"اگر اُنہوں نے مجھے قبول نہ کیا تو؟"

پھر اُسے اپنے رب پر بھروسا آیا۔

اُس نے آہستہ سے "حَسۡبِیَ اللّٰہُ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ" پڑھا، آگے بڑھا اور لرزتے ہوئے ہاتھ سے دروازے کی گھنٹی بجادی۔

گھنٹی کی آواز کے ساتھ اُس کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔

چند لمحے بعد اندر سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلا۔

سامنے ایک باوقار خاتون کھڑی تھیں،

وقت نے اُن کے چہرے پر جھریاں ضرور بکھیر دی تھیں، مگر اُن کی آنکھوں میں ماں کی محبت آج بھی ویسی ہی تھی۔

حمزہ اُنہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔

وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا،

مگر لفظ اُس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

آخر کار اُس نے بمشکل اتنا کہا،

"م... معاف کیجیے گا"

"کیا"

"آپ"

"شاہینہ ہیں؟"

وہ چند لمحوں تک اُس اجنبی نوجوان کو دیکھتی رہیں۔

پھر نرمی سے بولیں،

"جی... میں ہی ہوں۔"

"آپ کون ہیں، بیٹا...؟"

یہ سوال سن کر حمزہ کے وجود میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔

وہ جواب دینا چاہتا تھا،

مگر برسوں کی جدائی،

اور ماں کے سامنے کھڑے ہونے کی کیفیت،

اُس کی زبان سے ہر لفظ چھین چکی تھی۔

اُس کی آنکھوں سے خاموشی سے ایک آنسو ٹوٹ کر زمین پر گرا،

اور برسوں پہلے بچھڑنے والی ایک کہانی،

اپنے سب سے اہم موڑ پر آ پہنچی۔

شاہینہ نے حیرت سے دوبارہ اُس کی طرف دیکھا، مگر اس بار اُن کی نظر اُس کے چہرے پر نہیں...

اُس کی آنکھوں پر جا کر ٹھہر گئی۔

وہی سبز مائل آنکھیں،

وہی خاموشی،

وہی درد،

ایک لمحے کے لیے اُن کے ذہن میں ریان کا چہرہ آیا، پھر اچانک جیسے وقت برسوں پیچھے چلا گیا۔ اُنہیں اپنے اُس ننھے بیٹے کی آنکھیں یاد آ گئیں، جسے حالات اُن سے چھین کر لے گئے تھے۔

اُن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

ہونٹ کانپنے لگے۔

اُنہوں نے بے اختیار ایک قدم آگے بڑھایا۔

"...یہ... یہ آنکھیں"

اُن کی آواز لرز رہی تھی۔

"یہ آنکھیں تو..."

حمزہ اب مزید خود کو سنبھال نہ سکا۔

اُس نے بھیگتی ہوئی آواز میں صرف ایک لفظ کہا۔

"امی"

یہ لفظ سنتے ہی جیسے شاہینہ کے وجود سے جان نکل گئی۔ اُن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ چند لمحے حمزہ کو دیکھتی رہیں، پھر کانپتے ہوئے ہاتھ اُس کے چہرے تک لے گئیں۔ اُنہوں نے اُس کے ماتھے کو چھوا، اُس کے گالوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا، اور مسلسل اُس کی آنکھوں کو دیکھتی رہیں۔

"حمزہ"

یہ لفظ اُن کے لبوں سے دعا کی طرح نکلا۔

"میرا... حمزہ...؟"

حمزہ اب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس نے جھکتے ہوئے اپنی ماں کے ہاتھ تھام لیے۔

"جی امی"

"میں... آپ کا حمزہ ہوں"

یہ سنتے ہی ان کی ساری ہمت جواب دے گئی۔ اُنہوں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ برسوں کی جدائی، ہزاروں راتوں کی دعائیں، بے شمار آنسو اور نہ جانے کتنی سجدوں کی التجائیں ایک ہی لمحے میں آنسو بن کر بہنے لگیں۔

"میرا بیٹا"

شاہینہ بار بار اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

میں نے کہا تھا نا... میرا اللہ میری دعائیں کبھی ضائع نہیں کرے گا۔لوگ کہتے تھے تم شاید کبھی واپس نہیں آؤ گے... مگر میں ہر تہجد میں صرف ایک ہی دعا مانگتی تھی کہ اے اللہ! ایک بار... صرف ایک بار میرے حمزہ کو میری آنکھوں کے سامنے لے آیا۔

حمزہ نے اپنی ماں کو پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی سے گلے لگالیا۔

"امی... مجھے معاف کر دیجیے۔ میں بہت دیر سے آیا... بہت دیر کر دی"

شاہینہ نے فوراً اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

نہیں بیٹا... ماں اپنے بچوں کے آنے کا حساب نہیں رکھتی۔ ماں صرف انتظار کرتی ہے۔ اگر بچہ برسوں بعد بھی واپس آجائے تو اُس کے لیے وہی دن عید بن جاتا ہے۔

دونوں ایک دوسرے سے لپٹے دیر تک روتے رہے۔ گلی سے گزرنے والے لوگ حیرت سے اُس منظر کو دیکھ رہے تھے، مگر اُس وقت نہ ماں کو دنیا کی خبر تھی، نہ بیٹے کو۔

آسمان پر ہلکی سی ہوا چلنے لگی۔

قریب کی مسجد سے مؤذن کی آواز بلند ہوئی۔

"حَيَّ عَلَى الْفَلَاح"

جیسے اللہ خود گواہی دے رہا ہو کہ صبر کرنے والوں کو وہ ایک دن اُن کی امید سے بھی بڑھ کر عطا کرتا ہے۔

برسوں پہلے بچھڑا ہوا ایک بیٹا،

آخرکار اپنی ماں کی آغوش میں واپس آچکا تھا۔

شاہینہ ابھی تک حمزہ کو اپنے سینے سے لگائے کھڑی تھیں۔ برسوں کی جدائی نے دونوں کے درمیان جو فاصلے پیدا کیے تھے، وہ چند لمحوں کے آنسوؤں میں سمٹتے جا رہے تھے۔ دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا، اور گلی سے آتی ٹھنڈی ہوا دونوں کے چہروں کو چھو رہی تھی۔ شاہینہ بار بار حمزہ کے ماتھے کو چومتی جاتیں، کبھی اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتیں اور کبھی دونوں ہاتھوں سے اُس کا چہرہ تھام کر اُسے دیکھنے لگتیں، جیسے ڈر ہو کہ اگر پلک جھپکی تو یہ منظر خواب بن کر بکھر جائے گا۔ اُن کی زبان پر صرف ایک ہی جملہ بار بار آ رہا تھا، "میرا بچہ... میرا حمزہ... میرا بیٹا واپس آ گیا۔"

ان کی آواز سن کر گھر کے اندر موجود روبینہ چونک گئیں۔ وہ جلدی جلدی کچن سے باہر آئیں۔ اُن کے پیچھے اُن کے شوہر بھی باہر آ گئے۔ دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا تو شاہینہ ایک نوجوان کو گلے لگائے مسلسل رو رہی تھیں۔ چند لمحوں تک کسی کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ روبینہ نے پریشانی سے آگے بڑھ کر شاہینہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"باجی... خیریت ہے؟ کیا ہوا؟"

شاہینہ نے آہستہ آہستہ اپنا چہرہ اُٹھایا۔ آنسو مسلسل بہہ رہے تھے، مگر اُن آنسوؤں میں برسوں بعد خوشی کی روشنی بھی شامل تھی۔ اُنہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے حمزہ کی طرف اشارہ کیا اور رندھی ہوئی آواز میں کہا،

"روبینہ... میرا حمزہ... واپس آ گیا"

یہ الفاظ سنتے ہی جیسے وقت ایک لمحے کے لیے ٹھہر گیا۔

روبینہ کی نظریں بے اختیار حمزہ کے چہرے پر جم گئیں۔ اُنہوں نے کئی لمحوں تک اُسے خاموشی سے دیکھا۔ پھر اُن کی آنکھوں میں بھی نمی اُتر آئی۔ برسوں پہلے کا وہ ننھا سا بچہ، جو اُن کی گود میں کھیلتا تھا، آج اُن کے سامنے ایک جوان مرد بن کر کھڑا تھا۔ اُنہوں نے آگے بڑھ کر حمزہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اُن کے لب کانپ رہے تھے۔

"حمزہ"

صرف ایک لفظ،

مگر اُس ایک لفظ میں برسوں کی جدائی، دعائیں اور بے شمار یادیں سمٹ آئی تھیں۔

حمزہ نے فوراً جھک کر اُن کے ہاتھ چوم لیے۔

"السلام علیکم... خالہ جان"

روبینہ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اُنہوں نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"وعلیکم السلام... بیٹا... اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے... تم زندہ ہو... تم واپس آ گئے"

روبینہ کے شوہر، جو اب تک خاموش کھڑے تھے، آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ اُنہوں نے حمزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اُن کی آنکھیں بھی نم تھیں، مگر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"بیٹا"

وہ چند لمحے خاموش رہے، پھر بولے،

"گھر آنے میں بہت دیر کر دی تم نے... لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے تمہیں صحیح سلامت واپس لوٹا دیا۔

حمزہ نے احترام سے اُن کے ہاتھ چوم لیے۔

"معاف کر دیجیے، خالو جان... تقدیر نے بہت لمبا راستہ لکھ دیا تھا۔"

اسی دوران اوپر والے کمرے کا دروازہ کھلا۔

حذیفہ، جو چند دن پہلے ہی اپنی ٹریننگ سے واپس آیا تھا، سیڑھیاں اُترتا ہوا نیچے آیا۔ اُس نے ڈرائنگ روم میں سب کو روتے دیکھا تو فوراً گھبرا گیا۔

"امی... کیا ہوا؟"

اُس کی نظر جیسے ہی حمزہ پر پڑی، وہ رک گیا۔

"یہ...؟"

روبینہ نے آنسو صاف کیے اور مسکراتے ہوئے کہا،

"حذیفہ... پہچانا نہیں؟"

حذیفہ نے نفی میں سر ہلایا۔

روبینہ نے محبت سے حمزہ کی طرف دیکھا۔

"یہ تمہارے حمزہ بھائی ہیں"

حذیفہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"حمزہ بھائی...؟"

اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے آگے بڑھا اور حمزہ سے لپٹ گیا۔

"بھائی... آپ واقعی واپس آ گئے...؟"

آپ کے بارے میں بہت سنا تھا، لیکن صرف تصویروں میں ہی آپ کو دیکھا تھا، آج حقیقت میں بھی دیکھ لیا۔

حمزہ نے بھی اُسے مضبوطی سے گلے لگا لیا۔

"ہاں... میرے بھائی"

اگرچہ خون کا رشتہ کزن کا تھا، مگر محبت نے اُس رشتے کو ہمیشہ بھائیوں جیسا ہی رکھا تھا۔

گھر میں کئی برس بعد پہلی بار خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

مگر قسمت نے ابھی ایک اور حیرت سنبھال کر رکھی تھی۔

اُسی لمحے باہر گیٹ بجنے کی آواز آئی۔

ساتھ ہی کسی گاڑی کے رکنے کی آواز بھی سنائی دی۔

روبینہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا،

"لگتا ہے حمزہ تمھارا بھائی آ گیا"

یہ سنتے ہی حمزہ کا دل ایک لمحے کے لیے رک سا گیا۔

وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

چند لمحوں بعد گیٹ کے باہر سے دو آوازیں سنائی دیں۔

ایک ریان کی،

اور دوسری،

عنایہ کی۔

عنایہ آج اسپتال سے معمول سے کچھ پہلے واپس آئی تھیں۔ اُنہیں ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ جس شخص کو وہ اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھیں،

وہ آج،

اُن ہی کے گھر کے دروازے کے اندر کھڑا تھا۔

دروازے کا ہینڈل آہستہ سے گھوما،

اور وقت ایک نئے امتحان کی دہلیز پر آ کھڑا ہوا۔

جیسے ہی دروازہ کھلا، ریان کو گھر کے اندر ایک عجیب سی خاموشی محسوس ہوئی۔ کسی کے سسکنے کی آواز آ رہی تھی۔ ریان کے قدم بے اختیار تیز ہو گئے، جبکہ عنایہ بھی پریشانی کے عالم میں اُس کے پیچھے اندر داخل ہوئی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اُس نے دیکھا کہ شاہینہ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی کھڑی ہیں، روبینہ کی آنکھیں سرخ تھیں، بابا خاموشی سے ایک طرف کھڑے تھے اور حذیفہ بھی غیر معمولی سنجیدگی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اُن سب کے درمیان ایک اجنبی نوجوان کھڑا تھا، جس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔

عنایہ کا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکا۔ چونکہ وہ اُس نوجوان کو نہیں جانتی تھی، اس لیے اُس نے فوراً اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ ہاتھ میں موجود فائلوں کو ذرا سا اوپر کیا تاکہ وہ خود کو اُس اجنبی کی براہِ راست نظر سے محفوظ رکھ سکے، اور خاموشی سے دیوار کی جانب ہو گئی۔ اُس نے نہ اُس نوجوان کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی، نہ کسی قسم کی بے تکلفی دکھائی۔

روبینہ نے عنایہ کو دیکھا تو آہستہ سے کہا، "بیٹا... اپنی خالہ کے لیے پانی کی لے آؤ۔

عنایہ نے کوئی سوال نہیں کیا۔

"جی امی۔"

وہ خاموشی سے پلٹی اور تیز قدموں سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ جاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اُس کے دل میں خیال آیا کہ آخر یہ اجنبی کون ہے، جس کی آمد نے پورے گھر کو اشک بار کر دیا ہے؟ مگر اُس نے فوراً اپنے دل کو روک لیا۔ ہر بات جان لینا ضروری نہیں ہوتا، اور ہر تجسس کا جواب فوراً تلاش کرنا بھی انسان کو زیب نہیں دیتا۔

اُدھر جیسے ہی عنایہ کچن سے باہر گئی، ریان کی نظریں پہلی بار اُس اجنبی نوجوان پر پڑیں۔ وہ حیرت سے چند لمحے اُسے دیکھتا رہا، پھر اپنی ماں شاہینہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"امی... یہ کون ہیں؟"

شاہینہ کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہہ نکلے۔ اُنہوں نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے حمزہ کی طرف اشارہ کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

"ریان... بیٹا... یہ تمہارے بڑے بھائی ہیں"

"حمزہ۔..."

یہ سنتے ہی ریان کے ہاتھ سے سامان زمین پر گر گیا۔

گھر میں ایک بار پھر خاموشی چھاگئی۔

اور وقت جیسے ایک نئے باب کا آغاز کرنے کے لیے ٹھہر گیا۔

"حمزہ"

یہ نام شاہینہ کے لبوں سے نکلا تو جیسے وقت ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔ ریان کی سماعت کو یقین ہی نہ آیا کہ اُس نے کیا سنا ہے۔ اُس کی نظریں پہلے اپنی ماں کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے پر جم گئیں، پھر آہستہ آہستہ اُس اجنبی نوجوان کی طرف اٹھیں، جو خاموشی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ گھر میں ایسی خاموشی چھاگئی تھی کہ سب کی سانسوں کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ ریان کے ہاتھ سے سامان زمین پر گر چکا تھا، مگر اُسے اس کا احساس تک نہ ہوا۔ اُس کے ذہن میں برسوں سے ایک ہی سوال زندہ تھا... میرا بڑا بھائی کہاں ہے؟ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ آج اچانک اُس سوال کا جواب اُس کے سامنے گوشت پوست کے انسان کی صورت میں کھڑا تھا۔

"امی... آپ... کیا کہہ رہی ہیں؟"

ریان کی آواز بری طرح کانپ رہی تھی۔ وہ جیسے خود کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ شاید اُس نے غلط سنا ہے۔ شاہینہ نے آنسو صاف کرنے کی ناکام کوشش کی، مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اُنھوں نے حمزہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا، جیسے برسوں بعد ملا ہوا بیٹا دوبارہ کہیں کھو نہ جائے، اور دھیرے سے بولیں، "بیٹا... یہ خواب نہیں... یہ تمہارا اپنا بڑا بھائی ہے... میرا حمزہ... اللہ نے میری برسوں کی دعائیں قبول کر لی ہیں۔"

ریان کے قدم بے اختیار آگے بڑھے۔ وہ حمزہ کے بالکل سامنے آکر رک گیا۔ دونوں خاموش تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، جیسے برسوں کا فاصلہ صرف آنکھوں کی زبان سے طے کرنا چاہتے ہوں۔ حمزہ نے پہلی بار ریان کو اتنے قریب سے دیکھا۔ اُسے اپنے بچپن کا عکس اُس کے چہرے میں نظر آیا۔ وہی آنکھیں... وہی پیشانی... وہی لہجہ، جو ابھی تک آنسوؤں میں گم تھا۔ حمزہ کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر حالات نے اُسے ماں سے جدا نہ کیا ہوتا تو شاید آج وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ہر دکھ، ہر خوشی اور ہر کامیابی میں اُس کے ساتھ کھڑا ہوتا۔

حمزہ نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے ریان کے کندھے کو چھوا۔ اُس کے لب ہلے، مگر آواز نکلنے سے پہلے ہی آنسو بہنے لگے۔ بڑی مشکل سے اُس نے کہا، "مجھے معاف کر دینا... میں تمہارا بچپن اپنے ساتھ نہیں گزار سکا۔ جب تم نے چلنا سیکھا ہو گا، میں تمہارے پاس نہیں تھا۔ جب تم نے پہلی بار اسکول جانا ہو گا، میں تمہارا ہاتھ پکڑنے والا بڑا بھائی نہیں تھا۔ جب تم گرے ہو گے، میں تمہیں اٹھانے نہیں آیا۔ اور جب تمہیں کبھی اپنے بڑے بھائی کی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی... میں کہیں بھی نہیں تھا۔ اور شاید تم اپنے باپ کو بھی بہت مِس کیا ہو گا،"

میرا کوئی باپ نہیں ہیں، میں انہیں بہت پہلے ہی مار چکا ہوں اپنے خیالوں میں۔ ریان کی آواز میں تلخی تھی۔

اور اب وہ حقیقت میں بھی مر چکے ہیں، حمزہ رنج کے عالم میں بول پڑا۔

اور سارا قصور میرا تھا۔

ریان نے یہ الفاظ سنے تو اُس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے فوراً دونوں ہاتھوں سے حمزہ کے ہاتھ پکڑ لیے اور سر نفی میں ہلایا۔ "ایسا مت کہیے، بھائی... قصور آپ کا نہیں تھا۔ قصور اُن حالات کا تھا جنہوں نے ہم سے ہمارا گھر چھین ہماری بچپن چھین لیا۔ میں نے ہمیشہ اللہ سے دعا کی تھی کہ اگر میرا بڑا بھائی زندہ ہے تو ایک دن ضرور واپس آئے گا۔ آج میرا رب مجھے میری دعا سے بھی بڑھ کر عطا کر رہا ہے۔"

یہ کہتے ہی ریان نے ایک لمحے کی بھی دیر نہ کی اور آگے بڑھ کر حمزہ کو مضبوطی سے گلے لگا لیا۔

حمزہ بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کو اس شدت سے سینے سے لگایا جیسے برسوں کا بچھڑا ہوا وجود دوبارہ مل گیا ہو۔ دونوں بھائی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اُن کی سسکیاں پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔ شاہینہ نے یہ منظر دیکھا تو اُنہوں نے آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دونوں ہاتھ دعا کے لیے بلند کر دیے۔

یا اللہ... تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تُو نے میرا بکھرا ہوا گھر پھر سے آباد کر دیا۔ تُو نے میری امید کو زندہ رکھا اور میری جھولی اُس نعمت سے بھر دی، جس کی امید لوگوں نے مجھ سے چھین لی تھی۔

روبینہ کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ اُنہوں نے آہستہ سے کہا، "اللہ تعالیٰ جب دیتا ہے تو انتظار کی ہر گھڑی کا صلہ ایک ہی لمحے میں دے دیتا ہے۔ انسان جلدی میں فیصلے کر لیتا ہے، مگر رب کبھی دیر نہیں کرتا، وہ بہترین وقت پر عطا کرتا ہے۔"

حذیفہ کے والد خاموشی سے کھڑے دونوں بھائیوں کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر سکون تھا۔ اُنہوں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ اے اللہ، جس گھر کو تُو نے آج دوبارہ جوڑا ہے، اسے کبھی دوبارہ بکھرنے نہ دینا۔

اُدھر کمرے کے دروازے کے پیچھے کھڑی عنایہ کے کانوں میں صرف ایک نام بار بار گونج رہا تھا،

"حمزہ"

اُس کے ہاتھ میں موجود گلاس بے اختیار کانپنے لگا۔

دل نے ایک لمحے کے لیے جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

وہ ابھی تک اُس اجنبی کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی۔

مگر نہ جانے کیوں،

اس نام نے اُس کے دل میں ایک ایسی بے چینی پیدا کر دی تھی جس کی وجہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

ریان اور حمزہ ابھی ایک دوسرے سے لپٹ کر رو ہی رہے تھے کہ روبینہ نے آنسو پونچھتے ہوئے گہری سانس لی۔ اُن کی نظریں اچانک ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف اٹھیں، جہاں عنایہ دونوں ہاتھوں سے پانی کی ٹرے سنبھالے خاموش کھڑی تھی۔۔ سر پر سفید دوپٹہ ضرور موجود تھا، مگر اُس کا چہرہ نمایاں تھا۔ وہ چند لمحوں سے خاموشی سے سامنے کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اُس کے لیے یہ سب کسی خواب سے کم نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا سمجھ پائی تھی کہ برسوں سے بچھڑا ہوا حمزہ واپس آ چکا ہے، مگر اُس

کے دل نے ابھی تک اس نام کو پیرس والے حمزہ سے نہیں جوڑا تھا۔شاید انسان بعض اوقات حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔

حذیفہ نے جیسے ہی عنایہ کو دیکھا، وہ خوشی سے اُس کی طرف بڑھا۔اُس کی آنکھوں میں برسوں بعد گھر لوٹنے والے اپنے کزن کی خوشی صاف جھلک رہی تھی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا، "آپی! ادھر "کیوں کھڑی ہیں؟ آئیں نا... دیکھیں، اللہ نے خالہ کی دعا سن لی۔ ہمارے حمزہ بھائی واپس آ گئے۔

عنایہ نے خاموشی سے ایک قدم آگے بڑھایا۔اُس کی نظریں اب بھی حمزہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ حمزہ نے بھی آہستہ آہستہ اپنا رخ اُس کی طرف کیا۔

سیاہ پر سکون آنکھیں ایک دفعہ پھر ہلکی جھیل جیسی سبز آنکھوں سے ٹکرائی۔

اور جیسے پوری دنیا ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔

حمزہ کی سانس سینے میں ہی رک گئی۔

البتہ اس نے عنایہ کا چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، پھر بھی وہ اسے آنکھوں سے پہچان چکا تھا،

یہ پہلی بار تھا کہ اُس نے عنایہ کو گھر کے ماحول میں، نقاب کے بغیر دیکھا تھا۔اُس کے چہرے پر نہ کسی ڈاکٹر کی سنجیدگی تھی، نہ پیرس والی سختی... صرف حیرت، نمی اور برسوں کے دبی ہوئی جذبات کی خاموش لرزش تھی۔

ادھر عنایہ کے ہاتھ لرزنے لگے۔

ٹرے میں رکھے گلاس ایک دوسرے سے ہلکے سے ٹکرائے۔

اُس کی آنکھیں بے اختیار پھیل گئیں۔

"ت... تم...؟"

یہ لفظ اُس کے لبوں سے بے اختیار نکل گیا۔

حمزہ کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی۔

وہ بمشکل مسکرایا۔

"ڈاکٹر... عنایہ"

یہ سنتے ہی عنایہ کے وجود میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

"یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے...؟"

حذیفہ نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

"ایک منٹ"

اُس نے پہلے عنایہ کی طرف دیکھا، پھر حمزہ کی طرف۔

"آپی... آپ دونوں... ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟"

گھر میں موجود سب لوگوں کی نظریں اب اُن دونوں پر جم چکی تھیں۔

چند لمحوں تک مکمل خاموشی رہی۔

پھر عنایہ نے بمشکل اپنی آواز سنبھالی۔

"یہ"

اُس نے حمزہ کی طرف دیکھا۔

"پیرس والے... حمزہ"

شاہینہ، روبینہ، اِن کے شوہر اور ریان ایک ساتھ چونک گئے۔

"کیا...؟"

روبینہ بے اختیار بول اٹھیں۔

"تم دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو؟"

عنایہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"جی امی!"

"یہ کئی مہینے پیرس میں میرے سامنے رہے"

"میں نے اِن کا علاج کیا"

وہ چند لمحے خاموش ہوئی۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

کسی کے پاس ایک لفظ بھی نہ تھا۔

حمزہ نے نظریں جھکا لیں۔

اُس کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ ٹوٹی ہوئی تھی۔

"اور... میں اُس وقت تک یہ بھی نہیں جانتا تھا"

وہ رکا۔

پھر شاہینہ اور روبینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا،

"کہ جسے میں صرف ڈاکٹر عنایہ سمجھتا رہا..."

"وہ میری اپنی خالہ کی بیٹی ہے۔..."

یہ سنتے ہی عنایہ کے ہاتھ سے پانی کی ٹرے چھوٹ گئی۔

شیشے کے گلاس فرش پر گر کر ٹوٹ گئے۔

آواز پورے گھر میں گونج اٹھی۔

مگر اُس آواز سے کہیں زیادہ زور سے ایک حقیقت نے سب کے دلوں کو ہلا دیا تھا۔

عنایہ کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

وہ حمزہ کو دیکھ رہی تھی۔

جیسے اُس کی پوری دنیا ایک ہی لمحے میں بدل گئی ہو۔

لب کانپ رہے تھے۔

بڑی مشکل سے اُس نے صرف ایک سوال کیا،

"تمہارا"

اُس کی آواز رندھ گئی۔

"تمہارا زخم... اب کیسا ہے؟..."

حمزہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آئی، مگر اُس مسکراہٹ میں خوشی نہیں، برسوں کا درد چھپا ہوا تھا۔

"جسم کا زخم"

اُس نے آہستہ سے اپنے پہلو پر ہاتھ رکھا، جہاں گولی کا نشان اب بھی موجود تھا۔

"اللہ کے حکم سے بھر رہا ہے..."

پھر اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

مگر دل کے کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں، ...

"جو انسان کے زندہ رہنے تک اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔..."

یہ سنتے ہی عنایہ کے آنسو تھم نہ سکے۔

اُسے پہلی بار احساس ہوا

کہ پیرس میں صرف وہی نہیں ٹوٹی تھی،

حمزہ بھی اندر سے مکمل بکھر چکا تھا۔

ایک ہفتے بعد

گھر میں آج مدتوں بعد خوشیوں نے باقاعدہ دستک دی تھی۔ چند ماہ پہلے یہی گھر مسلسل آزمائشوں، جدائیوں، غلط فہمیوں، جنازوں اور آنسوؤں کا گواہ تھا، مگر آج ہر طرف سکون کی خوشبو پھیلی ہوئی

تھی۔ صحن میں سفید چادریں بچھی تھیں، دیواروں پر ہلکی سی سجاوٹ تھی اور حمزہ کی تلاوتِ قرآن کی آواز ماحول کو نور بخش رہی تھی۔ اس گھر نے بہت سے دکھ دیکھے تھے، اس لیے آج کی ہر مسکراہٹ سب کے لیے اللہ کی ایک نعمت تھی۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے، تو انسان کی برسوں کی ویرانی کو چند لمحوں میں بہار میں بدل دیتا ہے۔

آج ریان کا نکاح تھا۔

نکاح نہایت سادگی سے مسجد میں ہوا۔ امام صاحب نے خطبۂ نکاح میں تقویٰ، حسنِ اخلاق، میاں بیوی کے حقوق اور اللہ سے تعلق مضبوط رکھنے کی تلقین کی۔ حمزہ پہلی صف میں خاموش بیٹھا ہر لفظ اپنے دل میں اتار رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اپنی پوری زندگی گھوم رہی تھی۔ ایک وقت تھا جب وہ شہرت، گناہوں اور دنیا کی چمک دمک میں گم ہو چکا تھا، اور آج اللہ نے اُسے اپنے چھوٹے بھائی کے نکاح میں بڑے بھائی کی حیثیت سے بٹھا دیا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں سجدۂ شکر ادا کیا۔

"قبول ہے؟"

امام صاحب کی آواز گونجی۔

ریان نے پُراعتماد لہجے میں تین مرتبہ "قبول ہے" کہا، اور مسجد "ماشاءاللہ" اور دعاؤں کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ حمزہ نے آگے بڑھ کر ریان کو گلے لگا لیا۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔

"مبارک ہو، میرے بھائی۔"

ریان نے مسکراتے ہوئے کہا،

"اگر آپ نہ ہوتے تو شاید آج یہ خوشی بھی ادھوری ہوتی۔"

حمزہ نے اُس کے ماتھے کو چوما۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

اسی دوران پیچھے سے ایک آواز آئی۔

"بس بس... اب دونوں بھائی اتنا بھی نہ روئیں کہ دلہن کو لگے نکاح نہیں، جدائی ہو گئی ہے"

یہ حذیفہ تھا۔

وہ حسبِ معمول ہنستا ہوا دونوں کے درمیان آگیا۔

ریان نے فوراً اُس کے کندھے پر ہلکا سا مکا مارا۔

"چپ کر... ہر وقت مذاق ہی سوجھتا رہتا ہے تجھے۔"

حذیفہ نے سینہ پھلا کر کہا،

بھئی! آج سے تم شادی شدہ آدمی ہو گئے ہو۔ اب میرے ساتھ کرکٹ کھیلنے کی اجازت بھی بیگم صاحبہ سے لینی پڑے گی۔

قریب کھڑے سب لوگ ہنس پڑے۔

نور منہاج نے دور سے یہ بات سنی تو مسکرا کر بولیں،

"پہلے آپ خود تو وقت پر گھر آیا کریں، پھر دوسروں کو مشورے دیجیے گا۔"

حذیفہ نے حیرت سے ادھر دیکھا۔

"اوہ ہو... بھابھی تو ابھی سے ریان بھائی کی وکیل بن گئی ہیں"

ریان نے ہنستے ہوئے کہا،

"دیکھ لینا... ایک دن تمہاری بھی باری آئے گی۔"

حذیفہ نے فوراً دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

"استغفر اللہ! ابھی تو مجھے ایک ہی عشق ہے"

سب نے تجسس سے پوچھا،

"کس سے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا،

"پاکستان سے"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"قسم ہے اس مٹی کی... اگر کبھی وطن نے پکارا تو اپنی جان دینے سے بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

چند لمحوں کے لیے سب خاموش ہو گئے۔

حمزہ نے آگے بڑھ کر حذیفہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

حذیفہ نے مسکرا کر جواب دیا،

"آمین... اور اگر کبھی شہادت نصیب ہو گئی تو سمجھوں گا اللہ نے میری زندگی قبول کر لی۔"

روبینہ نے فوراً اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسی باتیں مت کیا کرو، بیٹا۔"

حذیفہ نے ماں کے ہاتھ چوم لیے۔

"امی... موت تو ہر حال میں آنی ہے۔ دعا کریں جب آئے تو اللہ راضی ہو۔"

اُس کی بات سن کر حمزہ بے اختیار اُسے دیکھنے لگا۔ نہ جانے کیوں اُس کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی اتر آئی، جیسے تقدیر آنے والے وقت کی کوئی خاموش خبر اُس کے دل تک پہنچا رہی ہو۔

نکاح کے بعد عائشہ نور سے ملی اور اسے رخصت کیا، کوئی بھائی نہ ہونے کی وجہ سے حمزہ نے اس کے سر پر قرآن رکھ کر رخصت کیا۔

یونہی ریان اور نور کی محبت کا سفر اپنے اختتام تک پہنچا، مگر قسمت ابھی بھی کچھ اور چاہتی تھی۔

چند روز بعد،

گھر کے دروازے پر ایک سرکاری گاڑی آ کر رکی۔ حذیفہ با قاعدہ اپنی پہلی پوسٹنگ کے لیے کاکول روانہ ہونے والا تھا۔

حذیفہ ہاتھ میں ایک لفافہ لیے اندر داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر وہی پرجوش مسکراہٹ تھی، مگر آج اُس کی آنکھوں میں ایک الگ ہی چمک تھی۔

"امی"

وہ بلند آواز میں بولا۔

"آپ کا بیٹا جا رہا ہے۔"

روبینہ رونے لگ گئیں۔

حذیفہ نے لفافہ کھول کر سب کے سامنے رکھا۔

"پاکستان آرمی، میرا انتظار کر رہی ہے۔"

"لیفٹیننٹ کرنل حذیفہ اب یہی میری پہچان ہے۔"

ایک لمحے کے لیے پورا گھر خاموش ہو گیا، پھر ریان سب سے پہلے دوڑ کر آیا اور اُس نے حذیفہ کو زور سے گلے لگا لیا۔

"مجھے پتا تھا... تُو ضرور کامیاب ہو گا۔"

حمزہ بھی آگے بڑھا۔

اُس نے حذیفہ کے ماتھے کو چوما اور کہا،

وطن کی وردی ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ اللہ تمہیں ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے، اور تمہیں ایسا کردار عطا کرے کہ تمہاری زندگی بھی اسلام کے لیے باعثِ عزت ہو اور اگر موت آئے تو ایمان پر آئے۔

حذیفہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا،

"...بھائی... ایک سپاہی کی سب سے بڑی خواہش یہ نہیں ہوتی کہ وہ لمبی زندگی جیئے"

"بلکہ یہ ہوتی ہے کہ جب اللہ کے سامنے حاضر ہو تو اُس کا رب اُس سے راضی ہو۔..."

یہ کہتے ہوئے اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

کسی کو معلوم نہ تھا،

کہ چند ہی مہینوں بعد کیا ہونے والا ہے۔

ریان اور نور منہاج کے نکاح کو چند مہینے گزر چکے تھے۔گھر اب پہلے سے کہیں زیادہ پُر سکون محسوس ہوتا تھا۔ریان اپنی نئی زندگی میں مصروف تھا،جبکہ نور نے بھی بہت کم عرصے میں سب کا دل جیت لیا تھا۔دوسری طرف حذیفہ کی فوجی ڈیوٹی شروع ہو چکی تھی۔اگرچہ وہ اب گھر میں کم آتا تھا،مگر جب بھی آتا،پورے گھر میں رونق لوٹ آتی۔اُس کی ہنسی،اُس کے لطیفے اور ریان سے ہونے والی نوک جھونک ہر چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتی۔

حمزہ بھی اب پہلے والا حمزہ نہیں رہا تھا۔

شہرت، فلمیں، ایوارڈز اور دنیاوی چمک دمک اُس کی زندگی کا حصہ ضرور رہی تھیں، مگر اب اُس کے دل کا سکون کسی اور چیز میں تھا۔اُس نے اپنی بیشتر دولت خاموشی سے فلاحی کاموں کے لیے وقف کرنا شروع کر دی تھی۔کسی کو راشن پہنچا دینا،کسی مریض کے علاج کا خرچ اٹھا لینا، یتیم بچوں کی تعلیم کا بندوبست کرنا یا کسی بیوہ کے گھر کا کرایہ ادا کر دینا...وہ یہ سب ایسے کرتا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوتی۔
اُسے اب لوگوں کی تعریف نہیں، صرف اللہ کی رضا چاہیے تھی۔

انہی دنوں ایک چھوٹے سے یتیم خانے میں اُس کی ملاقات تقریباً سات سال کے ایک معصوم بچے سے ہوئی۔

بچے کا نام،

مِرہان جلال تھا۔

وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھا پرانی سی کتاب کے اوراق پلٹ رہا تھا۔ باقی بچے کھیل رہے تھے، مگر اُس کی آنکھوں میں عمر سے کہیں زیادہ خاموشی تھی۔

حمزہ اُس کے قریب جا بیٹھا۔

"بیٹا... تم کھیلتے کیوں نہیں؟"

میرہان نے آہستہ سے سر اٹھایا۔

"میرے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہیں۔"

حمزہ کے دل پر جیسے کسی نے خنجر رکھ دیا۔

"امی ابو...؟"

بچے نے خاموشی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میرے نانا تھے"

وہ بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ میں ان سے کٹی ہوں، ایک دن وہ سوئے ہوئے تھے، میں نے بہت جگایا نہیں اٹھیں، ماموں، ممانی نے مجھے بہت مارا پھر گھر سے نکال دیا۔

حمزہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اُسے اپنا ماضی یاد آ گیا۔

وہ بھی تو برسوں اپنے ہی لوگوں سے بچھڑا رہا تھا۔

وہ بھی محبت، گھر اور اپنائیت کے لیے ترستا رہا تھا۔

اُس نے مِرہان کے سر پر ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے کہا،

"آج سے تم اکیلے نہیں ہو۔"

اب سے مین روز تمھیں ملنے آؤں گا۔

حمزہ نے یتیم خانے کے منتظم سے ملاقات کی، اُس نے بچے کے نام ایک معقول رقم بطور امانت بینک میں جمع کروائی، اُس کی تعلیم، علاج، رہائش اور مستقبل کے تمام اخراجات کی رقم ادی کی۔

واپسی پر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اُس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

یااللہ... اگر میرے ماضی کے گناہوں کا کوئی کفارہ ہے تو مجھے لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے والا بنا دے۔

اُسی شام عنایہ شیخ زید اسپتال سے واپس آئی تو حسبِ معمول سب سے پہلے شاہینہ سے ملنے چلی گئی۔
ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ حمزہ صوفے پر بیٹھا تھا۔

عنایہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا،

"کیا بات ہے... آج تو بڑے مصروف لگ رہے ہیں؟"

حمزہ نے سر اٹھایا۔

"ایک بہت اہم کام تھا۔"

"ایسا کون سا؟"

حمزہ نے کاغذات اُس کی طرف بڑھا دیے۔

عنایہ نے پڑھنا شروع کیا۔

چند لمحوں بعد اُس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"تم نے... ایک یتیم بچے کی کفالت لے لی؟"

حمزہ نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔

کسی زمانے میں مجھے بھی اپنوں کی ضرورت تھی، عنایہ... شاید اسی لیے اللہ نے میرے دل میں یہ احساس ڈال دیا۔

عنایہ نے دل ہی دل میں دعا کی۔

"اللہ تم سے راضی ہو جائے، حمزہ۔"

حمزہ ہلکا سا مسکرایا۔

"آمین... مجھے بھی بس یہی چاہیے۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عنایہ نے اچانک شرارتی انداز میں کہا،

"ویسے ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"ہیلمٹ والے مریض"

حمزہ بے اختیار ہنس پڑا۔

"ڈاکٹر صاحبہ... آپ نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا؟"

عنایہ نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا،

"چھوڑ دوں؟"

"کیوں؟"

"اب تو آپ مریض نہیں رہے۔"

حمزہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،

"لیکن دل کا مریض تو اب بھی ہوں۔"

عنایہ فوراً نظریں جھکا گئی۔

"ڈاکٹر ہونے کے باوجود"

وہ آہستہ سے بولی،

"اس بیماری کا علاج میرے پاس بھی نہیں۔."

حمزہ چند لمحے خاموش رہا، پھر ہلکی سی شرارت سے بولا،

"پھر آپ نے اتنے سال ضائع کیوں کیے؟"

عنایہ نے بھنویں چڑھائیں۔

"میں نے؟"

"جی ہاں۔"

"کیسے؟"

"پیرس میں میرا اصل نام پوچھنے کے بجائے ہمیشہ 'ہیلمٹ والا مریض' کہتی رہیں۔"

عنایہ ہنس پڑی۔

"کیونکہ آپ نے کبھی سیدھا جواب دیا ہی نہیں۔"

"اور اب؟"

عنایہ نے پہلی بار اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا،

"اب نام بھی معلوم ہے"

وہ رکی۔

"اور حقیقت بھی۔..."

حمزہ کے چہرے کی مسکراہٹ دھیرے دھیرے سنجیدگی میں بدل گئی۔

"اللہ نے عجیب فیصلے کیے ہیں،۔"

"ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی تھے"

"اور اپنے رشتے سے بے خبر بھی تھے۔..."

عنایہ نے آہستہ سے کہا،

"شاید بعض رشتے انسان نہیں"

"اللہ خود مناسب وقت پر ظاہر کرتا ہے۔..."

دونوں خاموش ہو گئے۔

دور سے شاہینہ، روبینہ، ریان اور نور یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

روبینہ نے دھیرے سے مسکرا کر شاہینہ سے کہا،

"باجی... اب لگتا ہے اس گھر میں ایک اور نکاح کی خوشیاں آنے والی ہیں۔"

شاہینہ نے نظریں جھکا کر "الحمدللہ" کہا۔

"میں نے برسوں پہلے اپنے بیٹے کو کھو دیا تھا"

"آج اللہ صرف اُسے واپس نہیں لایا..."

"بلکہ اُس کی زندگی کی خوشیاں بھی واپس لے آیا ہے۔..."

ریان نے مسکراتے ہوئے حمزہ کی طرف دیکھا۔

"...امی"

"اگر اجازت ہو"

"تو اب اگلی تیاری حمزہ بھائی کے نکاح کی شروع کر دینی چاہیے۔"

یہ سنتے ہی سب ہنس پڑے۔

عنایہ نے شرمندگی سے فوراً اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپالیا۔

اور حمزہ،

وہ کئی برسوں بعد دل سے مسکرایا تھا۔

ایک دن رات اپنی خاموش چادر آہستہ آہستہ زمین پر بچھا رہی تھی۔ گھر کی چھت پر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دور آسمان پر چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا، جبکہ ستارے خاموشی سے اُس کے گرد جگمگا رہے تھے۔ عنایہ ہاتھ میں تسبیح لیے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے زیرِ لب استغفار پڑھ رہی تھی۔ اُس کی عادت تھی کہ جب بھی دل کسی الجھن یا کسی خوشی سے بھر جاتا، وہ سب سے پہلے اپنے رب سے بات کرتی۔

پیچھے سے آہستہ آہستہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔

عنایہ نے پلٹ کر دیکھا۔

حمزہ چند قدم کے فاصلے پر رکا ہوا تھا۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ نہ پہلے کی طرح بے تکلف تھا اور نہ ہی اُس نے قریب آنے کی کوشش کی۔ اب وہ جان چکا تھا کہ ایک نامحرم کے درمیان حدود کتنی ضروری ہوتی ہیں، چاہے دل میں کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔

صرف ٹھنڈی ہوا بول رہی تھی۔

آخرکار حمزہ نے دھیرے سے کہا،

"میں... آپ سے ایک اجازت مانگنے آیا ہوں۔"

عنایہ کا دل بے اختیار تیز دھڑکنے لگا۔

"اجازت...؟"

حمزہ نے گہری سانس لی۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کھویا ہے... بہت سی غلطیاں کیں... اور اُن غلطیوں کی سزا بھی دنیا میں ہی دیکھ لی۔ میں نے غرور دیکھا، شہرت دیکھی، تنہائی دیکھی، نفرت دیکھی، اور پھر اللہ کی رحمت بھی دیکھی۔ اگر میرا رب مجھے واپس اپنی طرف نہ بلاتا تو شاید آج میں زندہ بھی نہ ہوتا۔

وہ چند لمحے خاموش ہوا، پھر نہایت احترام سے بولا،

آج میں آپ کے سامنے محبت کا اظہار کرنے نہیں آیا... کیونکہ میرے دل کی کیفیت میرا رب پہلے ہی جانتا ہے۔ میں صرف یہ جاننے آیا ہوں کہ اگر میں کل امی اور خالہ سے تمہارا رشتہ مانگوں... تو کیا آپ کی رضا اس میں شامل ہوگی؟

عنایہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

یہ وہ سوال تھا جس کا جواب وہ اپنے دل میں مدتوں پہلے دے چکی تھی۔

اُس نے نظریں جھکائے ہوئے آہستہ سے کہا،

میں نے ہمیشہ اپنے رب سے یہی دعا کی تھی کہ اگر میری قسمت میں تم ہو... تو وہ تمہیں میرے لیے حلال طریقے سے لکھ دے۔

وہ چند لمحے رکی۔

پھر دھیمی آواز میں بولی،

اگر تم اللہ کی رضا کے لیے میرا ہاتھ مانگنے آؤ گے... تو میری رضا بھی وہی ہو گی جس میں اللہ کی رضا ہو۔

حمزہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

اُس نے فوراً آسمان کی طرف دیکھا اور زیرِ لب صرف ایک لفظ کہا،

"الحمدللہ"

پھر اُس نے عنایہ کی طرف دیکھے بغیر کہا،

"ایک بات اور"

عنایہ خاموش رہی۔

حمزہ کی آواز میں ہلکی سی مسکراہٹ گھل گئی۔

"آپ کو شاید کبھی معلوم نہ ہو"

مگر پیرس میں جب پہلی بار آپ نے مجھے سختی سے ڈانٹا تھا، اُس دن سے میں نے دل ہی دل میں، آپ ایک نام رکھ لیا تھا۔

عنایہ نے حیرت سے پوچھا،

"کیا نام؟"

حمزہ چند لمحے خاموش رہا، پھر مسکرا کر بولا،

"وہ نام"

"میں نکاح کے بعد بتاؤں گا۔..."

عنایہ بے اختیار مسکرا دی۔

"اچھا... تو اب راز بھی رکھنے لگے ہیں؟"

حمزہ نے دھیرے سے جواب دیا،

"کچھ راز... صحیح وقت پر ہی خوبصورت لگتے ہیں۔"

چند لمحوں کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔

یہ خاموشی عجیب تھی،

اس میں نہ بے چینی تھی، نہ اضطراب۔

اس میں ایک حلال مستقبل کی امید تھی۔

حمزہ نے آہستہ سے کہا،

"میں کل امی سے بات کروں گا۔"

عنایہ نے سر جھکا کر صرف اتنا کہا،

"اللہ بہتر فیصلہ فرمائے۔"

حمزہ نے دل ہی دل میں دعا کی،

یا اللہ! جس محبت کو میں نے تیری رضا کے لیے روکا، آج اگر وہ میرے حق میں بہتر ہے تو اُسے میرے نصیب میں لکھ دے، اور اگر نہیں... تو میرے دل کو اپنے فیصلے پر راضی کر دے۔

دونوں الگ الگ سمتوں میں چل پڑے۔

اُن کے درمیان ابھی بھی فاصلہ تھا،

مگر اب وہ فاصلہ جدائی کا نہیں، حلال رشتے تک پہنچنے والے صبر کا تھا۔

اگلی شام گھر کے ڈرائنگ روم میں ایک عجیب سی سنجیدگی تھی۔ روز کی طرح ہنسی مذاق ضرور ہو رہا تھا، مگر آج ماحول میں کسی ان کہی بات کا احساس بھی شامل تھا۔ شاہینہ صوفے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں، روبینہ اُن کے ساتھ چائے پی رہی تھیں، خالو اخبار ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے، جبکہ ریان اور نور منہاج سامنے بیٹھے کسی بات پر آہستہ آہستہ مسکرا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور حذیفہ بھی اپنی مختصر چھٹی گزارنے گھر آ پہنچا۔

"السلام علیکم!"

اُس کی آواز سنتے ہی پورا گھر خوشی سے کھل اٹھا۔

روبینہ فوراً اُٹھ کر اُس کے پاس گئیں۔

"میرا بیٹا آ گیا!"

حذیفہ نے جھک کر ماں کے ہاتھ چومے، پھر ایک ایک کر کے سب سے ملا۔ آخر میں اُس کی نظر حمزہ پر پڑی۔

"اوہو... ہمارے ہیرو صاحب"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے اب فلموں کے ہیرو نہیں... گھر کے ہیرو بننے کا ارادہ ہے۔"

ریان زور سے ہنس پڑا۔

"اسے چھوڑ، وردی پہن کر آیا ہے، دو دن میں خود کو بریگیڈیئر سمجھنے لگ گیا۔"

"لیفٹیننٹ ہوں جناب!"

حذیفہ نے فوراً جواب دیا۔

"اور یاد رکھیں... فوجی کبھی اپنی تعریف خود نہیں کرتا"

چند لمحے خاموش رہا، پھر سینہ چوڑا کرتے ہوئے بولا،

"لوگ خود کرتے ہیں..."

پورا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

حمزہ بھی برسوں بعد بے ساختہ ہنس دیا۔

اسی دوران عنایہ چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی۔ اُس نے سب کے سامنے کپ رکھے، مگر ہمیشہ کی طرح حمزہ کی طرف براہِ راست دیکھنے سے گریز کیا۔ حمزہ نے بھی نظریں جھکائے ہوئے صرف ایک مختصر سا "جزاکِ اللہ خیراً" کہا۔

یہ چھوٹا سا جملہ شاہینہ سے چھپا نہ رہ سکا۔

اُنہوں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

یہ وہی حمزہ تھا جو کبھی ہر بات میں بے تکلف تھا، اور آج اللہ کے خوف میں اپنی نگاہوں کی بھی حفاظت کر رہا تھا۔

چائے ختم ہوئی تو حمزہ نے گہری سانس لی۔

اُس کے دل کی دھڑکن معمول سے کہیں زیادہ تیز تھی۔

وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اُٹھا۔

"امی"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

شاہینہ نے محبت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"جی بیٹا؟"

حمزہ نے ایک لمحے کے لیے نظریں جھکا لیں۔

پھر نہایت ادب سے بولا،

"آج میں آپ سے... ایک چیز مانگنے آیا ہوں۔"

روبینہ نے مسکراتے ہوئے شاہینہ کی طرف دیکھا۔

شاید دونوں مائیں پہلے ہی سمجھ چکی تھیں کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

شاہینہ نے نرم لہجے میں کہا،

"بیٹا... ماں کے پاس اگر دینے کے لیے کچھ ہو تو وہ کبھی اپنے بچے کو انکار نہیں کرتی۔"

حمزہ کی آواز بھرّا گئی۔

"امی"

"اگر آپ اور خالو مناسب سمجھیں..."

"تو میں عنایہ کا ہاتھ اپنے لیے مانگنا چاہتا ہوں۔..."

الفاظ ختم ہوتے ہی کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

عنایہ کے ہاتھ میں پکڑا چائے کا خالی کپ ہلکا سا کانپ گیا۔

اُس نے فوراً نظریں مزید جھکا لیں۔

ریان نے ایک نظر عنایہ کو دیکھا، پھر حمزہ کو۔

اُس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے اُسے مدتوں سے اسی لمحے کا انتظار ہو۔

روبینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

خالو نے گہری سانس لی۔

پھر اپنی نشست سے اُٹھ کر حمزہ کے قریب آئے۔

اُنہوں نے دونوں ہاتھوں سے حمزہ کے کندھے تھام لیے۔

"بیٹا"

"اگر میں اپنی بیٹی کسی کے حوالے کروں"

"تو اُس شخص سے بہتر مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔..."

حمزہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"لیکن"

خالو کی بات سن کر سب دوبارہ خاموش ہو گئے۔

"ایک شرط ہے۔"

حذیفہ فوراً بول پڑا،

"ابو! کہیں جہیز کی لسٹ تو نہیں نکالنے لگے؟"

پورا کمرہ ہنس پڑا۔

خالو نے مصنوعی غصے سے اُسے گھورا۔

"خاموش بیٹھ جا، فوجی"

حذیفہ فوراً دونوں ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔

"جی ابو"

سب دوبارہ مسکرا دیے۔

خالو نے پھر حمزہ کی طرف دیکھا۔

"شرط صرف اتنی ہے"

"میری بیٹی کو کبھی اللہ سے دور نہ ہونے دینا۔۔۔"

حمزہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

اُس نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے جواب دیا،

"میں وعدہ کرتا ہوں"

"اگر کبھی میری وجہ سے عنایہ کے دین، حیا یا ایمان کو نقصان پہنچا..."

"توسب سے پہلے اللہ کے سامنے میں خود کو مجرم سمجھوں گا۔..."

روبینہ بے اختیار رونے لگیں۔

شاہینہ نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا،

"یا اللہ! جس بیٹے کو ایک دن میں نے کھو دیا تھا"

"آج اُسی کے لیے ایک نیک اور باحیا بیٹی عطا فرما رہا ہے۔..."

اتنے میں حذیفہ نے خاموشی توڑی۔

وہ حمزہ کے پاس آیا، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور شرارتی انداز میں بولا،

"ویسے ایک بات ہے"

حمزہ نے حیرت سے دیکھا۔

"اب مجھے آپ کو 'ہیلمٹ والے مریض' نہیں کہنا پڑے گا"

"اب تو کہنا پڑے گا..."

"میرے ہیلمٹ والے بہنوئی صاحب"

کمرے میں ایک بار پھر قہقہے گونج اٹھے۔

عنایہ نے شرم سے فوراً اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا۔

اور حمزہ،

اُس نے کئی برسوں بعد محسوس کیا،

کہ اللہ جب کسی ٹوٹے ہوئے انسان کو جوڑتا ہے،

تو صرف اُس کا دل نہیں،

اُس کی پوری زندگی بدل دیتا ہے۔

اسی رات دونوں خاندانوں نے باہمی مشورے سے ایک فیصلہ کیا۔

حمزہ اور عنایہ کا نکاح،

مسجدِ نبوی ﷺ میں ہو گا، کیونکہ عنایہ کی یہی سب سے بڑی خواہش تھی۔

یہ خبر سنتے ہی سب کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

یہ الفاظ ابھی فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ پورے کمرے میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ریان نے فوراً اٹھ کر حمزہ کو گلے لگالیا، جبکہ نور منہاج نے مسکراتے ہوئے عنایہ کا ہاتھ تھام لیا۔ عنایہ شرم سے نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ حمزہ کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ کبھی اُسے یقین بھی نہیں تھا کہ جس زندگی کا آغاز گناہوں سے ہوا تھا، اُس کی نئی شروعات اللہ کے محبوب ﷺ کے شہر سے لکھی جائے گی۔

چند لمحوں بعد خالو نے مسکراتے ہوئے کہا، تو پھر فیصلہ یہی رہا۔ آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد، مسجدِ نبوی ﷺ میں نکاح ہو گا۔ ہم اگلے چند دنوں میں تمام سفری انتظامات شروع کر دیتے ہیں۔

حمزہ نے دھیرے سے سر اٹھایا۔

"ایک گزارش ہے"

سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس سفر کے تمام اخراجات میری طرف سے ہوں گے۔ یہ میری خواہش نہیں... میرے رب کا شکر ادا کرنے کا ایک چھوٹا سا ذریعہ ہے۔

خالو نے کچھ کہنا چاہا مگر حمزہ نے ادب سے بات مکمل کی۔

"پلیز مجھے اس سعادت سے محروم نہ کریں۔"

شاہینہ نے مسکراتے ہوئے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے برسوں پہلے بچھڑا ہوا اُس کا بیٹا صرف واپس نہیں آیا، بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت دل لے کر لوٹا ہے۔

اُسی رات حذیفہ کو یونٹ ہیڈ کوارٹر سے کال موصول ہوئی۔ اُس کی چھٹی ختم کر دی گئی تھی۔ اُسے اگلی صبح ہی واپس رپورٹ کرنا تھا۔ خبر سنتے ہی گھر کا ماحول چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا، مگر حذیفہ حسبِ عادت مسکرا دیا۔

"فوجی کی چھٹیاں ہمیشہ چھوٹی ہی ہوتی ہیں۔"

اگلی صبح فجر کی نماز کے بعد پورا گھر اُسے رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آیا۔ روبینہ بار بار اُس کے کپڑے درست کر رہی تھیں، جیسے وہ ابھی بھی اُن کا ننھا سا بیٹا ہو۔ شاہینہ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی، نور منہاج نے کامیابی کے لیے دعا کی، جبکہ عنایہ نے خاموشی سے کہا،

"اپنا خیال رکھنا، حذیفہ۔"

وہ ہنس پڑا۔

آپی، میں واپس آکر آپ کے ہونے والے مریض... میرا مطلب بہنوئی کو خود پریشان کروں گا۔

سب ہنس دیے۔

ریان اُسے گاڑی تک چھوڑنے آیا۔

دونوں بھائی چند لمحے خاموش کھڑے رہے۔

پھر ریان نے اُسے مضبوطی سے گلے لگالیا۔

"جلدی واپس آنا۔"

حذیفہ نے بھی اُسے سینے سے لگالیا۔

"ان شاءاللہ"

پھر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا،

"اور ہاں... میری غیر موجودگی میں باباکا خوب خیال رکھنا۔ یہ باہر سے مضبوط لگتے ہیں، مگر دل سے بہت نرم ہیں۔"

ریان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اور تُو اپنا خیال رکھنا، پاگل۔"

حذیفہ نے ہنستے ہوئے سلام کیا، گاڑی میں بیٹھا اور آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ شاید دونوں بھائیوں کی آخری ملاقات تھی۔

چند دن بعد ایک صبح حمزہ نے عنایہ سے کہا،

"اگر آج آپ کی ڈیوٹی جلدی ختم ہو جائے... تو میں آپ کو ایک جگہ لے جانا چاہتا ہوں۔"

عنایہ نے حیرت سے پوچھا،

"کہاں؟"

حمزہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،

"ایک ایسے بچے سے ملوانے... جس نے مجھے سکھایا کہ یتیمی صرف ماں باپ کے نہ ہونے کا نام نہیں، بلکہ محبت کے بغیر زندگی گزارنے کا نام ہے۔"

دوپہر کے بعد دونوں شہر کے ایک یتیم خانے کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے بھر گاڑی میں عجیب سی خاموشی رہی۔ یہ وہ خاموشی نہیں تھی جس میں اجنبیت ہو، بلکہ وہ خاموشی تھی جس میں دو دل ایک دوسرے کی موجودگی سے مطمئن ہوں۔

کچھ دیر بعد حمزہ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"جانتی ہو... زندگی کی سب سے خوبصورت بات کیا ہے؟"

عنایہ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا،

"کیا؟"

"یہ کہ انسان کو ایسا ہمسفر مل جائے"

وہ چند لمحے رکا۔

"جو اُسے جنت کا راستہ یاد دلاتی رہے، دنیا کا نہیں۔..."

عنایہ کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

"اور زندگی کی سب سے بڑی نعمت جانتے ہو کیا ہے؟"

حمزہ نے پہلی بار اُس کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔"

عنایہ نے آہستہ سے جواب دیا:

"جب شوہر بیوی کو اللہ کے قریب لے جائے... اور بیوی شوہر کو۔ پھر دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں پکڑتا... بلکہ دونوں ایک ساتھ اللہ کی رسی تھام لیتے ہیں۔"

حمزہ نے خاموشی سے "الحمد للہ" کہا۔

اُسے محسوس ہوا

شاید محبت کا سب سے خوبصورت اظہار "میں تم سے محبت کرتا ہوں" نہیں

بلکہ یہ ہے کہ، "میں تمہیں جنت میں بھی اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اسی احساس کے ساتھ اُن کی گاڑی یتیم خانے کے دروازے کے سامنے جا کر رک گئی، جہاں مِرہان جلال اپنے معمول کے مطابق اُن کا انتظار نہیں، بلکہ اپنی نئی زندگی کی امید کا انتظار کر رہا تھا۔

یتیم خانے کے مرکزی دروازے پر گاڑی رکتے ہی ایک عجیب خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ سامنے ایک سادہ سی عمارت تھی، جس کی دیواروں پر وقت کے نشان صاف دکھائی دیتے تھے، مگر اُس کے صحن میں کھیلتے بچوں کی ہنسی ہر کمی کو چھپا رہی تھی۔ عنایہ نے اُن معصوم چہروں کو دیکھا تو بے اختیار اُس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

حمزہ نے دھیرے سے کہا، "جانتی ہو، انسان جب پہلی بار کسی یتیم خانے میں آتا ہے تو اُسے لگتا ہے کہ یہاں رہنے والے بچے محبت کے محتاج ہوں گے... لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ بچے محبت کو سب سے زیادہ سمجھتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اُس کی کمی محسوس کی ہوتی ہے۔"

عنایہ نے خاموشی سے اُس کی بات سنی۔ پھر آہستہ سے بولی، "اور شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے کو اتنی بڑی نیکی قرار دیا ہے... کیونکہ وہاں صرف ایک بچے کا دل نہیں، ایک ٹوٹی ہوئی دنیا جڑتی ہے۔"

حمزہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں اندر داخل ہوئے تو یتیم خانے کے منتظم نے مسکراتے ہوئے اُن کا استقبال کیا۔

"السلام علیکم، حمزہ صاحب۔"

"وعلیکم السلام۔"

آج بھی مِرہان صبح سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ جیسے ہی اُسے پتا چلتا ہے کہ آپ آنے والے ہیں، اُس کی خوشی دیکھنے والی ہوتی ہے۔

حمزہ کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ آ گئی۔

"وہ کہاں ہے؟"

"لائبریری میں بیٹھا پڑھ رہا ہے۔"

چند لمحوں بعد ایک دبلا پتلا، مگر روشن چہرے والا بچہ کتاب سینے سے لگائے دوڑتا ہوا اُن کی طرف آیا۔

"السلام علیکم، حمزہ بھائی"

"وعلیکم السلام، میرے شیر"

حمزہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ مِرہان نے آکر اُسے گلے لگالیا۔ پھر اُس نے ادب سے عنایہ کی طرف دیکھا۔

"السلام علیکم، آپ ڈاکٹر آپی ہیں نا؟"

عنایہ مسکرادیں۔

"وعلیکم السلام، جی۔"

مِرہان نے شرماتے ہوئے سلام کیا اور دوبارہ حمزہ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

یتیم خانے کے منتظم نے ایک فائل حمزہ کی طرف بڑھائی۔

"یہ مِرہان کی تازہ میڈیکل رپورٹس ہیں۔"

حمزہ نے فائل کھولی، مگر اُس نے فوراً وہ عنایہ کی طرف بڑھادی۔

"آپ دیکھ لیں۔"

عنایہ نے رپورٹ بغور پڑھی۔ چند لمحوں بعد اُس کے چہرے کی مسکراہٹ مدھم پڑ گئی۔

اُس نے آہستہ سے فائل بند کی۔

مِرہان کو "تھیلیسیمیا میجر" ہے۔

چند لمحوں کے لیے فضا خاموش ہو گئی۔

منتظم نے دھیرے سے کہا،

"جی ڈاکٹر صاحبہ... بچپن سے۔ ہر چند ہفتوں بعد خون لگتا ہے، دوائیاں بھی مسلسل چلتی ہیں۔" اخراجات کافی زیادہ ہیں، مگر الحمدللہ جب سے حمزہ صاحب نے اس کی کفالت لی ہے، آج تک کسی علاج میں رکاوٹ نہیں آئی۔

عنایہ کی نظریں بے اختیار حمزہ کی طرف اٹھ گئیں۔

حمزہ نے جیسے اس بات کو معمولی سمجھتے ہوئے کہا،

"بچے کی دوا پیسوں کی وجہ سے کبھی نہیں رکنی چاہیے۔"

منتظم نے احترام سے کہا،

صرف دوا ہی نہیں، اس کی اسکول فیس، کتابیں، کپڑے، علاج، خون کی منتقلی، ہر چیز کی ذمہ داری بھی حمزہ صاحب نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ کئی بار تو خود اسپتال آ کر ڈاکٹروں سے بات کرتے ہیں کہ علاج میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

عنایہ کے دل میں عجیب سی کیفیت پیدا ہوئی۔

اُسے اچانک پیرس کا وہ حمزہ یاد آیا جو دنیا کی چمک دمک میں کھویا ہوا تھا... اور پھر سامنے کھڑا ایسا انسان، جو خاموشی سے ایک یتیم بچے کی زندگی سنوارنے میں لگا ہوا تھا، بغیر کسی تصویر، بغیر کسی شہرت اور بغیر کسی تعریف کے۔

مِرہان نے معصومیت سے حمزہ کی آستین پکڑ لی۔

"حمزہ بھائی"

"جی؟"

"میں جلدی بڑا ہو جاؤں گا نا؟"

حمزہ نے مسکرا کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"ان شاء اللہ۔"

"پھر میں بھی بہت محنت کروں گا"

"اور آپ کی طرح کسی اور یتیم بچے کی مدد کروں گا۔..."

یہ سنتے ہی حمزہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اُس نے مِرہان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا،

"بس یہی وعدہ کبھی مت بھولنا۔ نیکی وہی خوبصورت ہوتی ہے جو آگے منتقل ہو جائے۔"

عنایہ خاموشی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔

اُسے پہلی بار شدت سے محسوس ہوا کہ بعض لوگ محبت کا اظہار الفاظ سے نہیں کرتے،

وہ کسی اجنبی کے آنسو پونچھ کر، کسی یتیم کے علاج کا خرچ اٹھا کر، اور کسی بے سہارا کی امید بن کر محبت کو زندہ رکھتے ہیں۔

واپسی کے لیے نکلتے ہوئے عنایہ نے آہستہ سے پوچھا،

"آپ نے کبھی کسی کو یہ سب بتایا کیوں نہیں؟"

حمزہ نے چلتے چلتے مسکرا کر جواب دیا،

"جس نیکی کو لوگوں کی تعریف کی ضرورت پڑ جائے... وہ نیکی نہیں، سودا بن جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں، اگر میرے رب کو میری یہ کوشش قبول ہو جائے... تو یہی میرے لیے کافی ہے۔"

اُسی رات سب کے اپنے اپنے کمروں میں چلے جانے کے بعد حمزہ خاموشی سے اپنی بالکونی میں آ گیا۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا اُس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ اُس نے موبائل نکالا اور چند لمحے خاموشی سے اسکرین کو دیکھتا رہا، پھر پیرس میں موجود گرینی کا نمبر ملا دیا۔

چند ہی لمحوں بعد دوسری طرف سے گرینی کی مانوس آواز سنائی دی۔

"ہیلو... میرے بچے"

حمزہ کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

"کیسی ہیں آپ، گرینی؟"

"اب تمہاری آواز سن لی ہے... اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

حمزہ چند لمحے خاموش رہا، جیسے الفاظ ترتیب دے رہا ہو۔

پھر دھیرے سے بولا،

"گرینی... آج میں آپ کو ایک خوشخبری دینا چاہتا ہوں۔"

"کیسی خوشخبری؟"

حمزہ کی آواز میں خوشی نمایاں تھی۔

"آج گھر والوں نے میرا اور عنایہ کا نکاح طے کر دیا ہے"

"وہی عنایہ جسے میں چاہتا تھا۔"

"اور اگر اللہ نے چاہا تو آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد ہمارا نکاح مسجدِ نبوی ﷺ میں ہو گا۔..."

چند لمحوں تک دوسری طرف مکمل خاموشی رہی۔

پھر گرینی کی سسکی سنائی دی۔

"آخر کار"

"میرے بچے کو اُس کی منزل مل گئی۔..."

حمزہ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

"یہ سب اللہ کا کرم ہے، گرینی۔"

گرینی نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا،

"مجھے تم پر فخر ہے، حمزہ۔ میں نے تمہیں دنیا کے پیچھے بھاگتے بھی دیکھا ہے اور آج اپنے رب کی طرف پلٹتے بھی دیکھ رہی ہوں۔"

حمزہ آہستہ سے مسکرایا۔

"اسی لیے تو آپ کو فون کیا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں"

"آپ میرے نکاح میں ضرور آئیں۔..."

"میں نہیں چاہتا کہ میری زندگی کے سب سے خوبصورت دن پر آپ میرے ساتھ نہ ہوں۔"

گرینی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا،

"میں ضرور آؤں گی، میرے بچے... چاہے دنیا کے کسی بھی کونے سے آنا پڑے۔"

حمزہ نے فوراً کہا،

"اور ایک بات"

بابا کی قبر پر اگلی بار جب آپ جائیں تو انہیں بتایئے گا ہم سب بہت جلد ان سے ملنے آئیں گے۔

گرینی رو پڑی۔

گرینی سے بات ختم ہونے کے بعد حمزہ کچھ دیر بالکونی میں خاموش کھڑا رہا۔ رات پہلے سے زیادہ گہری ہو چکی تھی۔ آسمان پر بکھرے ستاروں کو دیکھ کر اُس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ اُس نے دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا، پھر موبائل کی اسکرین پر ایک اور نمبر کھولا۔

"Fang"

کال چند ہی لمحوں میں وصول ہو گئی۔

"حمزہ اسفند"

دوسری طرف سے ہمیشہ کی طرح پُر اعتماد آواز سنائی دی۔

"اتنی رات گئے فون؟ سب خیریت تو ہے؟"

حمزہ ہلکا سا ہنسا۔

"آج اگر فون نہ کرتا تو شاید تم مجھ سے ناراض ہو جاتے۔"

فینگ نے مذاقاً کہا،

"کہیں دوبارہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے؟"

حمزہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،

"نہیں... اس بار اللہ نے مصیبت نہیں، رحمت بھیجی ہے۔"

فینگ چند لمحے خاموش رہا۔

"مطلب؟"

حمزہ نے آہستہ سے کہا،

"میرا نکاح طے ہو گیا ہے، اور وہ ب ڈان سے"

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔

پھر اچانک فینگ زور سے ہنس پڑا۔

"آخر کار"

"آخر وہ دن آہی گیا جس کا مجھے انتظار تھا۔..."

حمزہ بھی مسکرادیا۔

"اگر تم سامنے ہوتے تو شاید سب سے پہلے تمہیں گلے لگاتا۔"

فینگ نے محبت بھرے لہجے میں کہا،

"اور اگر میں سامنے ہوتا تو شاید تمہیں یقین دلاتا کہ یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔"

حمزہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

یاد ہے، فینگ... ایک وقت ایسا بھی تھا جب پوری دنیا میرے ساتھ تھی، مگر میں اندر سے بالکل خالی تھا۔

"اور آج"

"میرے پاس زیادہ کچھ نہیں، مگر دل میں سکون ہے۔..."

فینگ نے دھیرے سے جواب دیا،

"کیونکہ پہلے تمہارے پاس دنیا تھی"

"آج تمہارے پاس اللہ ہے۔..."

حمزہ خاموش ہو گیا۔

یہ ایک جملہ اُس کے دل میں اتر گیا۔

چند لمحوں بعد اُس نے کہا،

"ایک ماہ بعد ہمارا نکاح مسجدِ نبوی ﷺ میں ہو گا۔"

"میں چاہتا ہوں"

"تم وہاں ضرور آؤ۔..."

فینگ نے بنا کسی توقف کے جواب دیا،

"حمزہ"

"میں صرف تمہارا وکیل نہیں ہوں"

"میں تمہارا دوست ہوں۔..."

"اور دوست خوشیوں میں دعوت کے منتظر نہیں ہوتے۔"

"میں ضرور آؤں گا۔"

حمزہ نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا،

"اس بار مقدمے کی فائلیں ساتھ مت لے آنا۔"

فینگ بھی ہنس پڑا۔

"فکر نہ کرو"

اس بار صرف ایک سوٹ لے کر آؤں گا، اور تمہارے نکاح میں سب سے زیادہ شور بھی میں ہی مچاؤں گا۔

"اور ہاں"

"اپنی ہونے والی بھابھی سے بھی ملنا ہے۔..."

حمزہ نے شرارت سے کہا،

"پہلے اجازت لے لینا، ڈاکٹر صاحبہ کسی کو آسانی سے نہیں ملتیں۔"

دونوں چند لمحوں تک بے اختیار ہنستے رہے۔

یہ ہنسی اُن دونوں کے درمیان گزرے بے شمار مشکل دنوں کی گواہ تھی۔

آخر میں فینگ کی آواز سنجیدہ ہو گئی۔

"حمزہ"

"مجھے تم پر فخر ہے۔"

"تم نے دولت کمائی، شہرت کمائی، پھر سب کچھ کھو دیا"

"مگر آخرکار اپنے رب کو پالیا۔..."

"اور یقین کرو"

"یہی تمہاری زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔..."

حمزہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔

"اللہ نے مجھے دوسرا موقع دیا ہے، فینگ"

"اب بس دعا کرو، آخری سانس تک اُس پر قائم رہوں۔..."

"ان شاء اللہ۔"

فینگ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"ہم مدینہ میں ملیں گے، میرے دوست۔"

کال ختم ہوئی تو حمزہ دیر تک موبائل ہاتھ میں لیے خاموش کھڑا رہا۔ اُس کے چہرے پر ایک اطمینان تھا۔

اُسے کیا معلوم تھا

کہ اُس کا دوست واقعی اُس سے مدینہ میں ملے گا،

مگر اُس ملاقات کے بعد تقدیر اُن سب کے لیے ایک ایسا باب لکھ چکی تھی، جسے کوئی انسان بدل نہیں سکتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دس دن گزر گئے۔

ان دس دنوں میں زندگی معمول کے مطابق چلتی رہی، مگر ہر گزرتا دن سب کو اُس مبارک سفر کے ایک قدم اور قریب لے آتا تھا۔ مدینہ منورہ کے ٹکٹ بک ہو چکے تھے، ویزے بھی آ چکے تھے، پاسپورٹ ترتیب سے ایک فائل میں رکھ دیے گئے تھے۔ گھر میں کبھی نکاح کی تیاریوں کی بات ہوتی، کبھی عمرے کی، تو کبھی اس بات پر گفتگو ہوتی کہ مسجدِ نبوی ﷺ میں پہلی نماز کون سی صف میں ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔ عنایہ اور روبینہ سادگی کے ساتھ نکاح کی ضروری چیزوں کی فہرست بنا

رہی تھیں، جبکہ شاہینہ ہر نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر ایک ہی دعا مانگتی تھیں کہ اللہ یہ سفر خیریت سے مکمل کروادے۔

حمزہ حسبِ معمول اپنے فلاحی کاموں میں بھی مصروف تھا۔ وہ ہر دوسرے یا تیسرے دن میرہان جلال کی خیریت معلوم کرتا، اُس کی تھیلیسیمیا کی اگلی خون کی منتقلی کی تاریخ نوٹ کرتا اور یتیم خانے کے منتظم سے علاج کے متعلق تفصیل لیتا۔ اُسے خوشی تھی کہ اللہ نے اُسے اتنی استطاعت دی کہ وہ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ لا سکے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ تقدیر خاموشی سے اُس کی اپنی مسکراہٹ چھیننے کی تیاری کر رہی ہے۔

اُدھر حذیفہ اپنی یونٹ میں واپس پہنچ چکا تھا۔ کبھی کبھار رات گئے گھر پر مختصر سی کال کر لیتا۔ ہمیشہ کی طرح اُس کی آواز میں وہی ہنسی، وہی شوخی اور وہی بے فکری ہوتی۔ ہر بار روبینہ یہی کہتیں، "بیٹا، اپنا خیال رکھنا۔" اور وہ ہنس کر جواب دیتا، "امی، آپ دعا کیا کریں... باقی حفاظت والا اوپر بیٹھا ہے۔" کسی نے بھی اُس کے لہجے میں چھپی اُس خاموش سنجیدگی کو محسوس نہ کیا جو ایک سپاہی اپنے دل میں لیے پھرتا ہے۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔

ریان ابھی اپنے دفتر میں ایک اہم فائل مکمل کر رہا تھا۔ کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمی ہوئی تھیں، مگر ذہن کہیں اور تھا۔ کبھی نکاح کی تیاری یاد آتی، کبھی مسجدِ نبوی ﷺ کا خیال دل میں خوشی بھر دیتا۔ اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کے تقریباً ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اُس نے سوچا آج جلدی گھر جائے گا، امی کے ساتھ بیٹھے گا اور پھر حمزہ بھائی سے سفر کی باقی تیاریوں پر بات کرے گا۔

اچانک اُس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

اسکرین پر ایک نامعلوم نمبر جگمگا رہا تھا۔

ریان نے معمول کے مطابق کال وصول کی۔

"السلام علیکم۔"

دوسری طرف سے ایک نہایت سنجیدہ، مضبوط اور باوقار آواز سنائی دی۔

"وعلیکم السلام۔ کیا میں مسٹر ریان سے بات کر رہا ہوں؟"

"جی، میں ریان بول رہا ہوں۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد آواز دوبارہ ابھری۔

"میں کمانڈر آصف بلال، سی ایم ایچ ہسپتال کاکول سے بات کر رہا ہوں۔"

ریان کے ماتھے پر ہلکی سی شکن نمودار ہوئی۔

"جی سر... خیریت؟"

دوسری طرف چند لمحوں کی خاموشی رہی، جیسے الفاظ ادا کرنا بھی اُن کے لیے آسان نہ ہو۔

پھر وہ آہستہ سے بولے،

مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دینی پڑ رہی ہے کہ "آپ کے بھائی، لیفٹیننٹ حذیفہ، آج صبح شمالی علاقے میں دہشت گردوں کے خلاف ایک آپریشن کے دوران دشمن سے انتہائی بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے ہیں۔"

بس،

ایک جملہ،

اور ریان کی پوری دنیا بکھر گئی۔

اُس کے ہاتھ سے قلم نیچے گر گیا۔

سانس سینے میں جیسے کہیں اٹک گئی۔

آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

وہ نہ چیخ سکا،

نہ رو سکا،

نہ کچھ پوچھ سکا،

صرف کرسی پر بیٹھا چھت کو دیکھتا رہ گیا، جیسے اُس نے ابھی ابھی اپنی زندگی کا سب سے بھیانک خواب سن لیا ہو۔

دوسری طرف سے کمانڈر آصف بلال کی بھاری آواز دوبارہ سنائی دی۔

"مسٹر ریان"

شہید لیفٹیننٹ حذیفہ نے آپ سب کے لیے ایک آڈیو پیغام ریکارڈ کروایا تھا۔ اُن کی ہدایت تھی کہ...
"اگر وہ واپس نہ لوٹ سکیں تو یہ پیغام سب سے پہلے آپ کو سنایا جائے۔"

ریان کے ہونٹ کانپنے لگے۔

"س... سر"

"چلا دیجیے۔..."

چند لمحوں بعد فون پر خاموشی چھا گئی۔

پھر،

حذیفہ کی مانوس، زندہ، مسکراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

ریان!

میں نہیں جانتا کہ یہ پیغام تمہیں ملنے کے بعد میں زندہ ہوں گا یا نہیں... لیکن مجھ سے وعدہ کرو! تم ہمت نہیں ہارو گے۔ کرو گے نا وعدہ؟ میں جانتا ہوں تم اِس وقت رو رہے ہو، مگر تم جانتے ہو نا تمھارے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، کیا تم چاہتے ہوں مجھے تکلیف ہوں؟ نہیں نا؟ اِس لیے رونا بند کرو! اِس بار جب میری یاد آئیں تو مجھے آواز مت دینا، کیونکہ میں نہیں چاہتا تم مجھے پکارو اور میری آواز نہ سن کر مایوس ہو جاؤ، میرے بابا بوڑھے ہیں ان کا بیٹا اب تم ہی ہوں، بنو گے نا ان کا بیٹا؟ مجھے پتا ہے، ابھی بھی تم رو رہے ہوں، مگر اس میں رونے کی بات نہیں ہے، بلکہ خوشی کی بات ہے کہ تمھارے دوست نے شہادت کا رتبہ چنا ہے، سب گھر والوں کا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ!

پھر حذیفہ گنگنانے لگا۔

یہ دوستی ہم نہیں توڑے گے

توڑے گے دم مگر تیرا ساتھ نہ چھوڑے گے۔

آڈیو ختم ہو گئی۔

مگر ریان کے لیے وقت وہیں رک گیا۔

وہ فون کو دونوں ہاتھوں سے تھامے دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل ٹپک رہے تھے۔

پورا دفتر اپنی جگہ موجود تھا،

مگر اُس کے لیے اب ہر آواز، ہر منظر اور ہر لمحہ بدل چکا تھا۔

آج اُس نے صرف اپنا دوست نہیں کھویا تھا،

آج اُس نے اپنی زندگی کا ایک حصہ دفن ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

ریان کے ہاتھ ابھی تک کانپ رہے تھے۔ حذیفہ کی آواز جیسے اب بھی اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ دفتر کی دیواریں، سامنے رکھا کمپیوٹر، میز پر پڑی فائلیں... سب کچھ دھندلا سا ہو گیا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا، مگر آنسو انگلیوں کے درمیان سے پھسل کر میز پر گرتے رہے۔ زندگی میں پہلی بار اُسے محسوس ہوا کہ بعض خبریں انسان کے کانوں تک نہیں پہنچتیں... سیدھا اُس کے دل کو چیر دیتی ہیں۔

کافی دیر بعد اُس نے لرزتے ہاتھوں سے موبائل اٹھایا۔ رابطوں کی فہرست میں اُس کی نظریں صرف ایک نام پر آکر رک گئیں۔

"حمزہ بھائی"

ریان کی انگلیاں بار بار کال کے بٹن تک جاتیں، پھر رک جاتیں۔ وہ جانتا تھا، یہ کال صرف ایک خبر نہیں ہو گی... یہ اُن دونوں بھائیوں کی زندگی بدل دے گی۔

آخر اُس نے کال ملا دی۔

چند لمحوں بعد دوسری طرف سے حمزہ کی پُرسکون آواز سنائی دی۔

"السلام علیکم، ریان۔ خیریت ہے؟"

ریان نے بولنے کی کوشش کی، مگر آواز گلے میں ہی اٹک گئی۔

صرف سسکی سنائی دی۔

حمزہ فوراً چونک گیا۔

"ریان؟"

"کیا ہوا؟"

"بات کرو... سب خیریت ہے نا؟"

ریان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

بڑی مشکل سے اُس نے صرف تین لفظ ادا کیے۔

"بھائی..."

"حذیفہ..."

"شہید ہو گیا۔۔۔"

اُدھر مکمل خاموشی چھا گئی۔

ایسی خاموشی،

جس میں نہ سانس کی آواز تھی،

نہ الفاظ کی،

صرف ایک دوست کا ٹوٹا ہوا دل تھا۔

حمزہ کے ہاتھ سے موبائل تقریباً چھوٹ گیا۔ چند لمحے پہلے تک وہ یتیم خانے کے حسابات دیکھ رہا تھا، مگر اب سامنے رکھی ہر چیز دھندلی ہو چکی تھی۔ اُس نے دیوار کا سہارا لیا، آنکھیں بند کیں اور زیرِ لب صرف ایک جملہ ادا کیا۔

"اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ"

اُس کی پلکوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

چند لمحوں بعد اُس نے خود کو سنبھالا۔

"تم کہاں ہو؟"

ریان نے روتے ہوئے دفتر کا نام بتایا۔

"وہیں رہو"

"میں آ رہا ہوں۔۔۔"

"اکیلے کہیں مت جانا۔"

کال ختم ہو گئی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد حمزہ کی گاڑی دفتر کے باہر رکی۔ ریان باہر سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا، آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں، اور ہاتھوں میں وہی موبائل تھا جس میں حذیفہ کی آخری آواز محفوظ تھی۔

حمزہ آہستہ آہستہ اُس کے قریب آیا۔

کچھ نہ بولا۔

صرف اُس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

ریان نے سر اٹھایا۔

وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

اُٹھ کر سیدھا حمزہ کے سینے سے لگ گیا۔

"بھائی"

"وہ چلا گیا"

"وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا"

اُس کی چیخ نے آس پاس کھڑے لوگوں کی آنکھیں بھی نم کر دیں۔

حمزہ نے اپنے دونوں بازو اُس کے گرد لپیٹ لیے۔

وہ خود بھی رو رہا تھا

مگر اپنے چھوٹے بھائی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

صبر کرو، ریان"

حمزہ کی آواز لرز گئی۔

ریان پھر سے حمزہ کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

کچھ دیر بعد،

دونوں سیدھے سی ایم ایچ روانہ ہوئے۔

راستے بھر گاڑی میں مکمل خاموشی رہی۔

صرف ریان کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔

حمزہ بار بار اُس کی طرف دیکھتا، مگر ہر بار اُس کے پاس تسلی کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے۔

بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں،

جہاں خاموشی بھی انسان کے ساتھ رو رہی ہوتی ہے۔

ہسپتال پہنچتے ہی ایک فوجی افسر اُنہیں مورچری تک لے گیا۔

ہر قدم ریان کے لیے کسی پہاڑ سے کم نہ تھا۔

اُس کے پاؤں بار بار لڑکھڑا رہے تھے۔

حمزہ ہر بار اُس کا بازو تھام لیتا۔

مورچری کا دروازہ آہستہ سے کھولا گیا۔

اندر سبز پرچم میں لپٹا ایک تابوت رکھا تھا۔

پرچم کے اوپر حذیفہ کی فوجی ٹوپی اور اُس کا نام درج تھا۔

ریان کی نظریں جیسے وہیں جم گئیں۔

اُس نے کانپتے قدموں سے آگے بڑھ کر تابوت کو چھوا۔

"حذیفہ"

آواز اتنی دھیمی تھی،

جیسے کوئی خواب ٹوٹنے سے پہلے آخری بار پکار رہا ہو۔

اُس نے دونوں ہاتھ تابوت پر رکھ دیے۔

"اٹھ جا"

"دیکھ"

"میں آ گیا ہوں۔..."

"تو نے وعدہ کیا تھا نا"

"جلدی واپس آئے گا۔..."

مگر جواب میں صرف خاموشی تھی۔

وہی خاموشی،

جو ہمیشہ کے لیے انسان کی زندگی بدل دیتی ہے۔

ریان گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

اُس کی چیخ مورچری کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس لوٹ آئی۔

حمزہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے آگے بڑھ کر تابوت پر ہاتھ رکھا۔

"میرے بھائی"

"اللہ تمہاری شہادت قبول فرمائے۔۔۔"

اُس نے تابوت کو بوسہ دیا۔

پھر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

کیونکہ وہ جانتا تھا،

اب اُنہیں اپنے شہید بھائی کو گھر لے جانا تھا۔

جب فوجی گاڑی شہید حذیفہ کے جسدِ خاکی کو لے کر گھر کی طرف روانہ ہوئی تو راستے بھر ریان کی نظریں تابوت سے نہ ہٹ سکیں۔

اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اگر اُس نے ایک لمحے کے لیے بھی نگاہ ہٹائی،

تو شاید وہ اپنے بھائی کو دوسری بار کھو دے گا۔

انسان اکثر یہ سمجھتا ہے کہ زندگی صرف سانسوں کا نام ہے،

مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی اُن لوگوں سے بھی بنتی ہے جنہیں ہم دل میں بسائے رکھتے ہیں۔

اور جب اُن میں سے کوئی ایک چلا جائے،

تو سانسیں تو چلتی رہتی ہیں،

لیکن زندگی پہلے جیسی نہیں رہتی۔

بعض رشتے خون سے نہیں،

روح سے جڑے ہوتے ہیں۔

اور جب روح کا ایک حصہ بچھڑ جائے،

تو انسان زندہ رہ کر بھی اپنے اندر ایک خاموش قبر لیے پھرتا ہے۔

ریان کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

آج شہر ویسا ہی تھا،

سڑکیں بھی وہی تھیں،

لوگ بھی ویسے ہی چل رہے تھے،

سورج بھی ویسے ہی ڈھل رہا تھا،

بدلا تھا تو صرف ایک انسان۔

کیونکہ آج ایک دوست گھر واپس تو جا رہا تھا،

مگر اُس کے ساتھ بیٹھا دوست،

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا تھا۔

رات خاصی گزر چکی تھی۔ گلی میں اچانک ایک کے بعد ایک گاڑی آ کر رکی تو گھر کے اندر بیٹھے سب لوگ چونک گئے۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو فوجی گاڑی بھی نظر آ رہی تھی، مگر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ کس مقصد کے لیے آئی ہے۔ روبینہ نے بے چینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، شاہینہ کے دل کی دھڑکن بے اختیار تیز ہو گئی، جبکہ عنایہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دھیرے سے کہا، "اس وقت... فوج؟"

دروازہ کھلا تو سب سے پہلے حمزہ اندر داخل ہوا۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا، آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سرخ تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اُس کے پیچھے ریان کھڑا تھا، مگر آج وہ وہی ریان نہیں تھا جو ہمیشہ مسکراتا رہتا تھا۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، قدم لڑکھڑا رہے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے اندر کی تمام طاقت ختم ہو چکی ہو۔

حمزہ کو اس حالت میں دیکھ کر عنایہ فوراً اُس کے قریب آئی۔ اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا، "حمزہ... کیا ہوا؟ سب خیریت ہے؟" حمزہ نے جواب دینے کی کوشش کی مگر الفاظ اُس کے حلق میں اٹک گئے۔ اُس نے صرف ایک بار نظریں اٹھا کر عنایہ کو دیکھا، پھر فوراً جھکا لیں۔ اُس خاموشی نے گھر کے ہر فرد کے دل میں ایک انجانا خوف بھر دیا۔

اسی لمحے باہر کھڑے فوجی اہلکار آہستہ آہستہ گاڑی کی طرف بڑھے۔ سبز ہلالی پرچم میں لپٹا ہوا تابوت بڑی احتیاط سے نیچے اتارا گیا۔ گھر کے اندر موجود سب لوگ چند قدم آگے بڑھے، مگر ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس تابوت میں کون ہے۔ روبینہ نے بے اختیار حمزہ کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا، "حمزہ... یہ کس کا جنازہ ہے؟"

حمزہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے گال پر ایک گرم آنسو بہہ نکلا۔ اُس نے بولنے کی کوشش کی، مگر آواز ساتھ نہ دے سکی۔ ریان نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور وہیں دروازے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُس کی سسکیاں پورے صحن میں گونجنے لگیں۔

گھر کے اندر ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ ہر شخص کے دل میں ایک ہی سوال تھا، مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ دوبارہ پوچھ سکے۔ شاہینہ بے اختیار آگے بڑھیں اور حمزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"بیٹا... خدا کے لیے بتاؤ... کون ہے؟"

حمزہ نے کانپتے ہوئے ہونٹ کھولے۔ اُس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ جیسے ہر لفظ اُس کے دل کو چیر کر باہر آ رہا ہو۔

"امی"

"حذیفہ..."

بس ایک نام۔

صرف ایک نام۔

اور یوں لگا جیسے پورے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

روبینہ کے قدموں تلے زمین نکل گئی۔ اُنہوں نے ایک چیخ ماری اور لڑکھڑاتی ہوئی تابوت کی طرف دوڑیں۔ "نہیں... نہیں... میرا حذیفہ نہیں ہو سکتا..." اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے، وہ بار بار پرچم کو چھو رہی تھیں، جیسے یقین کرنا چاہتی ہوں کہ شاید یہ سب ایک غلط فہمی ہو۔

عنایہ چند لمحوں تک بالکل ساکت کھڑی رہی۔ اُس کے کانوں میں صرف ایک لفظ گونج رہا تھا... حذیفہ۔ وہی حذیفہ جو چند دن پہلے ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا کہ واپس آ کر سب کو تنگ کرے گا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بھائی کی مسکراتی ہوئی صورت گھوم گئی۔ اگلے ہی لمحے اُس کے قدم جواب دے گئے اور وہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ آنسو خاموشی سے اُس کے چہرے پر بہنے لگے، مگر اُس کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

نور منہاج نے عنایہ کو سنبھالنے کی کوشش کی، مگر خود اُن کی آنکھوں سے بھی آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ شاہینہ نے روبینہ کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں مائیں ایک دوسرے کے کندھے سے لگ کر رو رہی تھیں۔ گھر کی فضا سسکیوں، دعاؤں اور ٹوٹتے دلوں کی خاموش آوازوں سے بھر چکی تھی۔

حمزہ ایک قدم آگے بڑھا، اُس نے تابوت پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے نظریں جھکا لیں۔ اُس کے ذہن میں حذیفہ کی وہ آخری مسکراہٹ بار بار ابھر رہی تھی، جب وہ رخصت ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ "جلدی واپس آؤں گا۔" مگر آج وہ واپس تو آیا تھا... صرف فرق اتنا تھا کہ آج اُس کی زبان خاموش تھی، اُس کی آنکھیں بند تھیں اور اُس کے جسم پر وطن کا سبز ہلالی پرچم تھا۔

گھر کے ہر کونے میں ماتم سا بچھ گیا۔ کچھ دیر پہلے تک یہی گھر آنے والے نکاح، مسجدِ نبوی ﷺ کے سفر اور خوشیوں کی باتوں سے آباد تھا، مگر ایک خبر نے سب کچھ بدل دیا تھا۔ انسان واقعی اپنے کل کی کوئی ضمانت نہیں رکھتا۔ کبھی ایک ہی دروازے سے خوشیوں کی دستک سنائی دیتی ہے، اور کبھی اُسی دروازے سے صبر کا سب سے بڑا امتحان اندر داخل ہو جاتا ہے۔

فجر کی اذان سے کچھ پہلے آسمان پر ہلکے سرمئی بادل چھا گئے تھے۔ پوری رات کسی کی آنکھ نہ لگی۔ گھر کے ہر کمرے سے کبھی قرآنِ مجید کی تلاوت کی آواز آتی، کبھی کسی کی سسکی، کبھی کسی کی دعا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت خود بھی سوگ میں ڈوب گیا ہو۔ صحن کے درمیان سبز ہلالی پرچم میں لپٹا حذیفہ کا جسدِ خاکی رکھا تھا۔ اُس کے سرہانے قرآنِ مجید رکھا تھا اور ارد گرد بیٹھے لوگ خاموشی سے اُس کے لیے مغفرت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

روبینہ کی آنکھیں مسلسل اپنے بیٹے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار آگے بڑھتیں، اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتیں، پھر اپنے آنسو پونچھ کر دوبارہ اُسے دیکھنے لگتیں، جیسے اُن کا دل اب بھی اس حقیقت کو ماننے سے انکار کر رہا ہو۔ شاہینہ اُن کے ساتھ بیٹھی تھیں اور ہر چند لمحوں بعد اُنہیں سینے سے لگا لیتیں۔ عنایہ اپنی ماں کے قدموں کے پاس بیٹھی خاموشی سے رو رہی تھی۔ اُس نے پوری رات ایک لفظ نہیں بولا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں صرف اپنے بھائی کی وہ مسکراہٹ گردش کر رہی تھی جو اب ہمیشہ کے لیے یاد بن چکی تھی۔

اسی دوران دروازہ آہستہ سے کھلا۔ چند لوگ سہارا دے کر ایک ضعیف شخص کو اندر لائے۔ یہ حذیفہ کے والد تھے۔ اُنہیں ابھی تک پوری حقیقت کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اُنہوں نے جیسے ہی صحن میں رکھا تابوت دیکھا، اُن کے قدم وہیں رک گئے۔ چند لمحوں تک وہ خاموش کھڑے رہے، پھر لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی لاٹھی ایک طرف رکھ دی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے تابوت کے قریب آئے، کانپتے ہاتھ سے پرچم کو چھوا اور ایک گہری سانس لی۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلے، مگر اُن کے چہرے کی خاموشی ہر چیخ سے زیادہ دردناک تھی۔ اُنہوں نے جھک کر اپنے بیٹے کی پیشانی کو چوما اور دھیرے سے کہا، "بیٹا... باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا جنازہ اُس کا بیٹا اُٹھائے... مگر تُو تو میرے کندھوں پر اپنا جنازہ رکھ کر چلا گیا۔"

یہ الفاظ سنتے ہی پورا گھر دوبارہ آہوں اور سسکیوں سے بھر گیا۔ روبینہ بے اختیار اپنے شوہر کے کندھے سے لگ کر رو پڑیں۔ حمزہ نے آگے بڑھ کر اُنہیں سہارا دیا، مگر اُس کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جن پر کوئی مرہم نہیں رکھا جا سکتا۔

فجر کی نماز ادا کی گئی۔ نماز ختم ہوتے ہی آسمان سے ہلکی ہلکی بارش برسنے لگی۔ بارش کی وہ بوندیں نہ تیز تھیں، نہ آندھی کی طرح بے قابو، بلکہ ایسے لگ رہا تھا جیسے آسمان بھی ایک شہید کی رخصتی پر خاموش آنسو بہا رہا ہو۔ فوجی جوان پورے احترام کے ساتھ تابوت کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر جنازہ گاہ کی طرف لے جانے لگے۔ ہر قدم کے ساتھ لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ آس پاس کے محلے، دوست، رشتہ دار، فوجی افسر، سب ایک شہید کو آخری سلام پیش کرنے آئے تھے۔

نمازِ جنازہ کے بعد جب تابوت قبر کے قریب رکھا گیا تو ریان اب تک خاموش کھڑا تھا۔ اُس کی خاموشی سب کو ڈرا رہی تھی۔ نہ وہ رو رہا تھا، نہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ بس مسلسل اپنے بھائی کے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا، جیسے اپنی آنکھوں میں اُس کی آخری تصویر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔

جب فوجیوں نے تابوت کھولا اور آخری دیدار کا وقت آیا تو ریان کے قدم بے اختیار آگے بڑھ گئے۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے حذیفہ کا چہرہ چھوا۔ وہی چہرہ... وہی سکون... جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہو۔ ریان کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اُس نے جھک کر اپنے بھائی کی پیشانی کو چوما اور اچانک اُس کے اندر برسوں سے جمع ہر جذبہ آنسو بن کر بہہ نکلا۔

وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اُس کی آواز اتنی دردناک تھی کہ جنازے میں موجود کئی اجنبی لوگوں کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ وہ بار بار اپنے بھائی کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کہہ رہا تھا کہ وہ ابھی اٹھ جائے، وہ کہہ دے کہ یہ سب مذاق تھا، وہ ایک بار پھر اُسے "بھائی" کہہ کر پکارے۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جس کے ساتھ اُس نے بچپن گزارا، جس کے ساتھ خواب دیکھے، جس کے ساتھ ہنسا، لڑا، رویا... آج وہ خاموش پڑا ہے اور کبھی جواب نہیں دے گا۔

حمزہ نے آگے بڑھ کر ریان کو سنبھالنے کی کوشش کی، مگر ریان نے اپنے آنسوؤں کے درمیان صرف اتنا کہا کہ لوگ کہتے ہیں دوست خون کا رشتہ نہیں ہوتا، مگر اُسے آج معلوم ہوا کہ دوست دراصل انسان کی آدھی روح ہوتا ہے۔ جب وہ چلا جائے تو باقی آدھی روح بھی زندہ نہیں رہتی، صرف سانسیں باقی رہ جاتی ہیں۔

بارش اب بھی ہلکے ہلکے برس رہی تھی۔ قبر تیار تھی۔ فوجی جوانوں نے پورے احترام کے ساتھ شہید کے جسدِ خاکی کو قبر میں اتارا۔ ہر طرف خاموشی تھی، صرف مٹی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ریان کی نظریں قبر سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر مٹھی مٹی کے ساتھ اُس کا اپنا بچپن، اُس کی ہنسی، اُس کی بے فکری اور اُس کی زندگی کا سب سے خوبصورت حصہ بھی ہمیشہ کے لیے دفن ہوتا جا رہا ہے۔

اس دن صرف ایک شہید کو سپرِدِ خاک نہیں کیا گیا تھا، بلکہ ایک پورے خاندان کی مسکراہٹ بھی اُس مٹی کے نیچے اتر گئی تھی۔

حذیفہ کی تدفین کو تین دن گزر چکے تھے، مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس گھر میں وقت نے چلنا چھوڑ دیا ہو۔ وہی صحن جہاں کبھی حذیفہ کی ہنسی گونجتی تھی، اب غیر معمولی خاموشی میں ڈوبا رہتا تھا۔ دیواریں وہی تھیں، کمرے وہی تھے، مگر اُن میں بسنے والے لوگوں کے چہرے بدل چکے تھے۔ ہر شخص اپنے اپنے انداز میں اُس جدائی کو سہنے کی کوشش کر رہا تھا جسے قبول کرنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔

روبینہ پہلے کی طرح ہر صبح حذیفہ کے کمرے کا دروازہ کھول دیتیں۔ چند لمحے خاموش کھڑی اُس کے بستر کو دیکھتیں، اُس کی الماری پر ہاتھ پھیرتیں، میز پر رکھی اُس کی فوجی ٹوپی کو سینے سے لگا لیتیں، پھر خاموشی سے آنسو پونچھ کر واپس آ جاتیں۔ ایک ماں شاید کبھی یہ نہیں مانتی کہ اُس کا بیٹا اب واقعی واپس نہیں آئے گا۔ شاہینہ ہر نماز کے بعد اُن کے پاس بیٹھ جاتیں، کبھی اُن کا ہاتھ تھام لیتیں، کبھی قرآنِ مجید کی تلاوت کرتیں اور کبھی صرف خاموشی سے اُن کا ساتھ دیتیں، کیونکہ بعض دکھوں میں الفاظ نہیں، صرف ساتھ ہونا ہی سب سے بڑی تسلی ہوتا ہے۔

عنایہ اپنی ڈیوٹی پر جانے لگی تھی، مگر اُس کی آنکھوں کی چمک کہیں کھو چکی تھی۔ ہسپتال میں ہر مریض کو دیکھ کر اُسے اپنے بھائی کی یاد آجاتی۔ کئی مرتبہ وہ مریض کا معائنہ کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے خاموش ہو جاتی، پھر خود کو سنبھال کر دوبارہ کام میں مصروف ہو جاتی۔ اُس نے اپنے غم کو اپنے پیشے کے پیچھے چھپالیا تھا، مگر دل کے اندر ہر لمحہ ایک خلا موجود تھا جسے کوئی بھر نہیں سکتا تھا۔

ریان سب سے زیادہ بدل گیا تھا۔ پہلے وہ دفتر سے واپس آتے ہی سب سے ہنسی مذاق کرتا، حذیفہ کو آوازیں دیتا اور دونوں بھائی دیر رات تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ اب وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا یا پھر اپنے خالو کے پاس بیٹھ جاتا۔ وہ اپنے خالو کو دوائیں وقت پر دیتا، اُنہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا، اُن کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتا اور کوشش کرتا کہ اُنہیں ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہ چھوڑے۔ حذیفہ کی آخری آواز اُس کے دل میں ہر وقت گونجتی رہتی تھی، جیسے ہر قدم پر اُسے اُس وعدے کی یاد دلا رہی ہو جو اُس نے اپنے شہید دوست سے کیا تھا۔

حمزہ بھی بظاہر مضبوط دکھائی دیتا تھا، مگر حقیقت میں وہ خود کو ہر روز اللہ کے سامنے ٹوٹتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ اکثر رات کے آخری پہر وہ تہجد میں کھڑا رہتا، طویل سجدے کرتا اور خاموشی سے حذیفہ کے لیے دعا مانگتا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کتنی بے اعتبار ہے۔ چند دن پہلے یہی گھر نکاح، مدینہ منورہ کے سفر اور خوشیوں کی تیاریوں میں مصروف تھا، اور آج ہر دیوار پر خاموشی لکھی ہوئی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اگر اللہ نے زندگی کا ایک ایک لمحہ بھی عطا کیا تو وہ اُسے صرف اُس کی رضا میں گزارنے کی کوشش کرے گا۔

ان تین دنوں میں گھر میں کئی مرتبہ یہ بات بھی اٹھی کہ شاید نکاح کو کچھ عرصہ مؤخر کر دینا چاہیے۔ کسی کا دل خوشی کی بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ہر شخص یہی سوچتا تھا کہ ایسے غم کے بعد جشن کیسے منایا جاسکتا ہے۔ مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ یہ بات کھل کر کرے۔

اسی شام سب لوگ ڈرائنگ روم میں خاموش بیٹھے تھے۔ چائے کے کپ سامنے رکھے تھے، مگر کسی نے ہاتھ تک نہ لگایا۔ کافی دیر کی خاموشی کے بعد حذیفہ کے والد نے گہری سانس لی اور نظریں اٹھائیں۔ اُن کی آواز پہلے سے زیادہ کمزور تھی، مگر لہجے میں عجب سا یقین تھا۔ اُنہوں نے حمزہ اور عنایہ کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولے کہ اگر آج حذیفہ زندہ ہوتا تو وہ کبھی یہ برداشت نہ کرتا کہ اُس کی وجہ سے کسی کی خوشی رک جائے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنی جان وطن پر قربان کی ہے، نہ کہ اس لیے کہ اُس کے بعد زندہ رہنے والے اپنی زندگیاں روک دیں۔

کمرے میں دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ روبینہ نے نم آنکھوں کے ساتھ اپنے شوہر کی بات سنی، پھر آہستہ سے سر ہلا دیا۔ اُنہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ اُن کا بیٹا ہمیشہ اللہ کی رضا پر راضی رہتا تھا، اس لیے وہ بھی اُس کی خواہش کے خلاف نہیں جائیں گی۔

حمزہ نے نظریں جھکا لیں۔ اُس کے دل پر جیسے ایک اور ذمہ داری آ گئی تھی۔ اُس نے خاموشی سے دل میں دعا کی کہ یا اللہ، اس خاندان کے اس غم کو آسان فرما اور ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم اپنے شہید کی یاد کو آنسوؤں سے نہیں، بلکہ اپنی نیکیوں سے زندہ رکھیں۔

اُسی لمحے یوں محسوس ہوا جیسے اس گھر نے غم کو بھلایا نہیں، بلکہ اُسے اپنے دل میں جگہ دے کر زندگی کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ کیونکہ بعض جدائیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں، انسان صرف اُن کے ساتھ جینا سیکھ لیتا ہے۔

حذیفہ کی شہادت کو تقریباً دو ہفتے گزر چکے تھا۔ دکھ اپنی جگہ موجود تھا، مگر زندگی آہستہ آہستہ دوبارہ چلنے لگی تھی۔ گھر میں اب پہلے جیسی خاموشی تو تھی، لیکن اُس خاموشی میں صبر شامل ہو چکا تھا۔ ہر نماز کے بعد حذیفہ کے لیے دعا کی جاتی، اُس کے نام سے صدقہ دیا جاتا اور جب بھی اُس کا ذکر آتا، ہر آنکھ بے اختیار نم ہو جاتی۔ وقت کسی زخم کو مٹاتا نہیں، بس انسان کو اُس کے ساتھ جینا سکھا دیتا ہے۔

مدینہ منورہ کے سفر میں اب صرف چند دن باقی رہ گئے تھے۔ ٹکٹ، ویزے، ہوٹل کی بکنگ اور تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ حمزہ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات خود دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار فائل کھول کر پاسپورٹ، ٹکٹ اور سفری دستاویزات چیک کرتا، پھر دوبارہ بند کر دیتا۔ شاید وہ کسی غلطی کی گنجائش ہی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ یہ سفر اُس کے لیے صرف ایک نکاح کا سفر نہیں تھا، بلکہ اُس زندگی کا آغاز تھا جس کی دعا وہ برسوں سے مانگ رہا تھا۔

اُدھر پیرس میں گرینی اور فینگ بھی تیاریوں میں مصروف تھے۔ گرینی نے کئی برس بعد اپنی الماری سے وہ سفید لباس نکالا جسے وہ ہمیشہ کسی خاص موقع کے لیے سنبھال کر رکھتی آئی تھیں۔ اُن کے چہرے پر ایک عجیب سا سکون تھا۔ وہ اکثر خاموش بیٹھ جاتیں اور سوچتیں کہ زندگی نے اُنہیں کتنا لمبا سفر طے کروایا ہے۔ کبھی وہ ایک ایسے نوجوان کو گناہوں میں ڈوبتا دیکھتی تھیں، اور آج اُسی نوجوان کے نکاح کے لیے مسجدِ نبوی ﷺ جا رہی تھیں۔ اُنہیں محسوس ہوتا تھا کہ اللہ جسے چاہے، ایک لمحے میں بدل دیتا ہے۔

فینگ بھی غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ اُس نے اپنی تمام پیشہ ورانہ مصروفیات چند دن کے لیے منسوخ کر دی تھیں۔ جب اُس کے ساتھیوں نے وجہ پوچھی تو اُس نے صرف اتنا کہا کہ وہ اپنے دوست کی زندگی کے سب سے خوبصورت دن کا گواہ بننے جا رہا ہے۔ اُسے فخر تھا کہ اُس نے حمزہ کو اُس وقت بھی نہیں چھوڑا تھا جب پوری دنیا اُس سے منہ موڑ رہی تھی۔

ادھر لاہور میں ایک شام حمزہ گھر کی چھت پر کھڑا ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ عنایہ خاموشی سے اُس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں کچھ دیر بغیر کچھ کہے افق کو دیکھتے رہے۔ کبھی کبھی خاموشی بھی دو محبت کرنے والوں کے درمیان طویل گفتگو بن جاتی ہے۔

حمزہ نے دھیرے سے کہا کہ کبھی کبھی اُسے ڈر لگتا ہے۔ عنایہ نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے مسکرا کر پوچھا کہ جس انسان نے موت کو اتنی قریب سے دیکھا ہو، اُسے اب کس بات کا خوف ہے۔ حمزہ نے نظریں آسمان پر جمائے رکھیں اور آہستہ سے کہا کہ اُسے دنیا کھونے کا ڈر نہیں، اُسے صرف اس بات کا خوف ہے کہ کہیں وہ دوبارہ اللہ سے دور نہ ہو جائے۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنے رب کا راستہ پایا ہے اور اب وہ دوبارہ بھٹکنا نہیں چاہتا۔

عنایہ نے پہلی بار اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس کی آواز میں عجیب سا یقین تھا۔ اُس نے کہا کہ اگر دو لوگ ایک دوسرے کو صرف دنیا کے لیے چاہیں تو وقت اُنہیں جدا کر دیتا ہے، لیکن اگر وہ ایک دوسرے کو اللہ کے لیے چاہیں تو اُن کا رشتہ دنیا سے آگے بھی قائم رہتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اُن کی محبت کبھی ایک دوسرے تک محدود نہ رہے، بلکہ ہر روز اُنہیں اللہ کے مزید قریب کرتی رہے۔

حمزہ نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں محبت ضرور تھی، مگر اُس محبت سے زیادہ شکر گزاری تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اللہ نے اُسے صرف ایک شریکِ حیات نہیں دی، بلکہ ایک ایسی رفیق عطا کی ہے جو ہر قدم پر اُسے اپنے رب کی یاد دلائے گی۔

اگلی صبح دونوں مِرہان جلال سے ملنے یتیم خانے گئے۔ مِرہان پہلے سے کہیں زیادہ صحت مند دکھائی دے رہا تھا، مگر اُس کے علاج کا سلسلہ ابھی بھی جاری تھا۔ تھیلیسیمیا کی وجہ سے اُسے باقاعدگی سے خون لگوانا پڑتا تھا۔ حمزہ نے یتیم خانے کے منتظم سے کافی دیر تک بات کی۔ اُس نے ایک ٹرسٹ کے ذریعے مِرہان کی تعلیم، علاج، ادویات اور آئندہ تمام اخراجات کے لیے مستقل فنڈ قائم کر دیا تاکہ اگر کل وہ خود موجود نہ بھی ہو، تب بھی اُس بچے کی زندگی کسی مالی پریشانی کا شکار نہ ہو۔

جب تمام کاغذی کارروائی مکمل ہو گئی تو منتظم نے حیرت سے حمزہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ اتنی بڑی رقم تو لوگ اپنے بچوں کے لیے بھی مشکل سے رکھتے ہیں۔ حمزہ صرف مسکرا دیا۔ اُس نے جواب دیا کہ اصل دولت وہ نہیں جو انسان اپنے لیے جمع کرے، بلکہ وہ ہے جو اُس کے جانے کے بعد بھی کسی کی زندگی آسان بناتی رہے۔

واپسی پر گاڑی میں غیر معمولی سکون تھا۔ عنایہ نے خاموشی سے حمزہ کو دیکھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اللہ نے واقعی اس انسان کو بدل دیا ہے۔ کبھی وہ شہرت کے لیے جیتا تھا، آج وہ گمنامی میں نیکیاں بانٹ رہا تھا۔ اُس کے دل میں حمزہ کے لیے محبت پہلے سے کہیں زیادہ گہری ہو چکی تھی۔

شام ڈھلنے لگی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ افق کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ غروب ہونے والا سورج اُن کی زندگی کے خوشیوں بھرے آخری چند دنوں کی ابتدا ابھی ہے، کیونکہ تقدیر خاموشی سے ایک ایسا باب لکھ رہی تھی جسے کوئی انسان پڑھ تو سکتا تھا، مگر بدل نہیں سکتا تھا۔

مدینہ منورہ روانگی میں اب صرف دو دن باقی تھے۔ گھر کا ماحول کئی دنوں بعد پہلی مرتبہ کچھ ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ غم اپنی جگہ موجود تھا، حذیفہ کی یاد بھی ہر سانس کے ساتھ زندہ تھی، مگر سب نے یہ حقیقت قبول کر لی تھی کہ شہید کے جانے کے بعد اُس کے لیے سب سے خوبصورت تحفہ مسلسل دعا اور نیک اعمال ہیں، نہ کہ زندگی کو روک دینا۔

صبح سویرے سب لوگ ناشتے کی میز پر اکٹھے بیٹھے تھے۔ کافی دنوں بعد ریان نے پہلی مرتبہ خود سب کے لیے چائے ڈالی۔ شاہینہ نے خاموشی سے اُسے دیکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ اُن کا بیٹا چند ہی دنوں میں کئی برس بڑا ہو گیا ہے۔ حذیفہ کی شہادت نے اُس سے اُس کی بے فکری چھین لی تھی، مگر اُس کے بدلے اُسے ذمہ داری عطا کر دی تھی۔

ناشتے کے بعد حمزہ نے سب کو ڈرائنگ روم میں جمع ہونے کی درخواست کی۔ جب سب بیٹھ گئے تو اُس نے ایک فائل میز پر رکھی اور مسکراتے ہوئے کہا کہ مدینہ منورہ کے تمام ٹکٹ، ہوٹل کی بکنگ، ٹرانسپورٹ اور عمرے کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ ہر شخص کا نام الگ الگ درج تھا تاکہ وہاں پہنچ کر کسی کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ اُس نے بڑی محبت سے فائل ریان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ

اب یہ ذمہ داری تمہارے پاس رہے گی، کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اس سفر میں ہر فرد خود کو ایک خاندان محسوس کرے، مہمان نہیں۔

ریان نے فائل تو لے لی، مگر چند لمحوں تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے دھیرے سے کہا کہ اگر حذیفہ آج یہاں ہوتا تو سب سے زیادہ شور وہی مچاتا۔ ایک لمحے کے لیے پورا کمرہ خاموش ہو گیا۔ ہر چہرے پر مسکراہٹ بھی آئی اور آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ حمزہ نے آہستہ سے ریان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ کچھ لوگ دنیا سے چلے ضرور جاتے ہیں، مگر اُن کی یادیں گھر کے دروازے کبھی نہیں چھوڑتیں۔

اسی دوران دروازے کی گھنٹی بجی۔ چند لمحوں بعد معلوم ہوا کہ پیرس سے گرینی اور فینگ بھی لاہور پہنچ چکے ہیں۔ دروازہ کھلتے ہی گرینی نے سب سے پہلے حمزہ کو سینے سے لگا لیا۔ اُنہوں نے کافی دیر تک کچھ نہیں کہا، صرف اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے، مگر اُن آنسوؤں میں دکھ سے زیادہ شکر گزاری تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ اللہ نے جس نوجوان کو کبھی دنیا کی اندھی روشنیوں میں بھٹکتے دیکھا تھا، آج اُسے اپنے محبوب ﷺ کے شہر بلا لیا ہے۔

فینگ نے ہمیشہ کی طرح ماحول کو ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے حمزہ کو گلے لگاتے ہوئے مسکرا کر کہا کہ اگر اُس نے دوبارہ کوئی مشکل کھڑی کی تو اس بار وہ وکیل بن کر نہیں، بڑے بھائی بن کر ڈانٹے گا۔ کئی دنوں بعد گھر میں ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ شاید غم کے بعد مسکرانا ہی صبر کی پہلی نشانی ہوتا ہے۔

گرینی اور فینگ سب سے ملے، اپنا تعارف کروایا۔

شام کو سب لوگ چھت پر بیٹھے مدینہ منورہ کے سفر کی باتیں کر رہے تھے۔ گرینی خاموشی سے آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ اُنہوں نے آہستہ سے کہا کہ انسان پوری زندگی دنیا دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے، مگر

اصل خوش نصیب وہ ہے جسے اللہ اپنے گھر اور اپنے محبوب ﷺ کے شہر کی حاضری نصیب کر دے۔ اُن کے لہجے میں ایسی تڑپ تھی کہ سب چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

عنایہ نے اُسی لمحے حمزہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں چند لمحوں کے لیے ملیں۔ اُن نظروں میں نہ کوئی وعدہ تھا، نہ کوئی دنیاوی خواہش۔ بس ایک دعا تھی کہ یہ سفر اُن کی زندگی کا سب سے بابرکت سفر ثابت ہو۔ حمزہ نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اللہ نے اُس کی ہر ٹوٹی ہوئی دعا کو ایسے وقت میں قبول کیا جب وہ قبولیت کی امید بھی کھو چکا تھا۔

رات گئے سب اپنے کمروں میں چلے گئے، مگر حمزہ کو نیند نہ آئی۔ وہ خاموشی سے وضو کر کے جائے نماز پر کھڑا ہو گیا۔ سجدے میں اُس نے طویل دعا کی۔ اُس نے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا، صرف اپنے والدین، اس خاندان، حذیفہ کی مغفرت، مِرہان جلال کے روشن مستقبل اور عنایہ کے ساتھ ایسی زندگی مانگی جو اللہ کی رضا میں گزرے۔ دعا کے اختتام پر اُس کے لبوں پر صرف ایک جملہ تھا کہ اگر یہ خوشیاں میرے حق میں بہتر ہیں تو انہیں قائم رکھ، اور اگر نہیں، تو مجھے اپنی رضا پر راضی رہنے والا دل عطا فرما۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ بعض دعاؤں کا جواب انسان کی خواہش کے مطابق نہیں، کچھ دعاؤں پر کن کے مہر نہیں لگتی، بلکہ سب کچھ اللہ کی حکمت کے مطابق ملتا ہے۔ اور کبھی کبھی آنے والی آزمائش ہی دراصل اُس دعا کی قبولیت کا ایک ایسا انداز ہوتی ہے جسے انسان اُس وقت نہیں سمجھ پاتا۔

دو دن بعد فجر کی پہلی کرن کے ساتھ ہی پورا گھر جاگ چکا تھا۔ آج وہ دن تھا جس کا انتظار کئی مہینوں سے کیا جا رہا تھا۔ سوٹ کیس رات ہی کو بند کر دیے گئے تھے، پاسپورٹ اور ٹکٹ دوبارہ کئی مرتبہ دیکھے جا

چکے تھے اور ہر شخص کے دل میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ یہ صرف ایک سفر نہیں تھا، بلکہ اُس سرزمین کی حاضری تھی جہاں ہر مسلمان کی نگاہیں زندگی بھر لگتی ہیں۔

گھر سے روانہ ہونے سے پہلے سب لوگ ایک بار پھر حذیفہ کی قبر پر گئے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور قبرستان غیر معمولی خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ریان آہستہ آہستہ اپنے بھائی کی قبر کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے خاموشی سے فاتحہ پڑھی، پھر قبر کی مٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دل ہی دل میں وہ سب باتیں کہہ ڈالیں جو وہ اُس دن جنازے کے وقت نہ کہہ سکا تھا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے خالو کا سہارا بنے گا، اپنے دوست کے ہر خواب کو زندہ رکھنے کی کوشش کرے گا اور جب مسجدِ نبوی ﷺ پہنچے گا تو اُس کی طرف سے بھی سلام پیش کرے گا۔

حمزہ کچھ فاصلے پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بھی قبر کے سامنے ہاتھ اٹھائے اور بڑی دیر تک دعا مانگتا رہا۔ اُس کے دل میں ایک عجیب سی کسک تھی۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ حذیفہ آج بھی اُن کے ساتھ ہے، بس نظر نہیں آ رہا۔ دعا ختم کرنے کے بعد اُس نے خاموشی سے قبر کی مٹی کو دیکھا اور دل ہی دل میں کہا کہ اگر اللہ نے چاہا تو وہ مدینہ منورہ سے واپس آ کر دوبارہ یہاں حاضر ہو گا۔ انسان اپنے مستقبل کے کتنے منصوبے بناتا ہے، مگر اُن منصوبوں کے بارے میں آخری فیصلہ ہمیشہ آسمان پر ہوتا ہے۔

قبرستان سے نکلتے ہوئے کسی نے زیادہ بات نہیں کی۔ ہر شخص اپنی سوچوں میں گم تھا۔ چند ہی دیر بعد سب ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں لاہور کی مصروف سڑکیں حسبِ معمول آباد

تھیں، مگر گاڑی کے اندر خاموشی تھی۔ کبھی کبھار حذیفہ کا کوئی ذکر آجاتا، پھر سب خاموش ہو جاتے۔ بعض نام ایسے ہوتے ہیں جنہیں زبان سے ادا کرنے کے لیے بھی بہت ہمت چاہیے ہوتی ہے۔

ایئرپورٹ پہنچ کر جب سامان جمع کروایا جارہا تھا تو فینگ بچوں کی طرح ہر چیز کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی ریان سے کوئی سوال کرتا، کبھی حمزہ سے۔ گرینی خاموشی سے لوگوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ اُنہوں نے دھیرے سے کہا کہ شاید انسان کی زندگی کا سب سے خوبصورت سفر وہ ہوتا ہے جو اُسے اپنے رب کی طرف لے جائے۔

امیگریشن اور دیگر مراحل مکمل ہونے کے بعد سب انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔ عنایہ کھڑکی کے قریب بیٹھی رن وے پر کھڑے جہازوں کو دیکھ رہی تھی۔ حمزہ خاموشی سے اُس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مگر کچھ نہ کہا۔ کئی مرتبہ محبت اپنی خوبصورتی الفاظ میں نہیں، خاموشیوں میں دکھاتی ہے۔

کچھ دیر بعد بورڈنگ کا اعلان ہوا۔ سب نے اپنے اپنے سامان سنبھالے اور آہستہ آہستہ جہاز کی طرف بڑھنے لگے۔ جیسے ہی حمزہ نے جہاز کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا، اُس نے بے اختیار آسمان کی طرف دیکھا اور زیرِلب "الحمدللہ" کہا۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ چند دن بعد وہ مسجدِ نبوی ﷺ کے صحن میں کھڑا ہوگا، وہی مسجد جس کے بارے میں وہ کبھی صرف کتابوں میں پڑھا کرتا تھا۔

جہاز نے رن وے پر رفتار پکڑنی شروع کی۔ چند لمحوں بعد زمین آہستہ آہستہ نیچے رہ گئی۔ لاہور کی روشنیاں چھوٹی ہوتی گئیں اور بادل اُن کے گرد پھیلنے لگے۔ ہر شخص اپنی نشست پر بیٹھا تھا، مگر ہر دل میں الگ کیفیت تھی۔ کوئی شکر ادا کر رہا تھا، کوئی دعا مانگ رہا تھا، کوئی مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا، اور کوئی اپنے ماضی کو یاد کر رہا تھا۔

حمزہ نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سفید بادلوں کے سمندر کو دیکھ کر اُس کے دل میں صرف ایک خیال آیا کہ انسان زمین پر جتنا بھی بڑا کیوں نہ بن جائے، آسمان کے سامنے ہمیشہ بہت چھوٹا رہتا ہے۔ شاید اسی لیے اللہ اپنے بندوں کو کبھی خوشی سے اور کبھی آزمائش سے یاد دلاتا ہے کہ اصل اختیار ہمیشہ اُسی کے ہاتھ میں ہے۔

کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ سفر اُن کی زندگی کا سب سے خوبصورت سفر بھی بننے والا ہے... اور شاید آخری بھی۔

طویل فضائی سفر کے بعد اچانک جہاز کے اندر اعلان گونجا کہ چند ہی لمحوں میں جہاز مدینہ منورہ کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترنے والا ہے۔ یہ سنتے ہی پورے جہاز کی فضا بدل گئی۔ کئی مسافروں کی زبان پر بے اختیار درودِ پاک جاری ہو گیا، کوئی خاموشی سے تسبیح پڑھنے لگا، کوئی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا بیٹھا اور کئی آنکھیں نم ہو گئیں۔ حمزہ نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ نیچے سنہری زمین آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ اُس کا دل اس شدت سے دھڑک رہا تھا کہ اُسے اپنی ہی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

جہاز نے رن وے کو چھوا تو حمزہ نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے ہونٹوں سے صرف ایک لفظ نکلا، "الحمدللہ۔" اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی لمحے میں پوری زندگی گھوم گئی۔ پیرس کی رنگین راتیں... شراب کے جام... گناہوں میں گزری ہوئی زندگی... ہسپتال کا وہ بستر... گولی کا زخم... عنایہ... توبہ... اور پھر آج... اللہ نے اُسے اپنے محبوب ﷺ کے شہر میں پہنچا دیا تھا۔ اُس کی پلکوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کا رب اُسے یہ احساس دلا رہا ہو کہ بندہ جتنا بھی بھٹک جائے، اگر سچے دل سے پلٹ آئے تو رحمت کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔

جہاز سے باہر قدم رکھتے ہی مدینہ کی ٹھنڈی ہوا نے سب کے چہروں کو چھوا۔ وہ عام ہوا نہیں تھی، اُس میں ایک عجیب سا سکون تھا، جیسے دل کی تمام بے چینیاں اپنے آپ ختم ہونے لگیں۔ گرینی نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور خاموشی سے رونے لگیں۔ اُنہوں نے زندگی میں بے شمار ممالک دیکھے تھے، مگر ایسی روحانی کیفیت اُنہیں کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ فینگ بھی حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اُسے پہلی بار سمجھ آ رہا تھا کہ آخر کیوں دنیا بھر کے مسلمان اس شہر کے لیے اپنے دل میں اتنی محبت رکھتے ہیں۔

امیگریشن اور دیگر کارروائیاں مکمل کرنے کے بعد سب لوگ ہوٹل پہنچے۔ کمرے میں سامان رکھ کر کسی کو آرام کرنے کی خواہش نہ ہوئی۔ ہر دل میں بس ایک ہی آرزو تھی کہ جلد از جلد مسجدِ نبوی ﷺ کی حاضری نصیب ہو۔ وضو کر کے سب خاموشی سے مسجد کی طرف چل پڑے۔

جیسے جیسے وہ مسجدِ نبوی ﷺ کے قریب پہنچ رہے تھے، اُن کے قدم خود بخود آہستہ ہوتے جا رہے تھے۔ دور سے سبز گنبد نظر آیا تو ریان کے قدم وہیں رک گئے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُسے فوراً حذیفہ کی یاد آگئی۔ ریان نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے اور دل ہی دل میں اپنے شہید دوست کا سلام عرض کر دیا۔ اُس لمحے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے حذیفہ کی خواہش بھی پوری ہو گئی ہو۔

حمزہ نے پہلی بار مسجدِ نبوی ﷺ کو سامنے دیکھا تو اُس کے قدم جیسے زمین میں جم گئے۔ اُس نے کئی لمحوں تک کچھ نہیں کہا۔ صرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے عنایہ کی طرف دیکھا، مگر عنایہ کی کیفیت بھی اُس سے مختلف نہ تھی۔ دونوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ ایسے مقامات پر محبت بھی خاموش ہو جاتی ہے اور دل صرف اپنے رب سے بات کرنا چاہتا ہے۔

جب سب مسجد کے صحن میں داخل ہوئے تو سفید سنگِ مرمر کی ٹھنڈک قدموں سے ہوتی ہوئی دل تک اتر گئی۔ ہر طرف عبادت میں مشغول لوگ تھے، مگر اتنے بڑے اجتماع میں بھی ایسا سکون تھا جو دنیا کے کسی شور میں نہیں مل سکتا۔ حمزہ نے سجدہ کیا تو اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اُس نے روتے ہوئے اپنے رب سے معافی مانگی، اپنے والدین کے لیے دعا کی، حذیفہ کی مغفرت مانگی، مِرہان جلال کے روشن مستقبل کی دعا کی اور آخر میں عنایہ کے لیے دعا کی کہ اللہ اُن کے اس رشتے کو اپنی رضا کا ذریعہ بنا دے۔

نماز کے بعد سب خاموشی سے روضۂ رسول ﷺ کی طرف بڑھے۔ جیسے جیسے وہ قریب پہنچ رہے تھے، اُن کے دلوں کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ سلام پیش کرتے ہوئے حمزہ کی آواز بار بار رندھ جاتی تھی۔ وہ اپنے آنسو روک نہیں پا رہا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر پوری زندگی کا ہر لمحہ بھی اس ایک لمحے کے بدلے دینا پڑ جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں ہو گا۔

مدینہ منورہ میں اُن کی پہلی رات عبادت، شکر اور خاموش دعاؤں میں گزری۔ کسی کی آنکھ پوری طرح نہ لگ سکی۔ کبھی کوئی کھڑکی سے مسجدِ نبوی ﷺ کے روشن میناروں کو دیکھتا، کبھی کوئی تسبیح پڑھتے پڑھتے اپنے رب کا شکر ادا کرتا۔ حمزہ تو تقریباً پوری رات جاگتا رہا۔ وہ بار بار سوچتا تھا کہ چند سال پہلے اگر کوئی اُس سے کہتا کہ ایک دن وہ اللہ کے محبوب ﷺ کے شہر میں بیٹھ کر اپنی زندگی کی نئی شروعات کا انتظار کرے گا تو شاید وہ خود بھی یقین نہ کرتا۔

فجر کی اذان سے پہلے ہی سب وضو کر کے مسجدِ نبوی ﷺ کی طرف روانہ ہو گئے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں ایک عجیب سی لطافت تھی۔ مسجد کے صحن میں داخل ہوتے ہی ہر دل پر سکون کی ایسی کیفیت طاری ہو گئی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہ تھا۔ ہزاروں لوگ موجود تھے، مگر پھر بھی ہر طرف خاموشی، ادب اور عبادت کا ایسا ماحول تھا جیسے پوری دنیا کی آوازیں کہیں دور رہ گئی ہوں۔

نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد سب کافی دیر تک اپنی اپنی جگہ بیٹھے دعا کرتے رہے۔ ریان نے ہاتھ اٹھائے تو اُس کی آنکھوں کے سامنے فوراً حذیفہ کا چہرہ آ گیا۔ اُس نے اپنے شہید دوست کے لیے طویل دعا مانگی۔ اُس لمحے اُس کے دل کا ایک بوجھ جیسے ہلکا ہو گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے اپنے بھائی سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا ہے۔

دوسری طرف حمزہ سجدے میں سر رکھے دیر تک روتا رہا۔ اُس کے آنسو جائے نماز کو بھگو رہے تھے۔ وہ بار بار اللہ سے اپنے ماضی کی معافی مانگ رہا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اللہ اُس کے گناہوں کو لوگوں کے سامنے ظاہر کر دیتا تو شاید آج وہ اس مقدس جگہ پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہ ہوتا۔ اُس نے اپنے رب کا شکر ادا کیا کہ اُس نے اُس کے عیبوں پر پردہ رکھا، اُسے توبہ کی توفیق دی اور پھر اپنے محبوب ﷺ کے شہر تک بلا لیا۔

نماز کے کچھ دیر بعد مسجدِ نبوی ﷺ کے قریب ایک سادہ مگر انتہائی بابرکت محفل میں حمزہ اور عنایہ کا نکاح طے شدہ وقت پر منعقد ہوا۔ نہ وہاں دنیاوی نمود و نمائش تھی، نہ شور، نہ قیمتی سجاوٹ، نہ سینکڑوں مہمان۔ صرف چند اپنے لوگ، چند گواہ، قرآن کی تلاوت، درودِ پاک کی صدائیں اور اللہ کے نام پر جڑنے والے دو دل۔

جب قاضی صاحب نے حمزہ سے ایجاب و قبول کے الفاظ دہرائے تو اُس کی آواز ایک لمحے کے لیے بھر آئی۔ اُس نے خود کو سنبھالا اور مضبوط لہجے میں قبول کیا۔ دوسری طرف عنایہ نے بھی پردے کے پیچھے بیٹھے نہایت سکون سے وہی الفاظ ادا کیے۔ نکاح مکمل ہوتے ہی سب کی زبان پر بے اختیار "الحمدللہ" جاری ہو گیا۔ شاہینہ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ روبینہ نے عنایہ کو گلے لگا لیا۔ ریان اور خالو نے حمزہ کو سینے سے لگا کر مبارک باد دی، مگر دونوں جانتے تھے کہ اگر آج حذیفہ زندہ ہوتا تو سب سے زیادہ شور وہی مچاتا۔

حمزہ نے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں۔ اُس کے دل میں ایک عجیب سی خلش بھی تھی اور شکر بھی۔ اُس نے خاموشی سے دعا کی کہ یا اللہ، میرے شہید بھائی کو بھی اس خوشی کا اجر عطا فرما۔ وہ اگرچہ آج ہمارے درمیان نہیں، مگر ہماری ہر خوشی میں اُس کا حصہ ہمیشہ رہے گا۔

نکاح کے بعد سب نے مسجدِ نبوی ﷺ کے صحن میں بیٹھ کر کچھ دیر قرآنِ مجید کی تلاوت کی۔ گرینی مسلسل خاموش بیٹھی ہر منظر کو اپنے دل میں محفوظ کر رہی تھیں۔ اُنہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن کی زندگی کا ہر پچھلا سفر صرف اس ایک دن تک پہنچنے کا ذریعہ تھا۔ اُنہوں نے حمزہ کی طرف دیکھا اور اُن کی آنکھوں میں فخر نمایاں تھا۔ وہ نوجوان جسے کبھی دنیا نے گناہوں میں ڈوبا ہوا دیکھا تھا، آج اُسی کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن اللہ کے محبوب ﷺ کے شہر میں لکھا جا رہا تھا۔

فیننگ بھی غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔ اُس نے کبھی حمزہ کو اتنا پُرسکون نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایسی طمانیت تھی جو نہ دولت دے سکتی ہے، نہ شہرت اور نہ ہی دنیا کی کوئی کامیابی۔ شاید انسان کو اصل سکون اُس دن ملتا ہے جب اُس کا دل اپنے رب سے دوبارہ جڑ جاتا ہے۔

پورا دن مسجدِ نبوی ﷺ میں عبادت، دعا اور شکر گزاری میں گزرا۔ ہر کوئی بار بار سبز گنبد کو دیکھتا اور دل ہی دل میں دعا کرتا کہ اللہ اس حاضری کو قبول فرمالے۔ سورج غروب ہونے لگا تو آسمان پر سنہری روشنی پھیل گئی۔ مسجد کے مینار اُس روشنی میں مزید خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ حمزہ نے خاموشی سے عنایہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو کسی نے کچھ نہ کہا، مگر دونوں کے دل ایک

ہی دعا مانگ رہے تھے کہ اللہ اُن کی اس نئی زندگی کو ہمیشہ اپنی رضا اور اپنے دین کی خدمت کا ذریعہ بنا دے۔

اُسی رات یہ طے پایا کہ اگلی صبح وہ سب مکہ مکرمہ روانہ ہوں گے تاکہ بیت اللہ کی حاضری نصیب ہو، عمرہ ادا کریں اور اپنی زندگی کے اس مبارک سفر کو اُس گھر کے طواف سے مکمل کریں، جس کی طرف دنیا بھر کے مسلمان ہر نماز میں اپنا رخ کرتے ہیں۔

اگلی صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی سب لوگ احرام کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کا سفر شروع ہونے والا تھا۔ میقات پر پہنچ کر سب نے احرام باندھا، نیت کی اور ایک ساتھ تلبیہ پڑھنا شروع کیا

"لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک، اِنّ الحمد والنعمۃ لک والملک، لا شریک لک۔"

یہ الفاظ بار بار اُن کی زبانوں پر جاری تھے، مگر ہر شخص کے دل میں اُن کا اثر الگ تھا۔ حمزہ کی آواز کئی مرتبہ رندھ جاتی، ریان اور نور کی آنکھیں ہر چند لمحوں بعد نم ہو جاتیں اور عنایہ مسلسل تسبیح میں مشغول تھی۔

سفر کے دوران گاڑی کی کھڑکی سے باہر پھیلے ہوئے پہاڑوں اور سنہری زمین کو دیکھتے ہوئے گرینی نے آہستہ سے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے جو لاکھوں انسانوں کو ہر سال اس سرزمین تک کھینچ لاتی ہے۔ حمزہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ یہاں کوئی صرف پتھروں کی عمارت دیکھنے نہیں آتا، یہاں لوگ

اپنے ٹوٹے ہوئے دل لے کر آتے ہیں اور واپس جاتے وقت اُن کے دل پہلے جیسے نہیں رہتے۔ اللہ اپنے گھر سے کسی کو خالی واپس نہیں لوٹاتا۔

چند گھنٹوں بعد جب مکہ مکرمہ کی حدود شروع ہوئیں تو ہر دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ جیسے ہی بیت اللہ کا پہلا دیدار نصیب ہوا، پورا قافلہ بے اختیار رک گیا۔ حمزہ کی آنکھوں سے آنسو اس شدت سے بہنے لگے کہ سامنے کا منظر دھندلا گیا۔ عنایہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رو رہی تھی۔ شاہینہ، روبینہ، اور اُن کے شوہر بھی اشکبار تھے۔ فینگ حیرت سے سب کو دیکھ رہا تھا، جبکہ گرینی جورات کو ہی اسلام قبول کر چکی تھی ان آنکھوں میں ایسا سکون تھا جو شاید اُنہوں نے پوری زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

طواف کے دوران حمزہ کا دل بار بار اپنے ماضی کی طرف جا رہا تھا۔ ہر چکر کے ساتھ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی زندگی کے گناہ، تکبر اور غرور اُس سے دور ہوتے جا رہے ہوں۔ اُس نے بیت اللہ کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہا، "یا اللہ! تُو نے مجھے دنیا کی ہر آسائش دی تھی، مگر سکون نہیں دیا۔ آج تیرے گھر کے سامنے کھڑا ہوں تو معلوم ہوا کہ اصل دولت تیرے قریب ہونا ہے۔"

طواف مکمل کرنے کے بعد سب نے مقامِ ابراہیم کے قریب نفل ادا کیے، زمزم پیا اور پھر صفا و مروہ کی سعی کی۔ عمرہ مکمل ہوتے ہی حمزہ نے لمبی دیر تک بیت اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے دعا کی۔ اُس نے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا۔ اُس کی ہر دعا اپنے خاندان، اپنے مرحوم والد، حذیفہ، میرہان جلال اور اپنی آنے والی زندگی کے لیے تھی۔

عمرے کے بعد حمزہ چند دیر کے لیے سب سے الگ ہو گیا۔ وہ ایک ایسی جگہ گیا جہاں نہایت حفاظت اور احترام کے ساتھ غلافِ کعبہکے مستند اور محفوظ تحائف رکھے گئے تھے۔ جب اُس کے سامنے مخملی ڈبہ رکھا گیا تو چند لمحوں تک وہ اُسے چھو بھی نہ سکا۔ اُس کے ہاتھ بے اختیار کانپ رہے تھے۔ آخر اُس نے انتہائی ادب سے ڈبہ کھولا۔

اندر غلافِ کعبہ کا ایک خوبصورت اور محفوظ ٹکڑا رکھا تھا۔

حمزہ کی نظریں اُس پر جم گئیں۔

اُس کے ذہن میں اپنی پوری زندگی ایک فلم کی طرح چلنے لگی۔ وہ راتیں... وہ گناہ... وہ غرور... وہ نافرمانیاں... اور پھر وہ لمحہ جب اللہ نے اُسے توبہ کی توفیق دی۔

اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے غلافِ کعبہ کو اٹھایا، مگر اگلے ہی لمحے اُس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر اُس کی ہتھیلی پر گرنے لگے۔ اُس نے غلافِ کعبہ کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور سجدے میں گر گیا۔

اُس کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔

وہ بار بار صرف ایک ہی دعا مانگ رہا تھا۔

یا اللہ... میں اس قابل نہیں تھا... میرے جیسے گناہگار کو تو تیرے گھر کے قریب آنے کا بھی حق نہیں تھا، مگر تُو نے اپنے کرم سے مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔ اگر آج تُو میرے عیب لوگوں پر ظاہر کر دیتا تو شاید میں کسی کی آنکھوں میں دیکھنے کے قابل بھی نہ رہتا۔ یہ سب تیری رحمت ہے... صرف تیری رحمت"

کافی دیر بعد جب اُس نے خود کو سنبھالا تو اُس نے غلافِ کعبہ کو دوبارہ نہایت احترام سے اُس کے ڈبے میں رکھا اور دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ یہ دنیا کی سب سے قیمتی امانت ہے، اور یہ صرف اُس عورت کی ہو گی جس نے اُسے اُس کے رب تک واپس پہنچنے کے سفر میں مضبوطی سے تھامے رکھا۔

شام ڈھلنے لگی تھی۔ سب دوبارہ بیت اللہ کے قریب اکٹھے بیٹھے تھے۔

رات کو ہوٹل واپس پہنچنے کے بعد سب اپنے کمروں میں چلے گئے۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ عنایہ کھڑکی کے پاس کھڑی بیت اللہ کی سمت دیکھ رہی تھی۔ حمزہ آہستہ سے اُس کے قریب آیا۔ اُس نے اپنی جیب سے وہی مخملی ڈبہ نکالا اور دونوں ہاتھوں سے عنایہ کی طرف بڑھا دیا۔

عنایہ نے حیرت سے پوچھا اِس میں کیا ہے؟۔

"آپ کے لیے غِلافِ کعبہ کا ٹکرا لایا ہوں"

جیسے ہی اُس کی نظر غلافِ کعبہ پر پڑی، اُس کے ہاتھ کانپ گئے۔

وہ چند لمحوں تک کچھ بول ہی نہ سکی۔

حمزہ نے دھیرے سے کہا، "لوگ منہ دکھائی میں سونا، ہیرے یا دنیا کی قیمتی چیزیں دیتے ہیں... مگر میرے پاس دنیا کی سب سے قیمتی چیز یہی ہے۔ میں چاہتا ہوں ہماری زندگی کا آغاز اُس چیز کی برکت سے ہو جس نے لاکھوں دلوں کو اللہ کے سامنے جھکنا سکھایا ہے۔

عنایہ نے غلافِ کعبہ کو دونوں ہاتھوں سے اٹھایا، اپنی آنکھوں سے لگایا اور خاموشی سے رو پڑی۔

اُس رات بیت اللہ کے سائے میں دو آنکھیں مسلسل اللہ کا شکر ادا کرتی رہیں... ایک اُن آنسوؤں پر جو توبہ کے بعد نصیب ہوئے، اور دوسری اُس محبت پر جو آخرکار اللہ کی رضا تک پہنچ گئی۔

مکہ مکرمہ میں قیام کے تین دن پلک جھپکتے گزر گئے۔ کسی کا دل واپسی کے لیے آمادہ نہ تھا۔ ہر نماز کے بعد بیت اللہ کو دیکھنے کی خواہش پہلے سے بڑھ جاتی، ہر طواف کے بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے دل دوبارہ اُسی مقام پر لوٹ آنے کی دعا مانگ رہا ہو۔ دنیا کی ہر خوبصورتی ایک طرف تھی اور اُس گھر کی ایک جھلک ایک طرف۔ شاید اسی لیے وہاں سے رخصت ہونے والا ہر شخص اپنے ساتھ صرف سامان نہیں، بلکہ اپنے دل کا ایک حصہ بھی وہیں چھوڑ آتا ہے۔

واپسی کے دن فجر کی نماز کے بعد سب نے ایک بار پھر بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر طویل دعائیں مانگیں۔ عنایہ خاموشی سے کعبۃ اللہ کو دیکھتی رہی۔ اُس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ حمزہ اُس کے قریب کھڑا تھا، مگر آج اُس نے بھی کچھ نہ کہا۔ بعض جذبات ایسے ہوتے ہیں جنہیں لفظوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ اُن دونوں کے دل صرف ایک ہی دعا مانگ رہے تھے کہ اللہ اُن کی اس حاضری کو قبول فرما لے اور زندگی کا ہر قدم اپنی رضا میں اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہوٹل واپس آکر سب نے اپنا سامان سمیٹا۔ کمرے بند کرنے سے پہلے حمزہ نے ایک آخری بار کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دور بیت اللہ کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے خاموشی سے ہاتھ اٹھائے اور

آہستہ سے کہا، "یا اللہ... اگر یہ میری زندگی کی آخری حاضری بھی ہو تو اسے قبول فرما، اور اگر دوبارہ بلانا نصیب ہو تو اُس دن بھی مجھے اپنا ہی بندہ پانا۔"

مکہ سے جدہ کی طرف روانگی سے پہلے فینگ اور گرینی نے سب کو بتایا کہ اُن کی پیرس واپسی کی پرواز اُسی دن تھی۔ اگرچہ سب چاہتے تھے کہ وہ کچھ دن اور ساتھ رہیں، مگر اُن کی واپسی ضروری تھی۔ گرینی ایک ایک فرد سے ملیں۔ جب وہ عنایہ کے سامنے آئیں تو اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اللہ نے اُنہیں صرف ایک بیٹا ہی نہیں دیا، بلکہ ایک ایسی بیٹی بھی عطا کر دی ہے جس پر اُنہیں فخر ہے۔ عنایہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اُس نے احترام سے اُن کے ہاتھ چوم لیے۔

پھر گرینی حمزہ کے سامنے آئیں۔ چند لمحوں تک وہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہیں۔ اُن کی آنکھوں میں وہی محبت تھی جس کے سائے میں حمزہ نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ اُنھوں نے اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے کہا، "مجھے تم پر فخر ہے۔ پہلے میں تمہارے لیے دنیا کی کامیابیوں کی دعا مانگتی تھی، لیکن آج میں صرف یہ دعا کرتی ہوں کہ اللہ تمہیں ہمیشہ اپنی رحمت کے سائے میں رکھے۔"

حمزہ نے آگے بڑھ کر گرینی کو مضبوطی سے گلے لگا لیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے بھاری آواز میں کہا، "اگر آپ نہ ہوتیں تو شاید آج میں زندہ بھی نہ ہوتا۔ آپ نے ہمیشہ مجھے سنبھالا، یہاں تک کہ اُس وقت بھی جب میں خود کو کھو چکا تھا۔" گرینی نے اُس کے ماتھے کو چوما اور کہا، "مجھے نہیں، اپنے رب کا شکر ادا کرو۔ اُس نے تمہیں واپس اپنی طرف بلا لیا، اور یہی میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔"

فینگ نے ہمیشہ کی طرح ماحول کو ہلکا کرنے کی کوشش کی، مگر اُس کی آواز میں بھی نمی تھی۔ اُس نے حمزہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا، "اب اگلی بار پیرس آؤ تو وکیل سے ملنے نہیں، بھائی سے ملنے آنا۔" حمزہ ہلکا سا مسکرایا اور جواب دیا، "ان شاء اللہ، اس بار ملاقات دنیا کی مصروفیات کے لیے نہیں، صرف رشتوں کے لیے ہو گی۔"

ایئرپورٹ پر جدائی کا وقت آیا تو گرینی اور فینگ نے آخری بار سب کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ اُن کی پرواز پیرس کے لیے روانہ ہو گئی، جبکہ حمزہ اور اُس کا خاندان پاکستان واپسی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ اُن کی آخری ملاقات ہے۔ بعض رخصتیاں انسان کو اُس وقت عام لگتی ہیں، مگر وقت گزرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی آخری جھلک تھیں۔

ادھر پاکستان واپسی سے پہلے حمزہ نے ایک اور کام کیا جس کے بارے میں اُس نے کسی کو تفصیل سے نہیں بتایا۔ اُس نے مِرہان جلال کے علاج، تعلیم اور مکمل کفالت کے لیے ایک قانونی دستاویز پر دستخط کیے، جس کے تحت ہر ماہ ایک مقررہ رقم براہِ راست یتیم خانے کے اکاؤنٹ میں منتقل ہونی تھی۔ اُس نے یہ بھی یقینی بنایا کہ اگر کبھی وہ خود اس دنیا میں نہ رہے تو بھی یہ سلسلہ بند نہ ہو۔ جب تمام کارروائی مکمل ہو گئی تو اُس نے صرف اتنا کہا، "یتیم بچے کسی کی رحم کی بھیک نہیں، ہماری ذمہ داری ہوتے ہیں۔"

واپسی کی پرواز سے پہلے حمزہ اور عنایہ چند لمحوں کے لیے اکیلے بیٹھے تھے۔ عنایہ نے اپنے بیگ سے وہ مخملی ڈبہ نکالا جس میں غلافِ کعبہ محفوظ تھا۔ اُس نے اُسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا، "یہ میری زندگی کا سب سے قیمتی تحفہ ہے۔" حمزہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "نہیں... سب سے قیمتی تحفہ یہ نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں اپنے گھر کے سائے میں ایک دوسرے کا ہمسفر بنایا۔"

جدہ ایئرپورٹ پر پاکستان جانے والی پرواز کا اعلان ہو چکا تھا۔ سب نے اپنا سامان سنبھالا اور روانگی کی طرف بڑھنے لگے۔ کسی کے چہرے پر سکون تھا، کسی کے دل میں نئی زندگی کے خواب، کسی کے لبوں پر دعا، اور کسی کے ہاتھ میں تسبیح۔

مگر تقدیر خاموشی سے اپنا آخری باب لکھ رہی تھی،

ایسا باب جس کا اختتام زمین پر نہیں، آسمان پر ہونا تھا۔

جدہ ایئرپورٹ کی روشنیاں آہستہ آہستہ پیچھے رہتی جا رہی تھیں۔ جہاز میں بیٹھے ہر شخص کے دل میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ خوشی بھی تھی کہ اللہ نے بیت اللہ اور مسجدِ نبوی ﷺ کی حاضری نصیب فرمائی، اور اداسی بھی کہ اب اُس مقدس سرزمین سے رخصت ہونا پڑ رہا تھا۔ حمزہ کھڑکی سے باہر تاریک آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے کانوں میں ابھی تک لبیک کی صدائیں گونج رہی تھیں، اُس کی آنکھوں کے سامنے بیت اللہ کا طواف گھوم رہا تھا، اور اُس کے دل میں وہ لمحہ زندہ تھا جب اُس نے غلافِ کعبہ کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اپنے رب سے معافی مانگی تھی۔

عنایہ نے خاموشی سے اُس کے کندھے پر سر ٹکا دیا۔ دونوں نے پورے سفر میں بہت کم باتیں کیں۔ بعض خوشیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف خاموشی کافی ہوتی ہے۔ حمزہ نے آہستہ سے عنایہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس عورت کو کبھی وہ صرف دور سے دیکھ کر مسکرا دیتا تھا، آج وہی اُس کی ہمسفر بن کر اُس کے ساتھ بیٹھی تھی۔

لاہور ایئرپورٹ پر جہاز اُترا تو سب نے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ امیگریشن اور سامان لینے میں کچھ وقت لگا، مگر کسی کو جلدی نہیں تھی۔ ہر شخص اپنے ساتھ صرف سوٹ کیس نہیں، بلکہ ایسی یادیں لے کر واپس آ رہا تھا جو پوری زندگی اُس کے دل میں زندہ رہنے والی تھیں۔

ایئرپورٹ سے باہر نکلتے ہی رات اپنی خاموش چادر اوڑھے شہر پر پھیل چکی تھی۔ بارش ابھی کچھ دیر پہلے ہوئی تھی، اس لیے سڑکیں بھیگی ہوئی تھیں اور روشنیوں کا عکس اُن پر جگمگا رہا تھا۔ ریان نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ سامنے اُس کے والد بیٹھ گئے، جبکہ پیچھے شاہینہ، روبینہ، اُن کے شوہر، نور، حمزہ اور عنایہ بیٹھ گئے۔ گاڑی آہستہ آہستہ گھر کی سمت چل پڑی۔

چند منٹ خاموشی رہی، پھر روبینہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے شکرانے کے نوافل ادا کیے جائیں گے۔ شاہینہ نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ اس سفر نے اُنہیں یہ سکھا دیا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی دولت انسان کا اللہ کے قریب ہونا ہے۔ نور نے ریان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا کہ اب روزمرہ کی زندگی دوبارہ شروع ہو گی، مگر اس بار شاید اُن کے دل پہلے جیسے نہ رہیں۔

حمزہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ ایک کام سب سے پہلے کرنا ہے۔ مِرہان جلال سے ملنے جانا ہے۔ وہ ضرور ناراض ہو گا کہ سب اُسے چھوڑ کر عمرہ کرنے چلے گئے تھے۔ یہ سنتے ہی گاڑی میں پہلی بار سب ہنس پڑے

عنایہ نے محبت بھری نگاہوں سے حمزہ کو دیکھا۔ اُسے یاد آیا کہ کس طرح یہی شخص ہر مہینے خاموشی سے اُس بچے کے اخراجات ادا کرتا تھا، بغیر کسی کو بتائے۔ اُس نے دھیرے سے پوچھا، "آپ نے اُس کی فائل مکمل کر دی تھی نا؟"

حمزہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

ہاں... اب اگر میں کبھی بھی نہ رہوں... تب بھی اُس کی تعلیم، علاج اور پرورش کبھی نہیں رکے گی۔ میں نے سب قانونی کارروائی مکمل کر دی ہے۔

عنایہ کی آنکھیں بے اختیار بھیگ گئیں۔

اُسے محسوس ہوا کہ انسان کی اصل پہچان اُس کی دولت نہیں، بلکہ وہ نیکیاں ہوتی ہیں جو اُس کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں۔

چند لمحوں بعد حمزہ نے اپنی جیب سے تسبیح نکالی اور آہستہ آہستہ ذکر کرنے لگا۔ عنایہ نے اُس کے ہاتھ کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ حمزہ نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور آہستہ سے بولا، "جانتی ہو... میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری زندگی کا اختتام اس سکون کے ساتھ ہو گا۔"

عنایہ نے فوراً ہلکی سی ناراضی سے اُس کی بات کاٹ دی۔

"اختتام نہیں... ابھی تو بہت لمبی زندگی ہے۔"

حمزہ ہنس دیا، مگر اُس ہنسی میں عجیب سی سنجیدگی چھپی ہوئی تھی۔

"زندگی لمبی ہو یا نہ ہو... دعا صرف یہ ہے کہ اللہ ہم سے راضی رہے۔"

گاڑی شہر سے نکل کر نسبتاً سنسان سڑک پر آچکی تھی۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔ وائپر شیشے پر گرتی بوندوں کو ہٹا رہے تھے۔ ریان پوری توجہ سے گاڑی چلا رہا تھا۔

اچانک سامنے سے آنے والی ایک تیز رفتار ٹرالر نے اپنا توازن کھو دیا۔

ریان کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے پھیل گئیں۔

اُس نے پوری قوت سے اسٹیئرنگ موڑا تاکہ سامنے بیٹھے اپنے خالو اور پیچھے بیٹھے خاندان کو بچا سکے۔

ٹائروں کی رگڑ کی خوفناک آواز رات کے سکوت کو چیرتی ہوئی گونجی۔

گاڑی بے قابو ہو کر پھسلنے لگی۔

شاہینہ نے بے اختیار "یا اللہ..." کہا۔

روبینہ نے اپنے شوہر کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

نور نے خوف سے ریان کا نام پکارا۔

عنایہ نے گھبرا کر حمزہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

حمزہ نے ایک لمحے کے لیے صرف آسمان کی طرف دیکھا۔

اور اُس کے لبوں پر آہستہ سے صرف ایک جملہ آیا۔

"یا اللہ... ہم سب کو اپنی امان میں رکھنا"

اگلے ہی لمحے،

ایک ایسا دھماکہ ہوا کہ پوری رات لرز اٹھی۔

اور پھر،

ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

حادثے کی آواز سن کر ارد گرد سے لوگ دوڑتے ہوئے سڑک کی طرف لپکے۔ چند لمحے پہلے جو شاہراہ معمول کے مطابق آباد تھی، اب وہاں خوف، بے چینی اور خاموش دعاؤں کا عجیب امتزاج تھا۔ کسی نے فوراً ایمبولینس کو اطلاع دی، کسی نے پولیس کو فون کیا، جبکہ کئی لوگ بے اختیار آسمان کی طرف دیکھ کر صرف یہی دعا مانگ رہے تھے کہ اللہ خیر فرمائے۔

چند ہی منٹوں میں ایمبولینسوں کے سائرن فضا میں گونجنے لگے۔ امدادی کارکن نہایت تیزی سے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ ہر ممکن کوشش کی جا رہی تھی کہ جو سانس باقی ہے، اُسے بچا لیا جائے۔ ہر چہرے پر سنجیدگی تھی، ہر قدم میں عجلت تھی، مگر تقدیر اپنا فیصلہ خاموشی سے لکھ چکی تھی۔

شہر کے ایک ہسپتال میں ایمرجنسی وارڈ کی روشنیاں غیر معمولی طور پر جاگ رہی تھیں۔ ڈاکٹر اور نرسیں مسلسل ایک سے دوسرے مریض کی طرف جا رہی تھیں۔ دروازوں کے باہر بے چینی سے انتظار کرتے لوگوں کی دعائیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وقت جیسے اپنی رفتار کھو بیٹھا تھا۔ گھڑی کی ہر سوئی ایک صدی جتنی محسوس ہو رہی تھی۔

اسی دوران یتیم خانے میں مِرہان جلال حسبِ معمول سونے سے پہلے دعا کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے ننھے ہاتھ اٹھائے اور معصوم لہجے میں کہا، "یا اللہ... میرے حمزہ بھائی اور عنایہ آپی کو ہمیشہ خوش رکھنا..." اُسے کیا معلوم تھا کہ جن لوگوں کے لیے وہ دعا کر رہا ہے، اُن کے نام اسی لمحے آسمان کی طرف لکھے جا رہے تھے۔

رات گہری ہوتی گئی۔

ہسپتال کے ایک خاموش کمرے میں حمزہ نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں۔ اُس کی نظر دھندلی تھی، مگر دل صرف ایک چہرہ تلاش کر رہا تھا۔ جب اُس نے عنایہ کو اپنے قریب دیکھا تو اُس کے چہرے پر نہایت ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ عنایہ نے فوراً اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اُن دونوں کے درمیان کوئی طویل گفتگو نہ ہوئی۔ صرف نظریں تھیں جن میں پوری زندگی کی کہانی سمٹ آئی تھی۔

حمزہ نے دھیرے سے عنایہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں وہی محبت تھی جو پہلی بار ہسپتال کی راہداری میں تھی، مگر آج اُس میں دنیا کی کوئی خواہش باقی نہیں تھی۔ صرف اطمینان تھا۔ اُس نے بہت آہستہ سے کہا، "اللہ نے مجھ پر میری اوقات سے زیادہ کرم کیا۔"

عنایہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، لیکن اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ جانتی تھی کہ کبھی کبھی محبت کا سب سے مشکل امتحان خاموش رہنا ہوتا ہے۔

حمزہ نے اپنے کمزور ہوتے ہاتھ سے اُس کی انگلیوں کو تھام لیا۔ اُس کی گرفت مضبوط نہ تھی، مگر اُس میں اپنائیت پوری زندگی جتنی تھی۔ عنایہ نے وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا، جیسے وقت کو روک لینا چاہتی ہو۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔

باہر فجر کی اذان کی پہلی صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔

ہسپتال کی کھڑکی سے آنے والی مدھم روشنی کمرے میں پھیلنے لگی۔

حمزہ کے لبوں پر ایک پُرسکون مسکراہٹ آئی۔ اُس نے آخری بار عنایہ کی طرف دیکھ کر کہا "ڈان ہمارا ساتھ دنیا میں یہاں تک ہی لکھا تھا، مگر دوسرے جہاں میں آپ ہمیشہ کے لیے میری ہو گی، " پھر آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں۔ اُس کے ہونٹ خاموشی سے ذکرِ الٰہی میں جنبش کرنے لگے۔ عنایہ

نے اُس کا ہاتھ پہلے سے زیادہ مضبوطی سے تھام لیا۔ اُس نے دھیرے سے کہا، "ہماری ملاقات ختم نہیں ہوئی... صرف مؤخر ہوئی ہے۔"

حمزہ ابنِ اسفند: تاریخِ پیدائش 12 دسمبر 1995

تاریخِ وفات: 20 آگست 2020

کمرے میں ایک گہری خاموشی اتر آئی۔

ایسی خاموشی... جس میں چیخیں نہیں ہوتیں، مگر دل ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔

عنایہ کی حالت بھی بکھرنے لگی، سر خون سے لت پت، صرف کچھ لمحوں کی دیری تھی کہ اس کا جسم اپنا وجود کھونے لگا۔

عنایہ بنتِ زیان: تاریخِ پیدائش 4 ستمبر 1990

تاریخِ وفات: 20 آگست 2020

اُسی دن پورا گھر، ایک ایک کر کے اپنا وجود کھو بیٹھا۔

گھر بھے وہی تھا، دیواریں وہی تھیں، دروازے وہی تھے، مگر اُن کے درمیان چلنے والے قدم ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔ مسکراہٹوں کی جگہ دعاؤں نے لے لی، اور مبارک باد دینے والے ہاتھ اب مغفرت کی دعا کے لیے اٹھ رہے تھے۔

ریان ابنِ اسفند: تاریخِ پیدائش 22 جولائی 2001

تاریخِ وفات: 20 آگست 2020

پھر کچھ ہی دیر کا وقفہ تھا کہ نور کی روح بھی پرواز کر گئی۔

نور بنتِ شاہان: تاریخِ پیدائش 17 نومبر 2000

تاریخِ وفات: 20 اگست 2020

اور پھر آہستہ آہستہ کر کے گھر کے سب بڑے بھی اپنے حقیقی سفر پر روانہ ہو گئے۔

صبح کی مدھم روشنی میں سب کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

مگر ایک بچے کی امید وہ آج بھی زندہ تھی۔

کئی دن بعد، پیرس میں گرینی اور فینگ کو یہ خبر ملی۔ کچھ لمحوں تک دونوں ایک لفظ بھی نہ بول سکے۔ گرینی نے خاموشی سے قرآنِ مجید اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے، مگر اُن کے لبوں پر صرف ایک جملہ تھا، "اللہ نے اُسے گناہوں کی زندگی سے نکال کر ایمان کی حالت میں اپنے پاس بلا لیا... میرا بیٹا کامیاب ہو گیا۔"

فینگ دیر تک کھڑکی کے سامنے کھڑا آسمان کو دیکھتا رہا۔ اُسے اپنے دوست کی آخری مسکراہٹ یاد آ رہی تھی۔ اُس نے آہستہ سے آنکھیں بند کیں اور دل ہی دل میں دعا کی کہ جس سکون کی تلاش میں حمزہ برسوں بھٹکتا رہا، اللہ اُسے ہمیشہ کے لیے عطا فرما دے۔

اور یوں ایک نامحرم سے شروع ہونے والی کہانی اپنے اختتام کو پہنچی۔

مگر اُس کا پیغام باقی رہ گیا۔

اور وہ پیغام تلاش کرنا ہی آپ کا اصلی مقصد ہے۔



مصنف کی دیگر تحریرے:

جان لیوہ محبت

عشق کے الجھے دھاگے